روایاتِ علیگڑھ

محمد ذاکر علی خان

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ ہیں

اشاعتِ اوّل .. .. جنوری ۱۹۹۳ء
تعداد .. .. ایک ہزار
طابع .. .. سندھ آفسٹ پرنٹنگ پریس
سرورق .. .. انتظار احمد صدیقی
خطاطی .. .. سید تصویب حسین نقوی

ملنے کا پتہ

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن (پاکستان)
ایم۔ آر۔ کیانی روڈ۔ کراچی۔ فون ۵۱۰۰۰۴

ناشر

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن (پاکستان)
ایم۔ آر۔ کیانی روڈ۔ کراچی
فون:۔ ۵۱۰۰۰۴

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

تعارفی معلومات

نام	محمد ذاکر علی خان
والد کا نام	خان بہادر محمد باقر علی خان مرحوم
تاریخ و مقام پیدائش	۸ جولائی ۱۹۲۶ء رامپور اسٹیٹ، یوپی (انڈیا)
سلسلۂ نسب	افغان بڑیچ
تعلیم	(میٹرک) اسٹیٹ ہائی اسکول رامپور ۱۹۴۰ء بی ایس سی ۱۹۴۵ء علیگڑھ مسلم یونیورسٹی بی ایس سی سول انجینئرنگ ۱۹۴۸ء علیگڑھ مسلم یونیورسٹی
پاکستان میں آمد	کراچی، اپریل ۱۹۴۹ء
رہائش	۱۱۔ایم بلاک ۶ پی ای سی ایچ سوسائٹی کراچی ۷۵۴۰۰
پیشہ	انجینئر۔سابق منیجنگ ڈائرکٹر کراچی واٹر اینڈ سیوریج بورڈ
تصانیف	میاں کی اٹریا تلے ۱۹۷۱ء، حدیثِ حرم ۱۹۷۴ء، مرحبا الحاج ۱۹۷۶ء، قلم رو ۱۹۸۴ء، رختِ سفر ۱۹۸۵ء، دیوانِ عام ۱۹۹۰ء

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

روایات نامہ

۱ــــ سیرِ چمن	۱
۲ــــ حُسنِ روایات	۷
۳ــــ اِنٹروڈکشن نائٹ اور مڈرائٹ	۱۳
۴ــــ رودادِ شیروانی و محفلِ دَسترخوان	۲۳
۵ــــ پھیری والے خوراک رساں	۲۹
۶ــــ ہمارے مُعاونین	۳۵
۷ــــ ذکرِ اُجلاگراں	۳۹
۸ــــ تقسیمِ خطابات	۴۳
۹ــــ علیگڑھ کی آفیشل سواری	۵۷
۱۰ــــ کھیلوں کی سرزمین	۶۵
۱۱ــــ کابل کے باغات پر ہاکی بازوں کی یلغار	۷۷
۱۲ــــ الیکشن بازی کی رونقیں	۱۰۹
۱۳ــــ ایکٹویٹی (احوالِ شرارت)	۱۱۹
۱۴ــــ محافلِ مشاعرہ	۱۳۱
۱۵ــــ دینیات	۱۳۵

www.taemeernews.com

ج

۱۶ــــ سینیارٹی کا چسکا	۱۴۵
۱۷ــــ ۱۹۹۰ء کی نمائش علیگڑھ کی سیر	۱۵۵
۱۸ــــ علیگڑھ اور اسم مسعود	۱۷۳
۱۹ــــ وفائے عزم	۱۹۱
۲۰ــــ کپتان سبھا	۱۹۷
۲۱ــــ خدائی فضائیہ کے تین ہوا باز	۲۱۳
۲۲ــــ سرسیّد رحمۃ اللہ علیہ کے مدارج کی بلندی	۲۱۹
۲۳ــــ چٹکی کا لمس	۲۲۵
۲۴ــــ کمالاتِ میر ٹینڈی	۲۳۳

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

سیرِ چمن

یہ دشتِ جنوں دیوانوں کا یہ بزمِ وفا پروانوں کی
یہ شہرِ طرب رومانوں کا یہ خلدِ بریں ارمانوں کی (مجاز)

آج ساری دُنیا میں ہزاروں جامعات اور تعلیمی ادارے فروغ و ترویجِ علم میں سرگرمِ عمل ہیں جہاں سے فارغ التحصیل ہونے والے شہر شہر قریہ قریہ علم کی روشنی پھیلا رہے ہیں، اپنے اپنے نصاب اور طرزِ تعلیم کی وجہ سے بہت ساری یونیورسٹیاں بین الاقوامی شہرت کی حامل ہیں جہاں کی اَسناد کو اعتبارِ خاص و فوقیت حاصل ہے، لیکن اپنے انوکھے نصابِ تربیت کی وجہ سے علیگڑھ کو جو منفرد و اَرفع مقام حاصل ہے اس بلندی کو کوئی دوسرا تعلیمی ادارہ نہیں چھُو سکا۔

علیگڑھ باپ کا سایہ ہے، ماں کی آغوش بھائی کا بازوئے شمشیر زن ہے یہ یونیورسٹی بھی ہے اور گھر بھی، جس کے آنگن میں سب اس طرح گھُلے ملے خوش و خرم نظر آتے ہیں جیسے علم کے ساتھ ساتھ پیار محبّت کا درس لینے آئے ہوں، اس لئے جب وہ روایتی سند کے علاوہ یہاں سے اُخوّت کی ڈگری بھی لے کر نکلتے ہیں تو پھر عُمر بھر عمل پیرا ہو کر اس کی عظمت کا تحفّظ کرتے ہیں اور وقتِ ضرورت یہی سبق دُہرایا کرتے ہیں۔ بلاشُبہ علیگڑھ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد درسی مضامین تو اکثر حافظہ کی گرفت سے فرار اختیار کر جاتے ہیں کسی کو مسٹری یاد رہتی

ہے نہ جغرافیہ کے اسباق، لٹریچر ہو یا فلسفہ، عُمر میں اضافہ کے ساتھ سَب ساتھ چھوڑتے جاتے ہیں، لیکن اس کے برعکس علیگڑھ سے ملنے والے موانست کے بے لوث دَرس میں مہ و سال کے ساتھ اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے ہر علیگ علیگڑھ اسپرٹ کے دوامی نشے میں سرشار رہتا ہے، جس اسپرٹ کی بدولت وَہاں کی رُوپہلی راتوں اور سُنہرے دنوں کی شوخ یادیں اس کے ہاتھ میں عَصائے پیری نہیں آنے دیتیں، اس لئے وہ تادمِ آخر 'بوائے' کے مقام پر فائز رہتا ہے، چُنانچہ وقتاً فوقتاً وہ یادوں کے خزینے سے موتی چُن چُن کر حیاتِ مُستعار کو آسودگی بخشتا ہے اور ماحول کو سازگار بناتا ہے۔

ہم پر بھی ماضی کی یادوں کی جب یورش ہوتی ہے اور واقعات کی گھٹائیں ذہن کی آبیاری کرنے لگتی ہیں تو قلم میں بھی اُمنگ پیدا ہو جاتی ہے اور دل بے اختیار کچھ لکھنے کو چاہنے لگتا ہے۔ ہمیں علیگڑھ نصیب ہوئے نصف صدی سے زائد بیت چکی لیکن وَہاں کے انداز بود و باش، وَہاں کی نت نئی شرارتیں وَہاں کھیلنا کودنا کھانا پینا سَب کل کی بات معلوم ہوتے ہیں۔ یوں تو اَلحمدُ لِلّٰہ لکھنے والوں نے ہر دَور میں مادرِ درسگاہ کو اَپنا موضوعِ فکر بنایا ہے، محققین نے اس کے محاسن گِنائے ہیں، ادیبوں نے اس کے گُن گائے ہیں، شعرا نے اس کی شان میں رُوح پرور نغمے لکھے ہیں، اور نذرِ چمن میں تو مجاز نے دل تک نذر کر دیا ہے اس نظم کو حَبیب اشتیاق محمد خان نے لَے اور سنگیت دی تو لیلائے علیگڑھ نے اپنے اس مجنوں کی ایسی پذیرائی کی کہ 'نذرِ چمن' آج 'ترانۂ چمن' بن کر سارے عالم میں گونج رہا ہے اور یہ مایۂ ناز سپوت لافانی بن گیا ہے اسی طرح مختلف ادوار میں وَہاں مروّجہ روایات اور شوخیوں کی تفاصیل بھی نسلاً بعد نسلاً ہم تک پہنچتی رہیں لیکن تا حال ہماری نظر سے کوئی مرقع ایسا نہیں گزرا جس میں روایاتِ علیگڑھ کو یکجا کیا گیا ہو۔ چُنانچہ

'روایاتِ علیگڑھ' اس سمت میں ایک قدم ہے، جس کا مقصد علیگڑھ دوستوں اور آئندہ نسلوں کو ان واقعات و حالات و کیفیات سے متعارف کروانا ہے جس کی بدولت وہاں کی رہائشی زندگی میں ایک غیر معمولی کشش وجود میں آئی اور طلبا میں ایسا اٹوٹ ناتا قائم ہوگیا کہ وہ تمام تعصّبات سے پاک 'رشتۂ علیگیت' میں ہمیشہ کے لئے منسلک ہوگئے اور قید زمان و مکان سے آزاد ہو کر "علیگیرین برادری" کے فرد بنتے جاتے ہیں۔

علیگڑھ سے دُور ہونے کی وجہ سے مطلوبہ لٹریچر ہماری دسترس سے باہر تھا پاکستان میں جو تھا بھی تو کچھ ناپید ہو چکا بقیہ کو اولڈ بوائے صاحبان شاید حرزِ جاں بنا کر بطور نامۂ اعمال روزِ جزا پیش کرنا چاہتے ہیں، پھر ایسی تمام دشواریوں کے علی الرغم ہم نے اللہ کا نام لے کر جب ان نوادرات کو یکجا کرنے کا آغاز کار کیا تو سب سے بڑھ کر خود ہماری یادداشت نے ہمیں سہارا دیا اور زیادہ تر اپنے مشاہدات کو اساس بنایا۔ علاوہ ازیں ہم نے ہر عمر اور زمانے کے 'ایں جہانی' اولڈ بوائز سے بھی معلومات اینٹھنے کی تراکیب بھی استعمال کیں، ان بزرگان علیگڑھ میں اسّی نوّے سالہ سُپر سینئر حضرات بھی ہیں جن میں اُستاد محترم شیخ رشید صاحب، محترم ڈاکٹر ابواللیث صدّیقی صاحب، محترم محمّد اسلم خان جو علیگڑھ سے زیادہ رام پُور کے حوالے سے جانے پہچانے جاتے ہیں، سدا جوان ۸۳ سالہ میجر زاہد سعید لودھی صاحب، بھائی عبدالوہاب خان، سلیمی بھائی، ابرار حسن خان صاحب، ہمارے دیرینہ ساتھیوں میں بھائی اظہر خان پنڈلی، سابق نواب زادہ اور حال نواب حامد خان، اور ہر دَور کے اولڈ بوائز کے کلاس فیلو اچھّو خان اور گلو کار کپتان عبّاسی صاحب جیسے معتبر کرم فرما شامل ہیں۔ متاخرین میں ڈاکٹر جاوید عزیز اور سُلطان العارفین نے، ماضی قریب کے علیگڑھ سے متعلق کسی قدر معلومات فراہم کیں۔ کسی حد تک ہم نے جرائد و کتب سے بھی روایت چینی، کی تاکہ بیان روایت میں کوئی کسر نہ رہ جائے، اور یہ مجموعہ قارئین کی توقعات پر

پُورا اُتر سکے، تاہم 'روایاتِ علیگڑھ' نہ تو تحقیقی مقالات کا مجموعہ ہے نہ ہی اسے تاریخ کا باب گردانا چاہیئے۔ ہم نے درسگاہ عالیہ کی یہ ادنیٰ خدمت ہر دادِ دستد سے بے نیاز ہو کر خالصتاً فی 'سبیل علیگڑھ' براہِ سرسید انجام دی ہے، اِس لئے یہ پیشکش اگر علیگڑھ کے شب و روز کے متعلق جاننے والوں کی معلومات میں اضافہ کا باعث بنی تو سمجھیں گے کہ محنت اکارت نہیں ہوئی۔ ہاں اپنے قارئین خصوصاً علیگ بھائیوں سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ اس کام کو آگے بڑھاتے رہیں گے تاکہ علیگڑھ کی بے مثل و پُرکشش اقامتی زندگی سے متعلق تازہ واقعات اور معلومات منظرِ عام پر آتی رہیں اور اذہان کو تازگی و مسرّت بخشتی رہیں۔ اس کے باوجود ہمیں اپنی کوتاہیوں کا احساس ہے اِس لئے استدعا ہے کہ قارئین کرام ازرہ علیگ نوازی ان سے صرفِ نظر فرمائینگے۔

اب جہاں تک کتاب کی اشاعت کا تعلق ہے تو اس کی مُحرّک علیگڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی مجلسِ منتظمہ کا وہ فیصلہ یا حکم ہے کہ سرسید رحمۃ اللہ علیہ کی ۱۷۵ ویں سالگرہ کے مُبارک موقع پر علیگڑھ برادری کو 'روایاتِ علیگڑھ' کی سوغات پیش کی جائے، اس بارے میں ہم تو اتنا ہی عرض کریں گے کہ یہ ان کی علیگ پروری ہے، ورنہ مَن آنم کہ مَن دانم۔ چنانچہ اس کتاب کی طباعت و اشاعت میں بھی ہمیشہ کی طرح ہمیں اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے رفقائے دیرینہ کی مکمّل اعانت حاصل رہی ہے جنھوں نے عزیزم مظلّ احمد نظامی کی سربراہی میں صرف جملہ ذمّہ داریاں ہی نہایت حُسن و خوبی سے نہیں نبھائیں بلکہ کتاب کی پیشگی فروخت کا بھی اِنتظام کر لیا، مذکورہ تعاون میں بھائی نونہال زیدی کا نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ البتہ اس ضمن میں درپیش جانگسل تگ و دو میں چند مخلصین نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا جن کا ذکرِ خیر یہاں ناگزیر ہے مثلاً مسوّدہ کی پہلی کتابت محمد علی خان نے کی جس پر برادرم رضوان خان حنفی نے بالتفصیل نظرِ عنایت ڈالی۔ خوشنویسی کا حق

سیّد تصویب حسین صاحب نے مہارتِ قلم اور اس سے بھی بڑھ کر خوش خلقی سے ادا کیا' جبکہ پروف ریڈنگ کے لئے ہمارے مخلص و مرحوم دوست شاہ حسن عطا صاحب کے صاحبزادے عزیزم شاہ حمید عطا نے نہایت انہماک سے دیدہ ریزی کی' اور رابطہ کا مشکل کام ایسوسی ایشن کے کارکن اکبر نے پابندی سے انجام دیا۔ کتاب کا ٹائیٹل محترم انتظار احمد صدیقی نے نہایت توجہ و مہربانی سے ڈیزائن کیا اس سلسلے میں ہم اپنے کرم فرما اورینٹ ایڈورٹائزرز کے مشرقی مزاج کے مالک ہاشمی صاحب کے بھی ممنون ہیں۔

اَب رہے ہمہ جہت بھاگ دَوڑ کے مراحل سوان کا بیڑا شاعروں کے معروف خدمت گزار جناب سیّد امروہوی نے برضا و رغبت اُٹھایا اور طباعت سے لے کر جلد بندی تک کے ہر کام میں سیّد صاحب کا خلوص کارفرما رہا۔ ضمنی طور سے یہ اظہار بے محل نہ ہوگا کہ حسبِ روایات قدیم "روایات علیگڑھ" سے ہونے والی جملہ آمدنی علیگڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے علمی ادبی اور فلاحی منصوبوں کیلئے مختص کی گئی ہے۔

سپردم بتو مایۂ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

اللہ تبارک تعالیٰ سے دُعا ہے کہ اس سعی حقیر کو قبول فرمائے۔ علیگڑھ کا نام تا ابد دُنیا میں جگمگاتا رہے اور اس کے عظیم بانی سرسیّد رحمۃ اللہ علیہ کی رُوح پر رحمتِ باری تعالیٰ کا نزول فراواں رہے۔ آمین۔

راوی

محمد ذاکر علی خان

محمد ذاکر علی خان

www.taemeernews.com

حُسنِ روایات

یہ احترام روایت تو کم نہیں ہوگا
ہمارے خُون میں شامل ہے کیا کیا جائے (صبا)

آج برِّصغیر کا تعلیمی اُفق سینکڑوں دَرس گاہوں کی تابانی سے جگمگا رہا ہے۔ ہر یونیورسٹی اپنی جگہ روشنی کا مینارہ ہے، تدریسی معیار کے اعتبار سے کوئی جامعہ انگریزی کے مضمون کے لئے شہرت رکھتی ہے تو کہیں حساب اور سائنس کا چرچا زیادہ ہے۔ کوئی یونیورسٹی آرٹس اور لٹریچر کے لئے مشہور ہے تو کہیں تکنیکی تعلیم کے مواقع زیادہ بہتر ہیں۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی بھی انہی معروف جامعات میں سے ایک ہے، لیکن اس کی انفرادیت نصاب تعلیم تک محدود نہیں بلکہ یہ اپنے اقامتی کردار سے ممتاز ہے، کیونکہ وَہاں تعلیمی نصاب کے ساتھ ساتھ تربیت کا بھی بڑا مربوط و مستحکم کورس نافذ ہے۔ وہ کورس جس کی ابجد برِّصغیر کے مُحسنِ اعظم نے مرتب کی اور اپنی زیرِ نگرانی رائج کیا۔ جس نے نہ صرف طالب علموں بلکہ نوعمر اساتذہ کو بھی اس کی ٹریننگ دی، وقتاً فوقتاً خود ان کے امتحانات لئے۔ اس طرح اس غیر نصابی مگر غیر معمولی تربیت کی راہیں ہمیشہ کے لئے متعین کر دیں۔ سچ پوچھئے تو علیگڑھ کی نمایاں حیثیت اور ساکھ کا راز وَہاں کی اقامتی طرزِ زندگی میں مضمر ہے اور ان کامرانیوں کا سہرا ان حسین

روایات کے سر ہے جو وہاں کی رہائش گاہوں میں برسہابرس سے رائج چلی آرہی ہیں جن کے اثرات ہر علیگ پر تاحیات قائم رہتے ہیں۔

اگر جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوگی کہ وہاں کی رہائش کو دلچسپ و دلکش بنانے یا یوں کہیئے کہ علیگڑھ کو علیگڑھ بنانے میں ان مروّجہ روایات کو بڑا دخل ہے۔ گرچہ ہم اس موضوع پر کوئی باقاعدہ تحقیق تو نہ کرسکے، لیکن حالات و واقعات سے ایسے شواہد ملتے ہیں جن سے یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ علیگڑھ میں جاری وساری بیشتر روایاتِ حسنہ کا تعلق قرونِ اوّل سے ہے، یہاں تک کہ بعض روایتیں اور شرارتیں تو خود سرسیّد رحمۃ اللہ علیہ کے عہد میں ان کے زیرِ نگرانی پروان چڑھیں، جیسا کہ کچھ مستند واقعات سے عیاں ہے، بسا اوقات ازراہِ شفقت و دلجوئی بیمار طالب علموں کو سرسیّد اپنے گھر لے آیا کرتے تھے تاکہ علاج و پرہیز باقاعدہ ہوسکے، بیان کیا جاتا ہے کہ دو ایسے طلبا نے روبصحت ہونے کے دوران ان کے باغ سے انار کھانا شروع کردیئے۔ صبح کو بے چارہ مالی جب انار پیڑوں سے اُتارنے جاتا تو خالی جھولی لوٹتا اس نے جب ان انار خوروں سے رُجوع کیا تو جواب ملا کہ گلہریاں کھا جاتی ہیں۔ اِس غریب نے سرسیّد کے روبرو بھی اناروں کی گمشدگی کی یہی وجہ بیان کردی۔ سرسیّد نے مُسکرا کر کہا ان سے کہہ دینا کہ گلہریوں کے لئے آہنی مُنھ دان بنوالئے ہیں۔ چُنانچہ اس کے بعد گلہریاں ہوشیار ہوگئیں۔ اس چھوٹے سے واقعے میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس سرقۂ اناران کے مجرموں کو جانتے بوجھتے ہوئے سرسیّد نے سزا دینا تو درکنار خود ان سے پوچھ گچھ کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ غالباً وہاں کے اساتذہ اور وارڈن صاحبان نے کھانے پینے کے معاملے میں اسی سرسیّدی رعایت کو ہنوز بحال رکھا ہے، یعنی خورد و نوش کے معاملے میں تجاوزات 'تعزیراتِ علیگڑھ' کی زد میں نہیں آتے۔

اس عظیم معلّم کے درسِ شفقت کی مزید مثال ملاحظہ ہو جو سینہ بہ سینہ ہم تک

پہنچی۔ یہ واقعہ جمیل خاں صاحب مرحوم تحصیلدار بریلی نے خاں صاحب صولت علی خان مرحوم کو سُنایا اور ان سے ہم نے سُنا۔ فرماتے ہیں کہ "ایک روز دوپہر ہم کچّی بارک میں اکٹھے بیٹھے تھے گرمی کا زمانہ تھا خربوزے کھائے جا رہے تھے۔ شوق پورا کرنے کے بعد ہم نے ٹوکری بھرے چھلکے اور بیج بچھلی کھڑکی سے میدان میں پھینک دیئے۔ بدقسمتی سے عین اسی وقت سرسیّد اپنی 'فٹن' میں بیٹھے اُدھر سے گزر رہے تھے اور وہ سارے بیج اور چھلکے ان کی گود میں جا پڑے، ہم سب لوگ سہم گئے اور خاموشی سے اپنے کام کاج میں اس طرح مشغول ہو گئے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ لیکن ذرا ہی دیر میں گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز نے سب کو چونکا دیا۔ دیکھا تو سرسیّد کی فٹن ٹھیک ہمارے کمرے کے دروازے کے سامنے کھڑی ہے اور اپنی گود بیجوں سے بھرے سرسیّد اس میں سے اُترے۔ وارڈن صاحب بُلائے گئے۔ ہم چار پانچ ملزمان دست بستہ پیش ہوئے۔ سرسیّد فرمانے لگے" میں سمجھ گیا تھا کہ یہ ان رمپوریوں کی کارگزاری ہو سکتی ہے اس لئے براہِ راست ان کے کمرے پر پہنچ گیا یہ کھاتے پیتے وقت ایسے بےخود ہو جاتے ہیں کہ ادب و آداب بالائے طاق رکھ دیتے ہیں"۔

ہم چارج شیٹ کی ابتدا سُن کر اپنی اپنی جگہ کانپ رہے تھے کہ خدا معلوم یہ خربوزے کیا رنگ لائیں۔ پھر وہ وارڈن صاحب سے مخاطب ہوئے "کیوں ماسٹر صاحب آپ انہیں یہی کچھ سکھاتے ہیں؟" محبوب وارڈن صاحب بولے "حضرت میں نے تو انہیں سخت تاکید کی ہے کہ چھلکے وغیرہ باہر پھینکتے وقت دیکھ لیا کریں کہ کوئی شریف آدمی تو اِدھر سے نہیں گزر رہا ہے"۔ "تب تو انہوں نے ٹھیک ہی کیا" سرسیّد فرمانے لگے "کیوں کہ علیگڑھ میں مجھ سے زیادہ شریف انہیں کہاں ملتا"۔ اِتنا کہہ کر وہ رخصت ہو گئے۔ نہ کان کچّی، نہ اُٹھک بیٹھک، نہ ہوسٹل سے اخراج، نہ کوئی اور وارننگ لیکن سچ پوچھئے کہ ان کے اِس اندازِ تنبیہہ کا جو اثر ہُوا وہ کبھی محو نہیں ہو سکا۔ چنانچہ میں

اس بُڑھاپے میں بھی چھلکے وغیرہ پھینکتے وقت احتیاط برتتا ہوں"۔

ایک اور واقعہ ملاحظہ ہو جس سے سرسیّد کی بے پایاں شفقت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے اس کے راوی بھی جمیل خاں صاحب ہی ہیں۔ فرماتے ہیں "ایک شام ہم سب مسجد کے عقب میں واقع کرکٹ گراؤنڈ میں حسبِ معمول کرکٹ کھیلنے میں ایسے مصروف تھے کہ مغرب کی نماز کا وقت ہوگیا لیکن اس کے باوجود بجائے ہوسٹل کا رُخ کرنے کے ہم کھیل میں مدہوش رہے۔ اتنے میں نظر پڑی تو دیکھا حضرت سرسیّد خراماں خراماں مغرب کی نماز کے لئے مسجد کی طرف آرہے ہیں۔ یہ دیکھ کر گھبراہٹ میں اور کچھ نہ سوجھا تو کپتان صاحب نے کہا" بھائیو صفیں باندھ لو اور نماز کے لئے کھڑے ہوجاؤ تاکہ یہ خطرہ ٹل جائے" چنانچہ فوراً ہی کپتان صاحب کی امامت میں سب کھلاڑی مقتدی بن کر نماز باجماعت میں مصروف ہوگئے۔ رُکوع ہُوا سجدہ کیا جو کچھ زیادہ طول پکڑ گیا لیکن بجائے اللہ اکبر کہنے کے سجدے میں سر رکھے رکھے امام صاحب نے باآوازِ بلند دریافت کیا۔" بھائیو کیا بُڈھا چلا گیا"۔ مقتدیوں کی طرف سے جواب نہ آنے پر امام صاحب نے سجدے سے سر اُٹھایا تو دیکھتے ہیں کہ سجدہ ریز مقتدیوں میں بُڈھا بھی شامل ہے لیکن بیباکی کے ایسے مظاہرے کے بعد بھی بابائے ملّت نے شفقانہ عفو و درگزر سے ہی کام لے کر مسجد کی راہ لی" راوی فرماتے ہیں کہ اس کے بعد دورانِ قیام علیگڑھ میں کبھی ایسا موقع نہیں آیا کہ اذان سُنتے ہی سب مسجد میں نہ جمع ہوگئے ہوں۔

اسی طرح ایم اے او کالج میں علیگڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کا قیام بھی سرسیّد کی خصوصی دلچسپی کا مرہونِ منّت ہے، گرچہ اس وقت اس انجمن کا نام یہ نہ تھا لیکن مقاصد تقریباً یہی تھے۔ اس ایسوسی ایشن کی افادیت اور کارگزاریوں سے سیّد بابا اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے خود بھی ایسوسی ایشن کی رُکنیت حاصل کرنے کی باقاعدہ درخواست

دی جس کو بطورِ خاص منظوری دی گئی۔ اس لئے اگر آج یہ دعویٰ کیا جائے کہ ساری دُنیا میں پھیلی ہُوئی علیگڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشنز کا رُوحانی تعلّق اور قلبی لگاؤ بانیٔ علیگڑھ سے ہے تو اعترافِ حقیقت ہوگا۔

علیگڑھ میں رائج متعدّد روایات کا سلسلہ کب سے شروع ہُوا، اس کی صحیح تاریخ تو محقق ہی بتا سکتے ہیں لیکن اِس بارے میں ہم نے جب قدیم ترین علیگ بھائیوں سے استفادہ کی کوشش کی اور سنہ ۱۹۱۰ء تک کے اولڈ بوائز سے بھی معلومات حاصل کرنا چاہیں تو اتنا ہی پتہ چلا کہ انٹروڈکشن نائٹ، بھیّا پارٹی، مڈرائٹ، الیکشن کی جملہ روایات، شاعروں اور مُباحثوں کی محافل، کھیلوں اور ڈراموں کا مشغلہ، ایکٹیویٹی کرنے کا آرٹ، یہ سلسلے ہمیشہ سے جاری و ساری چلے آرہے ہیں اور تمام بزرگوں نے بھی اس کی تائید کی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان روایات نے ایم اے او کالج کے زمانے میں جنم لیا اور سال بہ سال توانائی حاصل کرتی رہیں۔ البتہ وقت کے ساتھ ساتھ ان میں ترمیمات ہوتی رہیں جیسا کہ معلوم ہوا کہ تقسیمِ ہند کے بعد غالباً بدلتے ہوئے حالات یا روایات میں تشدّد آفرینی کے اسباب کی بنا پر بعض دیرینہ اور آزمودہ روایات سے کنارہ کشی اختیار کر لی گئی ہے۔ ان کی خانہ پُری کس طرح کی گئی یا بالکل نہ ہوئی اس بارے میں ہمارے پاس کوئی حتمی اطّلاع نہیں، بہرحال ہم اپنے دَور یعنی چالیس کے عَشرہ اور اس سے پیشتر چالیس پچاس سالہ روایات کا احاطہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس کیلئے ہمیں اپنے بُزرگ بھائیوں کا تعاوُن اور اساتذہ سے استفادہ کرنے کی سعادت حاصل ہے اس کے ساتھ ہم عصرِ حاضر کی بابت بھی اپنے نوجوان بھائیوں سے کچھ معلومات اخذ کر کے شاملِ مضمون کریں گے تاکہ روایاتِ جدید سے بھی کسی قدر آگاہی ہو سکے۔

—— ۰)۰>۰(※)۰<۰(۰ ——

www.taemeernews.com

اِنٹروڈکشن نائٹ اور مڈرائٹ

فصلِ گُل میں جیسے طرح طرح رنگ برنگے پھُول کھِل کر چمن دَر چمن رعنائیاں اور رنگینیاں بکھیرتے ہیں اسی طرح یونیورسٹی میں داخلہ کے ایّام میں نونہالانِ قوم جب ہوسٹلوں کے کمروں، برآمدوں اور سبزہ زاروں میں پھیلتے ہیں تو ہر جگہ بہار ہی بہار کا منظر ہوتا ہے یونیورسٹی کا ہر کونہ گوشہ مہک اُٹھتا ہے۔ سارے گُلشن میں جشنِ بہاراں کا ظہور ہوتا ہے اور جب یہ خوشنوا بولتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے جیسے ہنگام سحر طائرانِ خوشنوا نغمہ سنج ہوں۔ علیگڑھ میں داخلوں کے مناظر اور اس دَوران وہاں کی رونقیں دیکھنے سے تعلّق رکھتی ہیں! اپنی منزلِ مقصود کو پانے یعنی داخلہ کا مورچہ فتح کرنے اور رہائش گاہ مل جانے کے چند روز بعد ہی ہر نو وارد کو سب سے بڑے تعارفی اِمتحان سے دوچار ہونا ہوتا تھا۔ یہ معرکہ فردوسِ علیگڑھ میں جگہ پانے کے لئے پُل صراط کا کام کرتا تھا جس نے اسے کامیابی سے پار کر لیا وہ جنّتی بن گیا اور علیگ کہلایا جو جھجک گیا وہ بھٹک گیا اس نے واپسی کا ٹکٹ کٹایا۔ لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ ہر سال جنّتی تو سینکڑوں ہزاروں بنتے تھے جبکہ محرومین مشکل سے دوچار ہوتے۔ نئے طالب علموں کو درپیش اس عالم حشر کا نام "انٹروڈکشن نائٹ" ہوتا تھا۔ دَر اصل عازمین علیگڑھ کو ان کے بزرگ اور دوست اس "شب تعارف" کے انداز اور غرض و غایت سے پہلے ہی سے بخوبی آگاہ کر دیا کرتے اور تسلّی دلاسے دے کر اچھی طرح ان آزمائشی گھڑیوں سے نبرد آزما ہونے کے نکات

بھی سمجھا دیا کرتے تھے تاکہ نیا پنچھی اس رات کے شور وغل، جملوں اور شرارتی حملوں کو سہہ سکے اور سر پر پاؤں رکھ کر نہ بھاگ کھڑا ہو۔

'انٹروڈکشن نائٹ' ایک ایسی رات بپا کی جاتی تھی جس کی تاریخ اور گھڑی کا صحیح تعیّن خود ایک سربستہ راز ہُوا کرتا تھا یہ ہر ہوسٹل اور ہال میں ہر سال تقریباً یکساں روایت لیکن مختلف تاریخوں میں منعقد ہوتی جس کے دوران علیگڑھ میں پہلی مرتبہ داخل ہونے والوں سے شرف تعارف حاصل کیا جاتا۔ یہ شب صرف یونیورسل بیوقوفوں یعنی سال اوّل والوں پر ہی نہیں بیتتی بلکہ ایم اے' ایل ایل بی' بی ٹی وغیرہ کے ہر نئے طالب علم کو بھی شب تعارف کے جملہ مراحل سے گزرنا پڑتا تھا۔ اِدھر تعارف کرنیوالوں کی ٹیم علیگڑھ کے 'سینئرز' پر مشتمل ہوتی تھی۔ اس کی شرط کم ازکم قیام ہوسٹل کا چوتھا سال اور بی اے کا طالب علم ہونا تھی بالعموم ایم اے یا آنرز کے پُرانے طلبا۔ جو علیگڑھ کی چھ سات بہاریں دیکھے ہوئے ہوتے اس انٹروڈکشن پارٹی کی قیادت کرتے۔ پھر جب ہوسٹلوں کی ہر طرح 'کمرہ پُری' ہو جاتی اور تمام نئے طلبا اپنے ٹھکانوں سے مانوس ہو جاتے تو کسی ایک رات تمام روشنیاں مین سوئچ سے بند کر دی جاتیں جس کے ساتھ یکلخت ڈھول اور پیپوں کی زبردست تال پر بگل بجا کر ایک بے ہنگم شور بلند ہوتا اس 'صور محشر' کے پھُنکتے ہی نور سید مُرغان چمن اپنے آپ کو نزول بلایات سے محفوظ رکھنے کے لئے ساری دُعائیں دم کرتے عملیات کرتے۔ بعض وحشت کے مارے باتھ روم کا رُخ کرتے کچھ احتیاطاً کچھ احتیاجاً لیکن چند اناڑیوں کے علاوہ جو کونے بچالوں یا جھاڑیوں میں چھپنے کی ناکام کوششیں کرتے باقی جملہ محتاجانِ تعارف اپنے اپنے پلنگ پر بیٹھے بیٹھے یا کھڑے ہو کر قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ کا وِرد کرنے لگتے بھگوڑوں کو بعد میں اس سے دوچند مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا کیونکہ انہیں بھاگنے کی اضافی سزا بھی بھگتنا ہوتی۔ اس معاملے میں اتنی احتیاط ضرور برتی جاتی کہ جس سینئر کے

بھائی یا عزیز کا تعارف ہونے والا ہوا سے اتنی دیر کے لئے پارٹی سے علیحدہ کر دیا جاتا۔ الغرض یہ حملہ آور پارٹی ہوسٹل کے کسی ایک طرف سے اپنی مہم کا آغاز کرتی سب سے پہلے گھپ اندھیرے میں لڑکے کی لالٹینوں سے منہ دکھائی کروائی جاتی پھر تیز ٹارچوں کی روشنی سے اس کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کی جاتی اور مہیب آوازیں نکال کر اس پر عالم گھبراہٹ طاری کرنے کی ممکنہ کوشش کی جاتی! اس تعارفی ہنگامے میں جو سوالات کئے جاتے وہ دلچسپ اور انوکھے ہوتے بعض بے تکے اور بے معنی استفسارات بھی کئے جاتے مگر اس غریب کو تو ہر ایک کا کچھ نہ کچھ جواب بھگتانا ہی پڑتا۔

بالعموم سوالوں کا سلسلہ کچھ اس طرح سے ہوتا: کس جنگل سے آیا ہے؟ وہ جس شہر کا نام لیتا اس پر کچھ لعن طعن کی جاتی مثلاً بریلی کا ہے تو سُرمہ کیوں نہیں لگاتا۔ رامپور کا ہے تو چاقو دکھا۔ بہاری ہوتا تو سب کہتے بابا اسے معاف کرو اس میں اس کی کوئی خطا نہیں۔ مزید سوال ہوتا: کس ڈویژن میں پاس ہُوا؟ اگر تھرڈ ڈویژن ہوتی تو لعنت ملامت کی جاتی۔ نام کیا ہے؟ وہ کہتا شکیل تو شور بلند ہو جاتا اسے آئینہ دکھاؤ یہ شکل اور شکیل! پھر والد کا نام دریافت کیا جاتا وہ کہتا عبدالرحمٰن تو شور بلند ہوتا کہ عبدالرحمٰن خان تو نہایت شریف آدمی ہیں یہ بدمعاش ان کے گھر کہاں پیدا ہوا، اور حکم ہوتا دانت دکھاؤ! وہ دانت دکھاتا تو ٹارچ ڈالی جاتی اور کہا جاتا ارے کبھی صاف بھی کرتا ہے لے مسواک کر کے دکھا۔ اس کے بعد دانت گنے جاتے اور اعلان کر دیا جاتا کہ بھائی دو دانت کا ہے قربانی جائز ہے۔ پھر پوچھا جاتا شعر کہنا آتے ہیں؟ گانا جانتا ہے؟ اگر شاعر ہوتا تو چند شعروں کی فرمائش کی جاتی، جن پر داد دینے کے بجائے پھٹکار برسائی جاتی، پھر پوچھا جاتا تیرا اُستاد کون ہے؟ اس کے بعد اُستاد کی شان میں کچھ توصیفی کلمات کہے جاتے۔ اسی طرح گانا گوایا جاتا اور اس کے ساتھ مل کر دُوسرے رونا شروع کر دیتے، کتنا کمبخت کل سرا ہے ایسے گانے سے تو بہتر ہوتا

کہ رونا سیکھا ہوتا۔ پھر دریافت کیا جاتا کہ کھلاڑی ہے؟ تو کھیل کے متعلق چند سوالات کئے جاتے اگر واقعی کوئی معیاری کھلاڑی ہوتا تو اس کے ساتھ نرمی برتی جاتی ورنہ کھچائی کی جاتی اگر کوئی ورزش کا شائق ہوتا تو کہا جاتا ڈنڈ بیٹھک لگا کر دکھا اچھا چل لنگوٹ کیسے باندھتے ہیں؟ پھر وہ سب کے سامنے پاجامے پر لنگوٹ باندھ کر دکھاتا۔ کپڑے میلے ہوتے اس پر ٹوکا جاتا اگر بہت بنے چنے ہوتے تو کہتے بڑا بانکا چھبیلا ہے یہ لال کمر بند کیوں ڈالا ہے؟ یا کس کی فرمائش پر ڈالا ہے؟ حکم نافذ ہوتا کہ چال دکھا؟ چلتا تو کہتے: یہ تو بڑا بدچلن ہے' اسے چلنا بھی نہیں آتا۔ پھر کہتے، دوڑ کر دکھا، وہ بیچارہ بھاگتا تو کہتے ایسے تو چور بھاگتے ہیں پکڑیو پکڑیو کا غُل ہو جاتا۔ ایک مرتبہ دو گرانڈیل بھائی ہاتھ آ گئے ان بیچاروں کو نہ تو گانا آتا تھا نہ شاعر تھے اور نہ کھلاڑی لہٰذا انہیں قریبی کنویں کے رہٹ میں 'جوت' دیا گیا۔ ایک مرتبہ صوبہ سرحد کے خانصاحب سے گانے کی فرمائش کی گئی تو انہوں نے مجبور ہو کر کہا" گانا تو بہت بھاری گناہ ہے خو بھی ہم سے قرآن آتا ہے وہ سُن لو" اور یہ کہہ کر تلاوت شروع کر دی جس کے احترام میں سب خاموش ہو گئے۔ اس رات میں جو زیادہ بننے کی کوشش کرتا یا جس کے متعلق یہ معلومات کر لی جاتیں کہ ابھی سے سینئر بننے کا خواہاں ہے اس سے انتقاماً زیادہ ہی باز پُرس کی جاتی۔ ہمارے ایک ساتھی دل پھینک واقع ہوئے تھے سُنا گیا تھا کہ داخلہ ملتے ہی وہ گرلز کالج کی خوشبو لینے میرس روڈ کے چکر لگانے لگے۔ لہٰذا اس کی سزا انہیں یہ بھگتنا پڑی کہ اس رات ان کے کئی عاشق پیدا ہو گئے۔ یہی نہیں سرِعام انہوں نے معاشقہ کا اظہار بھی کیا اور جب موصوف کے گال حیا سے سُرخ ہونے لگے تو ایک عاشق نے بڑے پیار سے اُن کے مُنہ پر کلونچ مل دی جس سے رومانس کا بھوت ان کے سر سے فی الفور اُتر گیا۔ اسی طرح اپنی امارت کا کوئی کسی طرح بھی اظہار کرتا تو اس کی خیر نہیں ہوتی نہ صرف اس سے

سرسیّد کی فاتحہ کا چندہ دُگنا تِگنا وصُول کیا جاتا بلکہ اس طرح کے سوالات کئے جاتے جس سے اس کی مٹی خود پلید ہو جاتی، کوئی کہتا پلنگ پر مچھر دانی لگا کر دکھا، کوئی حکم کرتا پلنگ کمر پر رکھ کر بستر سمیت صحن سے کمرے میں ڈال کر آ۔ کوئی کہتا تیرے جوتے بہت گندے ہیں پالش کرنا نہیں آتا، ذرا چمکا اس میں مُنھ دکھا۔ یہاں تک کہ کمرے میں جھاڑو لگوانے کے احکامات بھی صادر ہوتے اور آخر میں یہی فیصلہ ہوتا کہ اتنے ناز و نعم سے پالنے کے بعد والدین نے سزا دینے علیگڑھ کیوں بھیج دیا ہے۔ بولیوں کی فرمائش تو بہت عام تھی، یعنی کُتّے، بلّی، گدھے وغیرہ کی۔ جب وہ بے چارہ ڈھینچو ڈھینچو کرتا تو کہا جاتا یہ تو سچ مچ گدھا نکلا! جب کوئی بھونکتا تو شور مچاتے: بچنا کاٹے گا بھئی کاٹے گا۔ اَلغرض سال بہ سال ہوسٹل بہ ہوسٹل متنوّع قسم کے سوالات کئے جاتے۔ ان موقعوں پر بسا اوقات نہایت برمحل اور فی البدیہہ جواب بھی سُننے کو ملتے۔ بالآخر پانچ دس منٹ میں جب ایک تعارف اختتام کو پہنچتا تو سرسیّد کی فاتحہ کا چندہ طلب کیا جاتا جو وہ غریب پہلے ہی سے ادا کرنے کو آمادہ رہتا۔ اس زمانہ میں اوسط چندہ پانچ روپیہ فی کس تھا لیکن بعض زیادہ گھبرا جانے والے غالباً تلاشِ زود عافیت میں دس بھی دے جاتے، موٹی مُرغیوں سے یہ ٹیکس دُہری شرح سے اینٹھا جاتا۔ بالآخر ہنگامۂ شور و شر میں ساری رات گزر جاتی اور صبح کی پو پھٹنے سے کچھ قبل یہ عجیب و غریب دُور رس نتائج کی حامل مہم اپنے انجام کو پہنچتی۔ اس طرح روزِ اوّل سے نئے طالب علموں کو جو دھڑکا لگا رہتا تھا جن پر ہر رات ایک بے چینی اور سراسیمگی کا نیا عالم ہوتا تھا جس کی وجہ سے انہیں صحیح طور سے نیند بھی نہیں آیا کرتی تھی وہ دھڑکا ہمیشہ کے لئے دُور ہو جاتا۔ گویا اس بہانے ہنگامۂ محشر کی چھوٹی موٹی ریہرسل سے آشنائی ہو جاتی۔ چنانچہ اس تعارفی معرکے کے بعد جس فراغت سے نیند آتی تھی اس کا اندازہ وہ سب بھائی بخوبی لگا سکتے ہیں جو اس رہ صواب سے گزرے۔

سرسیّد کی فاتحہ کے محصولات کی رقم سے جو اس دَور کے اعتبار سے نہایت خطیر ہوتی، ایک شاندار چائے پارٹی کا اہتمام کیا جاتا جس میں چائے کے ساتھ کیک پیسٹری، بنگالی مٹھائی اور پھلوں سے سَجے ہوسٹل یا ہال کے مکینوں کی اچھی طرح تواضع کی جاتی۔ بھیّا پارٹی کی اِس شاندار تقریب کے لئے نو واردوں میں سے سب سے زیادہ احمق بلکہ جھکّی کا جو ایم اے/ایل ایل بی میں داخل ہُوا ہو بطور بادشاہ انتخاب کیا جاتا جس کے لئے نعلین سے مُرصّع خصوصی ہار تیار کروایا جاتا اس خوبی سے کہ دیکھنے والوں کو پھُول ہی نظر آتے اور اسی طرح ایک پیکرِ نسوانیت لڑکے کو ملکہ بنایا جاتا، جسے پھولوں کا تاج اور ہار پہنا کر اسٹیج پر بادشاہ کے پہلو میں بٹھایا جاتا۔ اس کے بعد فرداً فرداً اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو کر سب نئے طالب علم اپنا تعارف کرواتے۔ اس موقع پر چپکتے ہوئے فقروں کا استعمال تو روا ہوتا جس سے تعارف میں جان پڑتی رہتی لیکن لڑکوں کو زچ یا تنگ نہیں کیا جاتا۔ اس مُبارک دن ہی بسا اوقات عادات و خصائل، شکل و صُورت و جسمانیت کی مُناسبت سے خطابات سے بھی نوازا جاتا جو بالعموم دائمی ہو جاتے۔

بھیّا پارٹی کے اختتام کے بعد بقیہ رقم سے تعارف کنندہ سینئرز کا نہایت عُمدہ ڈنر منعقد کیا جاتا جس میں متعدّد قسم کے مُرغن کھانے خاص طور سے تیّار کروائے جاتے۔ ہمیں آج بھی ایک خود ساختہ ماہر کا تیّار کردہ مُرغ مُسلّم یاد ہے جس کا پیٹ چاک کیا گیا تو اس میں بادام اخروٹ پستے اور چھوارے وغیرہ برآمد ہوئے گویا مُرغن غذا کو خشک میوے سے خشک کرنے کا نسخہ آزمایا گیا تھا۔ تعارفی رسومات کے عرصے میں گرچہ وارڈن صاحبان ہوسٹل میں ہی قیام پذیر ہوتے لیکن اپنے اوپر کرفیو لگا کر کمروں میں ہی مقیّد رہتے مگر اس کے ساتھ ساتھ بیرونی حالات سے ہمہ وقت باخبر رہتے تاکہ کسی قسم کی بدمزگی واقع نہ ہونے پائے

اور ہنسی مذاق ظلم و تعدّی کی صورت اختیار نہ کرے۔ جملہ تقریبات بخیر و خوبی گزرنے پر وارڈن صاحب سینئرز کو مبارکباد دیتے اور نئے لڑکوں کی دلجوئی کے لئے سب سے ملاقات کرتے اور ان کا حال چال دریافت کرتے۔

اس طرح، انٹروڈکشن نائٹ کے کنووکیشن سے علیگ بننے کی سند ملنے کے بعد نئے بھائیوں کو بہت پیار محبت سے علیگڑھ کے آداب سے روشناس کروایا جاتا یعنی اپنے سینئرز سے کس طرح پیش آنا چاہیئے۔ ان کے کمروں کے سامنے بلاضرورت گزرنے سے بچنا چاہیئے۔ دورانِ گفتگو حفظِ مراتب ملحوظ رکھنا چاہیئے اور سلام میں سبقت کرنا چاہیئے اور یہ عادت تو اس قدر پختہ ہو جاتی ہے کہ علیگڑھ کے قیام کے دوران ہی نہیں بلکہ ساری عمر ہر علیگ بھائی سلام کرنے میں اتنی عجلت کرتا ہے کہ وعلیکم السّلام کہنے کی نوبت ہی نہیں آتی اسی وجہ سے آج بھی علیگ جب ملتے ہیں تو طرفین سلام علیکم کے جواب میں سلام علیکم ہی کہا کرتے ہیں! دو سال قبل جب ہم علیگڑھ کی زیارت کو گئے تو ہمیں یہ دیکھ کر گونہ اطمینان ہوا کہ بھارت کے روز و شب بدل جانے کے باوجود علیگڑھ میں طلبا، و اساتذہ اب بھی سلام علیک سے ہی ایک دوسرے کو دعا دیتے ہیں جس میں استاد شاگرد ہندو مسلمان کی کوئی قید نہیں اس طرح السّلام علیکم بھی علیگڑھ کی ایسی دائق روایت ہے جو علیگ کی پہچان بھی کہی جا سکتی ہے۔

یونیورسٹی کا تعلیمی سال بالعموم وسط جولائی سے شروع ہوتا تھا جو بارشوں کا موسم ہوتا ہے، داخلے مکمل ہوتے ہی انٹروڈکشن نائٹ اور بھیّا پارٹی کے فرائض سے نمٹا جاتا جس کے بعد نئے اور پرانے طلبا میں تال میل بڑھتا جاتا اور بعض نئے لڑکے جو گھبرا کر علیگڑھ سے فرار ہونے کا پروگرام بناتے وہ بھی وہاں کے طرزِ زندگی سے محظوظ ہونے لگتے اور ان کی اداس طبیعتوں میں بھی ٹھکاؤ پیدا ہونے لگتا۔ ساون کی ایسی گدرائی ہوئی رُت

میں جب چاروں طرف سے اُمڈ گھمڈ کر کالے کالے بادل آتے ہیں اور تال سُر کے ساتھ قطرے زمین پر ترنّم ریز ہوتے ہیں تو ایسے میں کس کافر سے گھر میں بیٹھا جاتا ہے۔ چنانچہ موسم کی کنکھیوں کا اشارہ پاکر برکھا کا مزہ لوٹنے اور جشنِ باراں منانے کے لئے علیگڑھ میں مڈرائٹ (کیچڑ بازی) منانے کا بھی ایک منفرد و دلچسپ انداز تھا۔ آخر جولائی یا شروع اگست میں جب بھی پہلی موسلا دھار بارش سے زمین جل تھل ہو جاتی عین اسی وقت ہوا کے شور سے زیادہ تیزی کے ساتھ، بجلی کی چمک اور بادل کی گرج کی داد دینے اپنے اپنے کمروں سے نوجوان باہر نکل پڑتے، خوب نہاتے کیچڑ ملائی ہوتی کیچڑ کے گولے بناکر گولہ باری کی جاتی، کُشتیاں لڑتے اور اُچھل کُود کر اتنا چیختے اس قدر شور بپا کرتے کہ بادل تک سہم جاتے۔ ایسے میں اگر کوئی بد مذاق برآمدے میں رہ کر اس منظر سے لُطف اندوز ہونے کی کوشش کرتا تو وہ زیادہ گھاٹے میں رہتا اس لئے کہ چشم زدن میں خود اس کے ہی ساتھی گھسیٹ کر پانی میں ڈال دیتے۔ کچھ دیر اپنے ہوسٹل میں کیچڑ بازی کے بعد سب اکٹھے ہو کر دوسرے ہوسٹل والوں کے خلاف معرکہ آرائی کرنے لگتے اور پھر ہوسٹلوں سے بڑھ کر بات ہال تک پہنچتی اس طرح اس دن اور اس گھڑی کوئی لڑکا، علاوہ بیماروں کے کمرے میں باقی نہیں رہتا۔ گویا یہ ایک ایسا مساوات کا کھیل تھا جس میں بیک وقت ساری یونیورسٹی کے ہوسٹلوں کے طلبا جن کی تعداد پانچ ہزار کے قریب تھی حصّہ لیتے اور بالخصوص نئے لڑکے جن کو پہلی بار یہ دن نصیب ہوتا اس میں زیادہ ہی دلچسپی کا اظہار کرتے اس لئے کہ اتنے اچھے موسم کی داد اس سے بہتر طریقے سے اور کیا دی جا سکتی تھی!

یہ ایک حیرت کی بات ہے کہ 'باراں مستوں' کے اتنے بڑے اجتماعی مظاہرے کے دوران نہ کوئی جھگڑا ہوتا نہ بدمزگی، جبکہ ان کی نگرانی کے لئے نہ کوئی اُستاد متعیّن کیا جاتا نہ وارڈن دخل دیتے۔ چند گھنٹے کیچڑ زنی اور جی کھول کر دھما چوکڑی مچانے

کے بعد پانی سے شرابور تھکے ہارے لڑکوں کی پلٹنیں کیچڑ آلود چہرے لئے اپنی اپنی بیرکوں میں نہایت ضبط و نظم کے ساتھ واپس ہو جاتیں جہاں جلدی جلدی گیلے کپڑے تبدیل کئے جاتے کہ اسی اثنا میں ڈائننگ ہال کی گھنٹی گرم گرم چائے کی تیاری کا مژدہ سنا دیتی۔ سر سے پاؤں تک بھیگنے اور تند ہوا کے سرد جھونکے کھانے کے بعد گرم چائے سے زیادہ اور کوئی چیز مطلوب نہیں ہو سکتی تھی اس لئے ہر ایک پر اس کی طلب کا غلبہ ہوتا۔ پھر یہ چائے روزمرہ والی نہیں بلکہ خاص طور سے دارچینی لونگ الائچی وغیرہ کو شامل کر کے تیار کروائی جاتی، تکان اور خشک ہوا کے تھپیڑوں کے بعد اس بے تکلف چائے کا گھونٹ حلق سے اترتا تو تریاق کا کام دیتا مزہ اور لذت اس پر مستزاد۔ اس دن چائے کی 'پیالی شماری' بھی نہیں کی جاتی اس لئے چائے کو مڈرائٹ کا انعام سمجھ کر لڑکے خوب خوب پیالیاں بلکہ چائے دانیاں ڈکوستے رہتے۔

آج بھی جب ہم کراچی کی برائے نام بارش کے دوران اپنے بچوں کو گھر کے آنگن میں رقصاں دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور وہ کبھی گھسیٹ کر ہمیں بھی حق موسم ادا کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں تو نصف صدی گزرے ہوئے مڈرائٹ کے مناظر فلم کی صورت میں سامنے آجاتے ہیں اور دل چاہتا ہے کہ کاش ہماری نسلیں بھی ان روایات کے مزے لوٹ سکتیں جو یوں تو آرٹس کی ماہر کہی جاتی ہیں پر انہیں 'مڈرائٹ' کا کوئی تصور نہیں۔

www.taemeernews.com

رُودادِ شیروانی و محفلِ دسترخوان

ہر تعلیمی ادارے اور یونیورسٹی کی طرح علیگڑھ میں بھی یونیفارم کا نفاذ رائج تھا لیکن اس معاملے میں وہاں جس جوش و جذبہ سے سیاہ شیروانی پہننے پر عملدرآمد ہوتا تھا، شاید فوج یا کسی اور ادارے میں یونیفارم پر ہوتا ہو۔ علیگڑھ ہوسٹل کے ڈائننگ ہال میں جانے، ہوسٹل سے باہر قدم رکھنے، وارڈن صاحب یا پرووسٹ صاحب سے ملاقات کرنے کے مواقع پر شیروانی پہننا اور وہ بھی پورے بٹن لگا کر بند کالر کے ساتھ بہت ضروری تھا۔ پاؤں میں جوتا مع جُراب ہونا لازم تھا۔ شہر، ریلوے اسٹیشن، نمائش یا سینما میں تو بغیر شیروانی جانے کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بعض اوقات تو بڑے بڑے پروفیسر صاحبان کلاس میں جوتوں کا پالش اور فیتوں کا کسا ہُوا ہونا بھی جانچ لیا کرتے تھے۔ یہ اسی مؤثر نظام کا طفیل تھا کہ علیگڑھ کا طالب علم ہر جگہ اپنی خوش لباسی اور خوش سلیقگی سے علیحدہ پہچانا جاتا۔ یعنی شہر ہو، کالج ہو، اسٹیشن ہو، نمائش ہو، حتیٰ کہ دہلی ہو یا لکھنؤ کسی لڑکے کو یہ بتانے کی ضرورت نہ ہوتی کہ وہ علیگڑھ یونیورسٹی کا اسٹوڈنٹ ہے۔ سچ پوچھئے تو عام شہری نہیں سرکاری افسران اور کارندے بھی یونیورسٹی کے لڑکوں کو احترام کی نظر سے دیکھتے، جس پر دوسرے اداروں کے طلبا رشک و حسد کی حد تک رشک کرتے۔

یوں تو یہ درس گاہِ اعظم ہی سرسیّد کا مسلمانوں کے لئے ایک تحفۂ جاریہ ہے

تاہم خوراک اور پوشاک سیّد کے خصوصی فیضان کا مظہر ہیں اور جس طرح آج کا اولڈ بوائے یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ وہی کھانا کھاتا ہے جو اب سے ایک صدی قبل کے طلباء کو میسّر تھا، اسی طرح ہمارا یہ دعویٰ بھی مُسلّم الثبوت ہے کہ ہم لباس کے معاملے میں بھی اپنے سے سینئر ترین اولڈ بوائز سے کسی طرح کم نہیں. واقعی کتنی مُبارک تھیں وہ گھڑیاں جو بابائے علم نے بچّوں کے لئے غذا کا انتخاب کیا اور دَسترخوان کو ایسا نسخہ عطا فرمایا جو نسل دَر نسل ہر ایک کو بھایا اور سو سے زیادہ سال گزُرنے کے باوجود اس کی رنگت، لذّت اور شہرت جُوں کی تُوں برقرار ہے۔

اَب جہاں تک یونیفارم کا تعلّق ہے تو یہ حیران کُن حقیقت ہے کہ کالا رنگ بالعموم سوگ وغم کی علامت سمجھا جاتا ہے لیکن کالی شیروانی خود پہنو یا پہنے دیکھو تو مسرّتوں کے چشمے اُبل پڑتے ہیں پھر یہ رنگ بھی تو کالی کملی والےؐ کا من پسند ہے اس کو تو سب پر غالب آنا ہی ہے یہی وَجہ ہے کہ ہر زمانے میں سیاہ شیروانی کے مراتب بُلند سے بُلند تر ہوتے جا رہے ہیں اس کا کمال ملاحظہ ہو کہ اسے 'اولڈ' پہنے تو 'ینگ' نظر آئے اور 'ینگ' پہنے تو ترنگ بھرنے لگے! اس لباس معتبر و مفتخر کی مقبولیت کی معراج دیکھئے کہ آج اس کا شمار ہندوستان اور پاکستان دونوں کے (OFFICIAL DRESS) سرکاری لباس میں ہوتا ہے۔ اس طرح شبہات و سازشوں کا شکار، اکثر برسرِ پیکار دونوں مملکتوں میں سیاہ شیروانی اتّفاق اور یگانگت کی علامت نظر آتی ہے۔ یہ ایسا امتیازی شان ہے جو کسی اور پوشاک کو نصیب نہیں، واقعی اس ایک سیاہ شیروانی میں بھی کتنے رموز پنہاں ہیں جو مہ و سال گزُرنے کے ساتھ نمایاں تر ہوتے جاتے ہیں مثلاً اس لباس کا ایک بڑا اعجاز تو یہ ہے کہ اس میں امارت و غربت ضم ہو کر بڑائی کی ہر پہچان فنا ہو جاتی ہے اور یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس کا پہننے والا کس طبقے سے تعلّق رکھتا ہے۔ مزید برآں یہ کہ سیاہ شیروانی پہن کر نہ کوئی بنگالی رہتا

ہے نہ آسامی، نہ سندھی نہ پٹھان، نہ پنجابی کیونکہ اس لباسِ فاخرہ کو زیبِ تن کرتے ہی دُوسری نسبتیں، تمام عصبیتیں ختم ہو جاتی ہیں اور ہر ایک علیگ ہی نظر آتا ہے۔ یہی نہیں یہ شیروانی جہل کی پردہ پوش بھی ہے یعنی اسے پہننے والا نہ صرف دیکھنے والوں کی نظر میں 'علیگ' بن جاتا ہے بلکہ اپنے آپ کو بھی معزز سمجھ کر اسی طرح برتاؤ بھی کرنے لگتا ہے۔ ہم نے چند ایسے بزرگ دیکھے جو 'ابوجہل' ہونے کے باوجود محترم سمجھے جاتے تھے، کیونکہ شیروانی نے ان کا ایسا بھرم رکھا تھا کہ کسی کو یہ شبہ کرنے کی بھی گنجائش نہ تھی کہ وہ بے پڑھے لکھے ہو سکتے ہیں۔

کیسے حسین ہوتے تھے وہ مناظر جب کالی شیروانیاں اور چٹے چٹے پاجامے پہنے ہزاروں لڑکے کلاسوں سے باہر نکلتے یا ٹولیوں کی شکل میں نمائش یا اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر چہل قدمی کرتے تو معلوم ہوتا جیسے اللہ تعالیٰ نے کوئی پسندیدہ مخلوق روئے زمین پر بھیج دی ہے۔ بلاشبہ اس بردباری اور رعنائی میں اس کالی کالی شیروانی کا بڑا دخل تھا۔ پھر آج سے چالیس پچاس سال قبل کے دور میں کالی شیروانی کو سیاہ برقعہ سے بھی خاصی رومانوی نسبت تھی۔ اس رنگ میں دونوں اپنے محبوبوں کے متلاشی اور منتظر رہا کرتے۔ لڑکوں میں صبر و تحمل کا عنصر مقابلتاً کم ہوتا ہے اس لئے انہوں نے تو اپنی نظموں اور غزلوں کے ذریعے اپنے جذبات کا والہانہ اظہار اور برقعہ سے نظریں لڑانے کا اعتراف کیا ہے لیکن سیاہ شیروانی کی شان میں اس جانب سے کبھی کوئی مصرعہ کہنے کی زحمت بھی نہیں کی گئی۔ اس ادائے محبوبانہ کا یہ مطلب نہیں سمجھ لیا جائے کہ شیروانی پوشوں میں ضرورت شعری کا کوئی فقدان ہے کیونکہ فی الحقیقت شیروانی تو از خود ایک مرصع اور مکمل غزل ہے جس کے پہنے بغیر نہ عاشق مکمل ہوتا ہے نہ عشق کو سکون ملتا ہے۔

یوں تو ترکی ٹوپی اور کالی شیروانی جنم جنم کے ساتھی ہیں لیکن ٹوپی پہلے اپنی

افادیت اور پھر اپنا وجود کھو بیٹھی، کیونکہ ترکی سے لاکھ محبّت کے باوجود ترکی ٹوپی بہرحال بدیسی پیداوار ہے جبکہ شیروانی سو فیصدی برِّصغیر کی ساختہ و پرداختہ ہے۔ ہم نے جس دور کا علیگڑھ دیکھا یعنی ۴۰ء کا عشرہ تو کبھی کی سر چڑھی یہ ٹوپی جیبوں میں مُنھ چھُپا چکی تھی اور بالعموم لڑکے اس کے استعمال سے گریز کرتے۔ البتہ شہر اسٹیشن یا نمائش جاتے وقت جیب میں ضرور ٹھونس لیا کرتے تھے تاکہ عند الطلب مانیٹروں کو دکھائی جا سکے۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ تکلّف بھی اُٹھ گیا اور لڑکے بالعموم ننگے سر رہ کر بالوں کے اسٹائل کی نمائش کرتے یا پھر جنھیں لیڈری کا سودا ہوتا وہ جناح کیپ کا اہتمام کرتے۔ لیکن عصرِ حاضر کے علیگڑھ کو جب دیکھنا ہُوا تو وہاں اس نظام کو یکسر مُتغیّر بلکہ مفقود پایا یعنی سیاہ شیروانی اَب بھی یونیورسٹی یونیفارم اور قومی لباس ہوتے ہوئے تالوں میں بند رکھی جاتی ہے۔ اس کے برعکس اگر یونین میں کوئی مقرّر خواہ وہ مہمان ہی کیوں نہ ہو، بغیر ٹوپی اوڑھے پہنچ جائے اور خطاب کی جسارت کرے تو ہر طرف سے ٹوپی۔ ٹوپی کی صدائیں بُلند ہونے لگتی ہیں اور وہ بے چارہ جب تک کسی طرح کا سر پوش نہ رکھ لے اُسے لب کُشائی کی اجازت نہیں ملتی۔ اب یہاں ٹوپی سے مُراد سرسیّد کے سر چڑھی ترکی ٹوپی ہوتی تو بات کچھ سمجھ میں آجاتی لیکن محض 'سر پوشی' کے لئے اتنا ڈرامہ کرنا بے محل معلوم ہوتا ہے چنانچہ ایسی ہنگامی حالت میں جس کو جو میسّر آجائے وہ لکھنوی دوپلڑی ہو یا رامپوری مخملی۔ کھدّر کی گاندھی کیپ ہو یا جواہر کیپ، یا پھر بالوں کی ٹوپی کوئی قسم کسی رنگ میں ہو۔ فاضل مُقرّر سر پر رکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

کاش ہمارے نوخیز ہونہاروں کو اس 'عظمت' کا احساس ہوتا جو سیاہ شیروانی کو حاصل ہے، اس احترام کو محسوس کر پاتے جو کالی شیروانی پہن کر حاصل ہوتا ہے تو بزرگوں کے علیگڑھ، ہمارے علیگڑھ، آج کے علیگڑھ اور کل کے علیگڑھ کے لباس میں

یکسانیت برقرار رہتی اور کسی کو یہ بتانے کی ضرورت نہ پیش آتی کہ وہ بھی اسی عظیم مادر درس گاہ کی اتنی ہی لائق وفائق پیداوار ہے جس کے قیام کو ایک صدی بیت چکی۔

علیگڑھ میں ڈائننگ ہال کا خاصا کامیاب نظام تھا وہاں گرچہ سالن میں تو وہی دو بوٹی اور چلّو بھر شوربہ ہوتا لیکن روٹی کی تعداد پر پابندی نہ تھی اور دال بھی بقدر طلب مل جاتی گرچہ اس دال سے روٹی کا کھانا اپنی جگہ ایک علیحدہ مسئلہ تھا۔ پھر ڈائننگ ہال میں چونکہ ہاٹ کیس ہوتے اس لئے کھانا گرما گرم ملتا اور پانی بھی ٹھنڈا دیا جاتا اس کے برعکس یہی کھانا جب خوانوں کے ذریعے کمروں پر تقسیم کیا جاتا تو روٹی کی برکت غائب ہو جاتی اور سالن کا حلیہ بگڑ جاتا۔ وہاں یہ بھی ایک دستور تھا کہ ڈائننگ ہال کے زمانے میں بلا عذر کمروں پر کھانا نہیں بھیجا جاتا تھا۔ ان حالات میں معدوں کو روٹیوں سے پُر کرنے والے لڑکے ڈائننگ ہال نہ ہونے کی صورت میں آدھے پیٹ ہی کھا پاتے لیکن وہاں سینئرز کی یہ بھی ایک جھوٹی انا تھی کہ بجائے ڈائننگ ہال جانے کے کھانا کمرے پر ہی منگوانے کو ترجیح دیتے۔ ہوسٹلوں میں یوں تو بلحاظ مقدار سب کو یکساں ہی کھانا دیا جاتا لیکن فوڈ مانیٹر صاحبان کو اس معاملے میں کچھ ایسی مراعات تھیں جیسے امریکہ کو ممالک خلیج میں، یعنی جب چاہیں گھپلا کر لیں اور ضرورت نہ ہو تب بھی اپنا حق جتائیں۔ تاہم اگر کسی کے کمرے میں مہمان آجاتا تو مانیٹر صاحب اپنی صوابدید سے وہاں زیادہ کھانے بھجوا دیتے۔ یار دوستوں کو گاہ بگاہ نوازنا توان کے فرائض مانیٹری میں تھا لیکن جس دن ان کی اپنی ڈیوٹی ہوتی تو پھر پانچوں گھی اور سر کڑھائی میں ہوتا۔ سینئر فوڈ مانیٹر صاحب تو ٹھہرے سب سے بڑے قاسم خوراک لہٰذا ہر فوڈ مانیٹر دل وجان سے انہیں اور ان کے قریبی احباب کو شکم سیر رکھنے کی کوشش کرتا۔ اس لئے 'ورائٹی' کے دن سینئر فوڈ مانیٹر صاحبان کے کمروں پر ان سے ملاقات کرنے جانا خاصا بامقصد و مفید ہوتا تھا۔ اب رہا ڈائننگ ہال کے منشی، باورچی اور دیگر

ملازمینِ مطبخ کی چوری چکاری کا مسئلہ تو وہ تو ایسی ملی بھگت تھی اور اس ٹیم کو اتنے داؤں پیچ یاد تھے کہ مانیٹر یا سینئر فوڈ مانیٹر صاحبان کے بس میں نہ تھا کہ ان کا سدِباب کر سکیں۔ آپ لاکھ جتن کریں لیکن کیا مجال جو ان کی چوری میں کمی واقع ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ علیگڑھ کے ڈائننگ ہال منشی وہاں کے لیکچراروں سے زیادہ متمول ہُوا کرتے تھے اس کے برعکس لڑکے جب چھٹیوں میں گھروں کو واپس جاتے تو معلوم ہوتا جیسے تحصیلِ علم کے ساتھ ساتھ ڈائیٹنگ کا بھی جبری کورس کر کے آئے ہوں!

پھیری والے خوراک رساں

علیگڑھ کے قائم المزاج کھانوں کی تعریف تو آپ نے ضرور سُنی ہوگی تھوڑا بہت حقِ نمک ہم بھی ادا کر چکے، یہاں فی الحال اتنا بیان کریں گے کہ اوّل تو اس میں لذّت یا ذائقے نام کی کبھی بھی کوئی چیز نہیں پائی جاتی تھی اور نہ ہی ابھی تک دریافت ہو سکی ہے۔ اپنے اس بے بدل مزے کے علاوہ اس کی مقدار اتنی کم ہوتی تھی کہ جوان پیٹوں کی آگ اس سے کہاں ٹھنڈی ہو سکتی تھی، اس لئے اس کمی کو پورا کرنے کیلئے وہاں خوانچہ فروشوں کی کثرت ہوتی تھی جو ہر قسم کی اشیائے خوردنی پھل مٹھائی، حلوے، سموسے، کیک وغیرہ سے بھرے خوانچے لئے چکر کاٹا کرتے۔ اور لڑکوں کی ایسی تواضع کرتے جیسے مہماں نوازی کا حق ادا کر رہے ہوں۔ نتیجتاً شام تک سب کچھ خالی کر جاتے۔

ہر مہینے کے دوسرے عشرے کے بعد سے لڑکوں کی قوتِ خرید تو کم ہو جاتی تھی لیکن جوانی کی بھوک کہاں زیر کی جا سکتی تھی اس لئے "خلوئے جیب" کے ان ایام میں روزانہ کی خریداری کریڈٹ پر جاری رہتی اور لڑکے ویندر صاحب کی ڈائری میں اپنا حساب لکھتے رہتے جو ماہ بماہ ادا ہوتا جاتا۔ اس طرح خوانچہ برداروں کی بکری میں بھی کمی واقع نہیں ہوتی اور بھائی لوگ بھی بھوک سے بچاؤ کا اہتمام کرتے رہتے۔ لیکن اس حساب کتاب کے معاملے میں کبھی کسی لڑکے نے دانستہ خیانت نہیں کی اور نہ ہی خوانچہ فروشوں سے کبھی کوئی بدمعاملگی سرزد ہوئی اگر کوئی بداطوار لڑکا نادہند

بننے کی کوشش کرتا تو وہ اپنے ساتھیوں کی نظر میں ہمیشہ کے لئے گر جاتا۔

چالیس کے عشرے کے ہر دلعزیز خوانچہ فروشوں میں کباب، پراٹھے کے کاریگر مسیتا تھے۔ کھیر اسپیشلسٹ محمود اور آئس کریم کے ماہر مولینا تھے وہاں تازہ کیک، پیسٹریاں اور علیگڑھ کی مشہور مٹری (بسکٹ) لئے متعدد وینڈرز گھوما کرتے۔ صوفی جی کھانے پینے کے ہر مال سے بھرا دسترخوان لئے آتے جس میں مٹھائیاں، حلوے، سموسے اور نمکین ہوتے جو بروقت معدہ پُری میں بہت معاون ہوتے۔ یہ وینڈر حضرات بھی بڑے بامذاق اور معدہ شناس ہوا کرتے تھے ایک بڑے مشہور فیرنی والے ممتاز نامی تھے جو ہمارے زمانے میں ہی ستر سے اوپر جا لگے تھے۔ ان کے پاس سکوروں میں انواع و اقسام کے رنگوں، ذائقوں اور قیمتوں کی فیرنی ہوا کرتی تھی جن کے انھوں نے ایف اے۔ بی اے۔ بی اے آنرز۔ ایم اے اور ایم اے ایل ایل بی جیسے بامعنی نام رکھے ہوئے تھے اور حقیقت ہے کہ ہر سکورے کا مزہ اس کے نام کے معیار کے مطابق ہوتا تھا۔ ان خوانچہ برداروں کے علاوہ کمروں کے دروازوں پر ہی فصل کے تازہ پھل گنڈیریاں، سنگھاڑے، امرود وغیرہ بیچنے والے پابندی سے حاضری دیا کرتے۔ ایسے تمام وینڈرز کو معمولی فیس ادا کرنے پر یونیورسٹی سے باقاعدہ لائسنس اور نرخنامہ جاری کیا جاتا جو سب کے پاس موجود رہتا اس لئے کبھی کوئی زیادہ قیمت وصول کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اس بیوپار میں ہمارے یہاں کا سا حساب رائج نہ تھا کہ حکام متعلقہ، ڈپٹی کمشنر اور کمشنر جس شے کے نرخ کا تعین کرتے ہیں بازار میں اس بھاؤ سے کبھی کوئی چیز دیکھنے کو بھی نہیں ملتی، بلکہ کھلے بندوں اس سے ڈیوڑھی دوگنی قیمتوں پر جملہ اشیا بکتی ہیں اور سرکاری نرخنامہ دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔ اس کے باوجود دلچسپ مزاحیہ قسم کے جملے کہ "حکومت قیمتوں پر کڑی نظر رکھے ہوئے ہے" برابر روزمرہ سننے کو ملتے ہیں۔ اس ضمن میں المیہ یہ ہے کہ یہ صورت حال

برسہابرس سے اپنی جگہ اٹل ہے۔ بالفاظِ دیگر حکمراں کوئی بھی سخت گیر مارشل لائی نسل کا ڈنڈے باز ہو یا ناتواں و بے بس جمہوری پارٹی کا مجبور محض جمہورا، پاکستان کے عیّار تاجر ہر دور میں اپنی من مانی کرتے چلے آئے ہیں اور کرتے رہیں گے اور سرکاری حلقے دست بستہ ان پر کڑی نظر رکھے رہیں گے۔

خوانچہ پروری کرنے والوں کے علاوہ جن حضرات کی بھوک قابو میں نہ آتی اور جیب متحمّل ہو سکتی تھی وہ 'کیفوں' میں جاکر شغل کرتے جس کے لئے اچھے سے اچھے اور غریب نواز اقسام کے ہوٹل بھی تھے جن میں کیفے ڈی جمیل کو پنج ستاری سمجھنا چاہیئے۔ ایک اور کیفے ڈی پھوس ان میں سے ایسا تھا جو متعدّد ہوسٹلوں کے درمیان میں واقع تھا اس لئے کمروں سے ہی آواز دے کر یا بیرا بھیج کر پیٹ کے لئے 'فرسٹ ایڈ' کا سامان منگالیا جاتا۔ اسی طرح کے طالب علموں کے مُعاوِنِ خوراک منٹو سرکل' اور وی ایم ہال کے قرب وجوار میں منتظرِ تواضع رہتے تھے۔ کیفے ڈی پھوس کے سر پر جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے چھپّر پڑا ہُوا تھا جو اس کی وجہ مقبولیت تھا ویسے یہ اپنے نمک پارہ اور برفی کے لئے مشہور تھا۔ سنہ ۱۹۹۰ء میں 'زیارتِ جامعہ' کے موقع پر ہم نے دیکھا کہ یہ پھوس پوش ہوٹل پختہ چھت مُہیّا ہونے کے باوجود اب بھی اپنے اسی موروثی نام یعنی کیفے ڈی پھوس سے ہی پکارا جاتا ہے' اور شاید اسی وجہ سے اس کی ہر دلعزیزی بھی برقرار ہے۔ البتہ نمک پارے یا برفی کا نمونہ چکھنے کی باری نہیں آئی جسے آئندہ دورے کے لئے اُٹھا رکھا ہے کیونکہ یہ کام بھی کرنے کا ہے۔

پیٹ پوجا کی انواع و اقسام کے سامان کے علاوہ دیگر اشیائے ضرورت کے تاجر بھی ہوسٹلوں کا طواف لگایا کرتے مثلاً علیگڑھ کے مشہور زمانہ تالے والے طرح طرح کے تالوں سے بھرا ٹرنک لئے گھوما کرتے، یہ لڑکوں خصوصاً نو واردوں

کوتالوں کے ٹرکس سے ایسا حیرت زدہ کر دیتے کہ ان کی جیبوں کے قفل کھل جاتے اور کبھی کبھی تو طالبانِ تالا زیادہ اور تالے کم پڑ جاتے۔ علیگڑھ کے انہی سنہرے ایام کی یادگار نشانِ کارکردگی سے معذور ایک تالا اب بھی ہمارا ساتھ نبھا رہا ہے اور ہم سے جب کوئی پوچھتا ہے کہ یہ کھلتا کیوں نہیں تو ہم کہتے ہیں کہ یہی تو اس کا وصف ہے یہ ٹرک والا تالا ہے۔

گھومنے پھرنے والے ہمارے خبر گیران تاجروں میں خصوصی کردار ایک رامپوری خان صاحب تھے جو قوی الجثہ اور وجیہ شخصیت کے مالک تھے جان ستھرا لباس اس پر مستزاد، زیادہ تر وہ شیروانی ہی پہنے رہتے لیکن گرمیوں میں جب باریک ململ کا کرتا تازیب تن کئے دو پلی ٹوپی اوڑھے نکلتے تو ان پر مومن خان اور استاد ذوق کے مصاحب کا گماں ہوتا معقول صورت، شریفانہ پوشاک اور اپنی شائستہ گفتگو کی وجہ سے وہ ایک منفرد و محترم مقام رکھتے تھے اور لڑکوں میں بہت گھلے ملے رہتے تھے۔ یوں تو خان صاحب مصنوعاتِ رامپور یعنی مخملی ٹوپی اور چاقو کا بیوپار کرتے تھے لیکن لڑکے ٹوپی چاقوؤں سے زیادہ ان کی باتوں اور کلام سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرتے۔ خان صاحب عاشق تخلص فرماتے اس لئے عاشقِ رامپوری کے نام سے یاد کئے جاتے اور سچ تو یہ ہے کہ انھیں بھی ٹوپیاں بیچنے سے زیادہ اشعار سنانے میں مزہ آتا۔ ان کا کلام محبوب کی عشوہ طرازیوں، رقیب کی عیاریوں اور ان کے توڑ کے عزائم سے پُر ہوتا۔ اس قسم کے نہایت دقیانوسی مگر شوخ اشعار جب وہ اپنی خشکن آواز اور لہجے میں سنانے بیٹھتے تو کمرہ محفل مشاعرہ بن جاتا اور لڑکے مزہ لوٹنے کے لئے ایسی داد دیتے کہ خان صاحب خود اپنے کو میر و غالب کا وارث سمجھنے لگتے لیکن اس ہنگام شعر و سخن میں اگر کوئی گستاخانہ حرکت کا ارتکاب کرتا تو خان صاحب اپنی خفگی کا برملا اظہار کرتے حتیٰ کہ آئندہ اس کے ہاتھ ٹوپی بیچنا بھی

پسند نہیں کرتے۔ بہرحال یہ ان کا رکھ رکھاؤ تھا کہ لڑکے انھیں اپنا بزرگ سمجھ کر احترام کرتے اور ذوقِ چاقو زنی نہ رکھتے ہوئے بھی چاقو خرید لیتے اور ٹوپی سے سر کو شوخ بنایا کرتے۔ یہاں یہ بتلاتے چلیں کہ خان صاحب نے یہ ہوٹل نوردی محض پیٹ پالنے کے لئے اختیار نہیں کی تھی کیونکہ ان کے پیشِ نظر اس سے کہیں ارفع مقصد تھا یعنی اولاد کو اعلیٰ تعلیم دلوانا جس میں وہ کامیاب رہے۔ عاشقِ رامپوری تو اس دنیا سے کبھی کے رخصت ہوئے لیکن ان کی پامردیٔ عزم کی یادگار وہ اخلاف ہیں جو حصولِ تعلیم کے بعد بڑے اونچے اونچے عہدوں پر پہنچے۔ کاش عاشقِ رامپوری اپنی محنتوں کا صلہ اور مشن کی کامیابی دیکھنے کے لئے آج اس دنیا میں ہوتے۔ یہاں اس درخشندہ مثال کو قلمبند کرنے کا مدعا یہ ہے کہ ناظرین بھی اندازہ لگا سکیں کہ اس درسگاہ عالیہ سے کیسے کیسے مختلف ذرائع سے فیض پہنچتا چلا آیا ہے اور ایک دو نہیں نہ جانے کتنے ہزار عاشق رامپوری کے گھرانوں کو روشنیٔ علم سے منور کرنے میں اس لائٹ ہاؤس کا حصہ ہے کیونکہ جہاں تک خواص کا تعلق ہے تو ان کی پذیرائی کے لئے ہر تعلیم گاہ کے دروازے ہر وقت کھلے رہتے ہیں لیکن علم کی دولتِ بیش بہا کو عوام کی جھولیوں میں بھر دینا علیگڑھ یونیورسٹی کا ایک قابلِ فخر کارنامہ اور ناقابلِ فراموش احسان ہے۔ خدا قوم کو اس احسان کا بار محسوس کرنے اور اس سے سبکدوش ہونے کی ہمت و استقامت دے اور یہ عظیم ادارہ تا قیامت فعال رہے۔

مذکورہ احوال سے قارئین کو یہ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ عام طور سے جملہ ضروریات کی اشیا کس طرح یونیورسٹی کے طالب علموں کو کمروں کی دہلیز پر دستیاب تھیں اور وہ بھی بازار سے کم نرخ اور ادھار کی سہولت کے ساتھ۔ اب رہا ذوقِ شاپنگ کا، تو اس زمانے میں شمشاد بلڈنگ اور اس کے اطراف میں واقع بازار میں ہر مطلوبہ شے مناسب اجرت پر بروقت مل جاتی تھی اس لئے خریداری کے لئے لڑکے بار بار

شہر جانے کی زحمت اور تضیع اوقات سے بچے رہتے! ادھر پچیس تیس سال سے تو دودپور میں اتنا بڑا کمرشل علاقہ معرضِ وجود میں آگیا ہے کہ بعض خصوصی اشیاء کے شائقین شہر سے دودہ پور خریداری کے لئے آیا کرتے ہیں۔ گزک اور کبابوں کی حد تک تو ہم بھی شہادت دے سکتے ہیں کہ ان کا معیار اور ذائقہ شہر سے افضل ہے اور یہاں کی گہما گہمی شہر کے بازاروں سے زیادہ اور خریداری بے طوالت و محفوظ ہے۔

ہمارے مُعاوِنین

علیگڑھ کی رہائشی زندگی کا اگر تجزیہ کیا جائے تو یہ روایتوں کے حسین پھولوں سے گُندھا ہُوا ایک ایسا خوش رنگ و مُعطّر گجرا ہے جس کی ہر لڑی اپنی جگہ نکھری ہوتی ہے۔ علیگڑھ کا پہلا سبق اپنے سے سینئر طلباء کا ادب احترام کرنا تھا جن سے ہمکلام ہونے کا لب ولہجہ، چلنے پھرنے، اُٹھنے بیٹھنے کے بھی آداب سیکھتے تھے۔ اس طرزِ معاشرت میں سینئر کے سامنے زور سے ہنسنا، فضول بحث کرنا، حتّٰی کہ ان کے کمروں کے سامنے سے بلاضرورت آنا جانا بے ادبی کے مترادف ہوتا۔ وہاں صرف اساتذہ اور سینئرز کا ادب ہی مقدّم نہیں تھا بلکہ اپنے کارندوں یعنی بیرے خانساماں، نائی، بہشتی، دھوبی بھنگی تک سے برتاؤ میں خوش خلقی برتی جاتی تھی گویا وہاں کے نصاب کا یہ بھی حصّہ تھا کہ اپنے ان مُعاوِنین کو خدمت گار نہیں بلکہ مددگار سمجھا جائے۔ ہوسٹلوں کے بیرے تو ایک سے ایک زیادہ تجربہ کار ہوتے تھے اور لڑکوں کا ہمہ وقت کا واسطہ اُنہی بیروں سے رہتا، جو ناشتہ تیّار کرتے کھانا لاکر کھلواتے۔ بستر بچھاتے، پلنگوں کو روزانہ کمرے سے نکال کر صحن میں ڈالتے، مچھّر دانیاں لگاتے، کپڑے سینے میں مدد کرتے کیونکہ بالعموم لڑکے پھوہڑ ہوتے اور انہیں سُوئی تک پکڑنا نہ آتی علاوہ ازیں سودا سلف لانا گویا ایک طرح سے بیرے صاحب ہر خدمت کے لئے آمادہ رہتے۔ اس لئے لڑکوں کو ہر موقع پر بیرے صاحب کی دستگیری کی حاجت رہتی اور اس میں

شک نہیں کہ علیگڑھ جیسے مُہذب و مؤدب بیرے بھی کہیں اور دیکھنے میں نہیں آئے۔ کیا مجال جو کام میں کوتاہی برتیں یا کسی کام کو 'نا' کہیں یا جواب دینے کی کوشش کریں۔ چوری چکاری سے تو دُور کا بھی واسطہ نہیں رکھتے تھے۔ بس صاحب لوگوں نے ہنس کر بات کر لی یا کچھ انعام دے دیا یا فائنل امتحان کے بعد گھروں کو جاتے وقت اپنی چارپائی اور میز کرسی وغیرہ دے دی، وہی ان کے لئے کافی ہوتا۔ البتہ بعض ایسے چھچھورے لڑکے غلط سلط حکم چلا کر جو بیروں کو اپنا ذاتی غلام سمجھنے کی کوشش کرتے تو ان کے ساتھ یہ لوگ ایسی مُہذّب چوٹ کر جاتے کہ بعد میں وہ صاحبزادے خود اپنے کئے پر پچھتاتے۔

علیگڑھ میں ہفتہ میں دو چار مرتبہ کھانے کے ساتھ خصوصی ڈش بشکل گُلگلے، شاہی ٹکڑے، زردہ، بریانی وغیرہ بھی ملتی تھی جس کو وہاں کی زبان میں 'ورائٹی' کہا جاتا اور بیرے صاحبان (بیرے ٹی) کہتے۔ اس معاملہ میں لڑکے اکثر ایک دوسرے پر چوٹ کر دیا کرتے تھے بعض بے چاروں تک تو پہنچنے سے پہلے ہی وہ غائب ہو جاتی تھی۔ ایک دفعہ ایک صاحب اپنے نئے پارٹنر کی ورائٹی ٹونگ گئے۔ اس غریب کو دو دن بعد پتہ چلا تو کہہ دیا آپ تھے نہیں اس لئے بیرا واپس لے گیا۔ اب بیرا غریب اس الزام کا جواب دینے سے رہا لیکن دوسرے دن اس نے ان کے حصّہ کی پلیٹ حضرت محروم کو پیش کر دی اور کہا یہ اس روز کی کمی مانیٹر صاحب نے پوری کی ہے ظاہر ہے ورائٹی خور صاحب اس پر خاصے جز بز ہوئے لیکن آخر اناڑی ٹھہرے مانیٹر کا نام سُن کر چُپ سادھ گئے۔ بہرحال آئندہ انھوں نے اس قسم کی ورائٹی خوری کی بھی تو بیرے کا نام نہیں لیا۔

ہوسٹل کی زندگی میں ڈاکیہ کو بھی خاصی اہمیت حاصل تھی کیونکہ وہی ماں باپ اور دوستوں سے رابطے کا مؤثر ذریعہ تھا جو نہ صرف چٹھی رساں تھا بلکہ ہر ماہ کا خرچ بھی تو

وہی پہنچایا کرتا تھا لہٰذا ڈاکیہ صاحب پر دُور سے نظر پڑتے ہی سارے ہوسٹل میں ایک شور مچ جاتا، خوشی کی لہر دوڑ جاتی وہ اپنی مہارت سے ہر لڑکے کا نام اور کمرہ پہچان لیا کرتا اور بہت زور سے مخاطب کر کے کہتا "صاحب آپ کے گھر سب خیریت ہے؟" اس سے مُراد ہوتی کہ آج آپ کا منی آرڈر ہے اور نہ کوئی خط، جب کسی کا منی آرڈر ملتا تو اس میں چوّنی ڈاکیہ صاحب کی بھی نذر ہوتی، لیکن اس مُبارک دن منی آرڈر یاب ہونے سے زیادہ صاحبزادے کے پارٹنر اور احباب خوش ہوتے کیونکہ رقم کی وصولیابی کی خوشی میں کم از کم ایک دو بار کیفے جا کر چائے پینا واجب ہو جاتا، لیکن اگر بعض بخیل ڈاکیہ کو چوّنی کے حق سے محروم رکھتے تو پھر ان کا منی آرڈر پہنچ تو جاتا لیکن کئی کئی روز انتظار کی بے چینی میں مُبتلا رہنے کے بعد۔

قطع نظر اِس سے کہ موسم اذیّت ناک ہو یا فرحت انگیز صبح سویرے سب سے پہلے ہوسٹل میں نازل ہونے والوں میں نائی ہُوا کرتے تھے جو یونیورسٹی کی طرف سے اِس بات پر مامور کیے جاتے تھے کہ کالج جانے سے پیشتر لڑکوں کا شیو وغیرہ بنا دیں تاکہ ہوسٹلوں سے قدم نکالنے سے قبل لڑکے نِک سُک سے دُرست ہو لیں لیکن ان نائی صاحب کی خدمات سے محض اَوباری قسم کے سینئر ہی استفادہ کرتے کیونکہ جونیئر نوجوان طلباء تو ڈاڑھی مونچھ سے بے نیاز ہوتے بقیہ بیشتر خود شیو کیا کرتے۔ البتہ ہوسٹلوں میں ایسے سین قابلِ دید ہوتے جب موسمِ سرما میں کوئی سینئر صاحب لیٹے لیٹے لحاف میں سے مُنہ نکال کر نائی کی اُستراکاری آزماتے۔ یہ وہ ایدی بالذّات لوگ ہوتے تھے جو مُفت کا شیو بھی روزانہ بنوانے میں تھکن محسوس کرتے۔ نائی صاحب کی محنت کا صلہ علاوہ قلیل تنخواہ وہ آمدنی تھی جو بال کاٹنے سے حاصل ہوتی لیکن بالعموم یہ حضرات گیسو تراشنے کے معاملے میں قطعاً فن ناآشنا ہوتے جس کی وجہ سے اچھا خاصا اِنسان بال کٹوا کر چند روز کے لئے کارٹون سا نظر آتا۔

علیگڑھ کے پس پردہ مُعاوِنین کے محاسن کا بیان ہو اور اس میں جنابِ دھوبی کا تذکرہ نہ کیا جائے تو یہ کچھ ایسا ہی لگتا ہے جیسے بغیر استری و کلف کا کپڑا پہن لیا ہو، کیونکہ علیگ برادری کو اُجلا پوش بنائے رکھنے میں ان کی کارگزاری کو بڑا دخل تھا۔

ذکرِ اُجلاگران

اِنسان میں فطری طور سے جتنا مَیل کچیل سے کھچاؤ ہوتا ہے دُھوبی سے اسی قدر لگاؤ ہوتا ہے۔ دُھوبی ہمارا ایسا معتمد محرم راز ہوتا ہے جو ہمارے دامن کے داغ بھی دھوتا ہے اور چاک گریبانی کا بھید بھی نہیں کھولتا۔ وہ ہمارے پہننے کے کپڑوں کی کمی کی کسی کو ہوا دیتا ہے نہ دامن کے تار تار ہونے کا پتہ۔ بلکہ اپنے تعاون کی رفوگری سے بہت سے تہی جیبوں کی سفید پوشی کا بھرم قائم رکھتا ہے۔ تہواروں اور شادی بیاہوں کے مواقع پر تو وہ اپنی ہنرمندی کا خصوصی مظاہرہ کرتا ہے اور حُسن کارکردگی سے من موہ لیتا ہے یہ وہ 'جامہ بر' ہے جس کا انتظار کسی فردِ واحد کو ہی نہیں ستاتا کیونکہ اس کے فراق کی زد سے تو سارا گھرانا بے چین و بیقرار رہتا ہے۔ صاف شفاف کلف دیئے کپڑوں کی گٹھری لئے جب وہ گھر میں تبسم ریز داخل ہوتا ہے تو دیکھنے والوں کی باچھیں کھِل جاتی ہیں۔ چٹّے چٹّے مکلّف کپڑے دیکھکر آنکھوں کو نور اور دل کو سرور حاصل ہوتا ہے لیکن گٹھری کُشائی مکمل ہوتے ہی گِلے شکوے کے دفتر کھُل جاتے ہیں کسی کو بالکل نئے کپڑے پر کھوتے لگانے کی شکایت ہوتی تو کسی کے پائجامے کا آدھا پائینچا بیل کا کھایا نکلتا۔ بٹن غائب ہونا تو معمولی بات ہے لیکن جب کپڑا اُمّت غائب ہوجائے یا نیا بدل کر ناقابلِ استعمال دیا جائے تو صورتِ حال ناقابلِ برداشت ہوجاتی ہے۔ میاں 'دھوبی' یہ فردِ جرم

محض سُنتے ہی نہیں بلکہ ساتھ ساتھ مُسکرا کر اپنا دفاع بھی کرتے جاتے ہیں' الغرض خاصی پھٹکار سُننے کے بعد آئندہ رااِحتیاط کے مَضبُوط وَعدے پر فریقین میں سمجھوتہ ہو جاتا ہے لیکن اگلے ہفتے گٹھری کھُلتے ہی شکایت کی پوٹلی بھی کھُل جاتی ہے جو گزشتہ سے زیادہ وزنی ہوتی ہے۔ دھوبی کی آمد پر یہ استقبالیہ مناظر نہ جانے کب سے دیکھتے اور سُنتے چلے آئے ہیں لیکن نہ دھوبی اپنی کسی عادت سے کنارہ کش ہوتے ہیں نہ گاہک دھوبی کا پیچھا چھوڑتے ہیں بلاشبہ افہام وتفہیم کا یہ ایسا مظاہرہ ہے جس کی نظیر نہیں پیش کی جاسکتی لیکن وقت پڑنے پر اُستاد دھوبی داؤں بھی مارا کرتا ہے اور داؤں بھی کیسا' حریف زیر' جس کی رَوانی سے مُتاثّر ہو کر بڑے بڑے شہ زور پہلوانوں نے اسے اَپنا کر دھوبی پاٹ کا نام دیا۔

ہمارے معاشرے میں دھوبی صاحب کا جنہیں عُرفِ عام میں 'بریٹھا' بھی کہا جاتا ہے بربنائے قربِ تعلّق ایک خاص مقام متعین ہے جس کو حالیہ دَور کے فرضی ڈرائی کلیننگ کے دعوے دار یعنی کارنشیں دھوبی بھی مُتاثّر نہ کر سکے۔ چُنانچہ خواتینِ خانہ دار اور دھوبیوں کے مابین خیر سگالی سے معمور قدیم تعلّقات کا سلسلہ بدستور چل رَہا ہے۔ گھر میں ہر مرتبہ جب دھوبی صاحب کا ورود ہوتا ہے جس کا انحصار ان کی اپنی مرضی پر ہے تو ان کے اور خواتین کے درمیان 'ڈائی لاگ' سُن کر تو یقین سا ہونے لگتا ہے کہ میاں بریٹھا یہ آخری 'دھوب' لائے تھے اور آئندہ ہفتے کوئی نیا دھوبی یہ ناگوار فریضہ خوشگوار طریقے سے ادا کرنے پر مامور کر دیا جائے گا۔ لیکن اگلے ہفتے تمام اُمیدوں پر پانی پھیرتے ہوئے دھوبی صاحب پھر ویسے ہی نمودار ہو جاتے ہیں گویا ڈانٹ پھٹکار کھائے بغیر ان کو بھی لُطفِ زندگی میسّر نہیں آتا۔ اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دھوبیوں اور خواتین کے درمیان بظاہر خانہ جنگی ایک ایسی نُورا کُشتی ہے جو روزِ اوّل سے جاری ہے اور تا قیامت رہے گی۔

دھوبیوں سے سب سے بڑی شکایت جو گاہکوں کو درپیش ہوتی ہے وہ ان کی ادلائے وعدہ فراموشی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ہمارے مُلک میں دھوبیوں اور درزیوں نے عدم ایفائے عہد کے سلسلے میں پُرانے زمانے کے معشوقوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ عصرِ حاضر کے محبوبوں کا جہاں تک تعلّق ہے تو معیشت اور معاشرے کی ترقّی کی بدولت ان میں تو اتنی مُستعدی آگئی ہے کہ اس بارے میں شاعروں کے گلے شکوے اَب محض ڈھونگ معلوم ہوتے ہیں کیونکہ یہ ہستیاں قبل از فراق ہی پیئے وصل آمادہ نظر آتی ہیں تاہم معشوقوں کے رُجحانات اور رَویّے میں اس قدر انقلابی تبدیلی آنے کے باوجود ہمارے درزیوں اور دھوبیوں کے دماغ اپنی اپنی جگہ قائم ہیں اور بالخصوص درزی صاحبان جب تک اپنی گلی کے سو سو پھیرے نہ کروا لیں اور جیب تہ تک خالی نہ ہو جائے تکمیل وعید نہیں ہوتی اور گاہک بے چارہ خوش پوشی کے ارمان میں مُبتلا رہ کر پُرانے دھرانے کپڑوں پر ہی گزارا کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔

اَب جہاں تک دھوبیوں کا تعلّق ہے تو محض کپڑوں کا میل کچیل دُور کرنا اور اُجلا کر دینا ہی ان کے فرائض میں شامل نہیں کیونکہ کپڑوں کو پہننا، تبدیل کرنا، پھاڑنا، کبھی کبھار نظریۂ ضرورت کے تحت گنوا دینا بھی وہ اپنا لوک ورثہ سمجھتے ہیں اور یہ ایسا حق ہے جس کے حصول و بحالی کے لئے ہر دھوبی ساری عُمر سرگرداں رہتا ہے اور ہر مرتبہ دُھلے کپڑوں کی لادھی لاتے پر اس کا پُورے زور شور سے دفاع بھی کرتا ہے۔

اس پس منظر میں اگر علیگڑھ کے دھوبیوں کے رَویّے اور کارکردگی پر نظر ڈالیں تو ایسا گمان ہوتا ہے کہ یا تو وہ دھوبی نہیں یا پھر لڑکوں کو 'گاہکچہ' سمجھتے ہوئے صرف نظر کرتے رہتے ہیں۔ پچاس سال پیشتر تو یہی برتاؤ تھا۔ اب خدا جانے ان کا

یہ حسنِ سلوک تا حال جاری ہے یا دھوبی کے اصلی رُوپ میں آ گئے ہیں۔

مہذّب و شائستہ ہونے کے علاوہ علیگڑھ کے دھوبیوں میں دو نمایاں خوبیاں پائی جاتی تھیں۔ پہلی اور بڑی خوبی یہ تھی کہ دھوبی ہوتے ہوئے ان کا وعدہ وعدۂ محبوب نہیں ہوتا تھا یعنی کسی نہ کسی طرح وقت پر گٹھری لئے نمودار ہو جاتے جس سے کبھی کبھی عزّت رہ جاتی، دوسرے یہ کہ وہ کپڑے چُرانے اور پھاڑنے کا حربہ بھی باید و شاید ہی استعمال کرتے تھے، اَب رہا کپڑے استعمال کرنے کا معاملہ تو اس کا امکان بھی نہ تھا۔ اِس لئے کہ ان کی گزُر اوقات صرف کپڑوں کی دُھلائی اور کسی قدر انعام وغیرہ پر ہوتی اس کے باوجود ان کی خُوش مزاجی اپنی جگہ قائم رہتی ہماری خوش قسمتی ہے کہ آج بھی ہمیں سفید پوش بنانے میں ایک علیگ بریٹھا صاحب بھائی مجید کا ہاتھ ہے جو موجودہ ۲۰۰ رُوپیے فی سیکڑہ کی اُجرت کو ایک آنہ فی کپڑا کی سابقہ اُجرت کے مقابلے میں حقیر و ناکافی گردانتے ہیں اور شاید اسی وَجہ سے ایفائے عہد کے بھی قائل نہیں ایک ہفتہ کا کہہ کر جاتے ہیں تو کبھی کبھی مہینہ گزار کر ہی پلٹتے ہیں پھر کپڑوں میں رَدّ و بدل کو ناگزیر قرار دیتے ہیں اگر شکوہ کرو تو کہتے ہیں صاحب زمانہ ہی بدل گیا تو ہم کیسے پیچھے رہ سکتے ہیں۔

—·›·(※)·‹·—

تقسیمِ خطابات

خطابات عطا کرنے کی روایت بھی علیگڑھ میں اتنی ہی قدیم ہے جتنی یہ درس گاہ۔ دَرصل نام رکھنا آسان نہیں جو ایک اَچھّے شعر کی طرح الہامی طور سے کبھی کبھی نازل ہوتا ہے اور مقبولِ عام ہو کر دوامی بن جاتا ہے لیکن نام رکھنے سے ہرگز 'نامدار' کی دلآزاری یا تحقیر مقصود نہیں ہوتی اور نہ ہی یہ نوازش کسی منتقمانہ جذبہ کی تسکین کیلئے کی جاتی ہے۔ اچھّے نام کی تعریف یہ ہے کہ اس کے سُنتے ہی سراپا ذہن میں آجائے اور ممدوح کی شخصیّت ظاہری و باطنی طور سے اس میں مکمّل سما جائے تاکہ نام لینے کے ساتھ اس کی چلتی پھرتی، ہنستی بولتی شبیہ سامنے آسکے جس کے بعد کسی مزید تعارف، استفسار کی ضرورت باقی نہ رہے۔ اَب رہے وہ بے شمار نام جو احمقانہ طور سے یا ذاتیات کی بِنا پر تھوپ دیئے جاتے ہیں تو وہ روزِ ازل سے ہی محروم پذیرائی ہو کر فراموش کر دیئے جاتے ہیں۔ علیگڑھ میں بالعموم نام ٹھوک بجا کر اور بے لوث بُنیادوں پر رکھے جاتے تھے جس کی وَجہ سے ایسے نام یافتہ حضرات جن کو رحلت فرمائے نصف صدی سے بھی زیادہ گزر چکی، لیکن یہ تمام نامور ان اپنے ناموں کے لاحقوں کی وَجہ سے نہ صرف زندہ ہیں بلکہ یہ محترم ہستیاں ہمارے دَرمیان اَب بھی چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔

ہماری معلومات کی رَسائی تک نام رکھنے کی روایت کی خود جناب سرسیّدؒ نے ابتدا فرمائی۔ علیگڑھ میں منشی نجم الدّین ایک مشہور شخصیّت گزرے ہیں جن کا قد

پستہ قد مگر جسم گٹھا ہوا تھا جو کھٹا کھٹ کرتے چھوٹے چھوٹے قدموں سے بڑے تیز تیز چلا کرتے تھے وہ بانیٔ درس گاہ کے ساتھ متعیّن تھے اور سرسیّد کے مراسلات اور نوٹس وغیرہ کی نقول کی تیاری کا کام انجام دیا کرتے، موصوف نہ صرف غضب کے زود نویس تھے بلکہ حد درجہ کے محنتی بھی واقع ہوئے تھے۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ گھوڑا نیک نام، فرض شناس اور وفادار جانور ہوتا ہے انہی گھوڑوں کی نسل کا ایک محنت کش فرد ٹٹّو ہوا کرتا تھا۔ نجم الدّین ان تمام خوبیوں کا مجموعہ تھے جس کے اعتراف کے طور سرسیّدؒ انہیں بہت پیار سے اپنا ٹٹّو کہا کرتے تھے ادھر نجم صاحب اپنے اس خطاب سے اِتنے مانوس تھے کہ اگر کوئی انہیں صرف خاندانی نام سے پکارتا تو اسے ناکافی سمجھ کر اس طرف متوجّہ نہ ہوتے، یہی وجہ ہے کہ نامورانِ علیگڑھ کی فہرست میں ٹٹّو صاحبؒ نے بھی مقام پالیا۔

متقدمین کے دَور میں دوسرا نام اس ہستی، علیگڑھ کے اس عظیم سپوت کا ہے جسے حسرتؔ موہانی کہا جاتا ہے، واقعہ کچھ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ مولینا جب داخلے کے لئے پہلی مرتبہ علیگڑھ میں وارد ہوئے اور ان کا 'یکّہ' ہوسٹل میں آکر رُکا تو اس وقت وہاں چند پُرانے طلبا جن میں سجّاد حیدر یلدرم بھی شامل تھے، موجود تھے۔ پہلے مولینا کا سامان اُترا اور وہ جب خود اُتر کر برآمدہ کی طرف چلے تو اس حُلیے میں کہ نہایت چوڑے پائنچے کا پاجامہ اور شیروانی پہنے تھے اور ہاتھ میں ایک سُرخ غلاف میں ملبوس پاندان تھا۔ یہ منظر دیکھتے ہی سجّاد حیدر یلدرم صاحب کی زبان سے فی البدیہہ "لو خالہ اماں آرہی ہیں" کا جملہ نکلا اور پھر یہ نام مولینا پر ایسا سجا کہ ان کے زعیم ساتھی ہمیشہ انہیں پیار سے اسی نام سے یاد کرتے رہے اور مولینا دل ہی دل میں خوش ہوتے رہے۔

دَورِ اوّل میں ہی علیگڑھ کے ایک نواب زادے صاحب جو بچپن میں سُرخ مخمل کا کوٹ اور مخملی کام کی ٹوپی اور مخملی جوتا پہن کر کلاس میں جایا کرتے اس لئے

دوستوں نے انہیں 'بیر بہوٹی' کے خطاب سے نواز دیا۔ اسی طرح نواب حافظ احمد سعید خاں نواب چھتاری بچپن میں کان میں بُندا اور گوٹے کے کپڑے پہنا کرتے تھے جس کا اس دور کے رئیس زادوں میں رواج تھا لہٰذا وہ اس وجہ سے گوٹے کی گڑیا کہلائے اور اپنے اس اعزاز پر تاحیات اپنی مسرّت کا اظہار فرمایا کرتے۔ اَلغرض ناموں سے نوازنے کا یہ سلسلہ ہر ہر زمانے میں چلتا رہا۔ نئے نئے لوگ آتے رہے نئے نئے خطابات سے نوازے جاتے رہے۔ اس میں طمانیت کا پہلو یہ ہے کہ ناموں کے ذریعے اپنے بھائیوں کو سرفراز کرنے کی روایت آج بھی اتنی ہی مقبول ہے جتنی سو سال پیشتر تھی۔

ہمیں پچاس کی دہائی میں ایک ایسے ہی نامدار بزرگ سے ملنے کا شرف حاصل ہُوا۔ ان حضرت کا اسم گرامی سمیع الحق تھا۔ خواجہ ناظم الدّین گورنر جنرل پاکستان کے علیگڑھ کے ساتھی بلکہ جلیسوں میں تھے نہایت شفیق اور ہنس مُکھ انسان تھے۔ خنداں تخلّص کرتے تھے۔ وہ صاحبِ دیوان بھی تھے اور صاحبِ دیوان خانہ بھی چُنانچہ ہر آٹھویں دسویں ان کے یہاں شعری نشستیں بڑی آب و تاب سے ہوتیں! ایک مرتبہ اولڈ بوائز کی تقریب میں سمیع الحق صاحب کو پکارا گیا تو اسٹیج پر تشریف تو لے آئے مگر اِدھر اُدھر تعجّب سے نظریں دوڑا کر دریافت فرمایا "کس کو پکارا گیا؟ میں آ تو گیا ہُوں مگر کون بدتہذیب تھا جسے ٹھیک سے بُلانا بھی نہیں آتا۔" یہ کہتے ہوئے مائک ہاتھ میں لیا اور کہا "بھائیو نہ جانے انھوں نے کسے بُلایا اَب میں آ گیا ہوں تو سُن لیجیے یہاں پر میرا نام 'پنڈا' ہے اور رہے گا یاد کر لیجیے آئندہ ایسی غلطی نہ کی جائے" اس اعلان کے بعد جب ان پر نگاہ ڈالی تو اس کبیر سنی کے باوجود ہر طرف سے خالص پنڈا ہی نظر آ رہے تھے۔

علیگڑھ میں کھلاڑیوں کے دوست مختار صاحب اسسٹنٹ پراکٹر تھے۔ کبھی کبھار جُغرافیہ بھی پڑھا لیا کرتے تھے لیکن انہیں اصل مزہ یونیورسٹی کی کوتوالی کرنے میں آتا۔ تیز و طرّار بننے والوں کا ہر جگہ پیچھا کرتے اور سختی سے محاسبہ کرتے خصوصاً لڑکیوں

کو چھیڑنے والوں کے ساتھ اچھی طرح نمٹنا جانتے تھے۔ وہ ہمہ وقت مکمل یونیورسٹی یونیفارم زیب تن کئے رہتے اِس لئے ہمیں یاد نہیں جو ہم نے کبھی ان کو بغیر یونیفارم دیکھا ہو۔ ان کی شیروانی کا ہر بٹن اور کالر بند رہتا۔ علیگڑھ کاٹ پاجامہ اور سر پہ پھُندنے دار ترکی ٹوپی، مختار صاحب ہاکی کے امپائر بھی تھے جس سے ناراض ہوتے اس کے فاؤل پکڑتے پکڑتے زچ کر دیتے۔ اس لئے اگر غلط سلط سیٹی بھی بجا دیتے جیسا کہ وہ بوقت ایمرجنسی کر گزرتے تھے تو کھلاڑی اعتراض کرنے سے گُریز کرتے تاکہ ان کا بقیہ کھیل نہ بگڑ جائے۔ باہر سے وہ اَلبتّہ اکھڑ اور سخت معلوم ہوتے تھے لیکن اندر سے اتنے ہی ہمدرد اور مزے دار واقع ہوئے تھے لُطف کی بات یہ کہ امپائری کرتے وقت بھی یونیورسٹی یونیفارم پہنے رہتے اور اِدھر اُدھر خوب دوڑتے بھاگتے۔ اس دَوران ان کی ٹوپی کے پھُندنے کا ہلنا بڑی بہار دکھاتا۔ جب وہ دوڑتے تو بھاری تن وتوش کی وَجہ سے گھوڑے کی ٹاپوں کی سی آواز سُنائی دیتی اور وہ خود بھی اسپِ تازی نظر آتے۔ اس تمہید کے بعد شاید آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ ان محترم کا "مختار گھوڑا" نام کیوں تھا۔ مختار صاحب کو اپنے اس خطاب کا کتنا پاس تھا اس کا اندازہ اس سے لگا لیجئے کہ سن ساٹھ کی دہائی میں ریٹائرمنٹ کے وقت یونیورسٹی اسٹاف کی جانب سے جب ان کو الوداعی پارٹی دی گئی تو انہوں نے اپنی تقریر کے اختتام پر فخریہ انداز سے کہا بھائیو "یونیورسٹی کا ایک ہی گھوڑا تھا وہ تو چلا اور اب گدھے رہ گئے"۔

علیگڑھ کے شریروں میں مسعود ٹامی کا نام آج بھی زبان زدِ خاص وعام ہے اور ان کی منفرد دلچسپ شرارتیں بڑی دلچسپی سے سُنی جاتی ہیں۔ ان سرخیلِ شریران کا خاندانی نام تو مسعود حسین کمبوہ تھا لیکن دیکھنے میں اتنے سُرخ سفید تھے کہ انگریزوں کا رنگ روپ ان کے سامنے ماند پڑ جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ انگریزی بھی

خالص گوروں کے اسٹائل سے مُنہ بنا کر بولا کرتے اور کبھی کبھی تو بے معنی جُملے اس روانی سے کہہ جاتے کہ سُننے والے کو اس شرارت کا اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا۔ اِن خواص کا اعتراف کرنے کے لئے یارانِ علیگڑھ نے انہیں ایسے برجستہ خطاب سے نوازا جو کبھی نہیں بُھلایا جا سکتا۔ مسعود ٹامی صاحب بیسویں صدی کے اوائل میں علیگڑھ تشریف لائے تھے کئی مرتبہ کوچہ بدر بھی کیے گئے لیکن مرکز سے تعلّق ختم نہیں ہُوا حتیٰ کہ ملازمت پانے کے بعد بھی مادرِ درس گاہ سے ناتا بحال رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ کل کا بچہ علیگ ہو یا آج کا نوبالغ، مسعود ٹامی کے نام سے ہر ایک ہی واقف ہے بلکہ زبان پر یہ نام آتے ہی ہونٹوں پر مُسکراہٹ کھیلنے لگتی ہے۔

۱۹۰۱ء میں بلرام پور کے مُعزّز سیّد خاندان کے تین بھائی علیگڑھ میں زیرِ تعلیم تھے جن میں ایک کا نام جعفر طیّار، دُوسرے کا حیدر کرّار تیسرے کا نام احمد مُختار تھا۔ ان کے ناموں کی رعایت سے علیگڑھ میں یہ بھائی "پاک پروردگار فیملی" کے نام سے پُکارے گئے جو مرتے دم تک ان کی شناخت اور علیگ ہونے کا ثبوت تھا۔

۱۹۴۰ء کے عشرے میں ہی وقار الملک ہال میں صُورت میں تقریباً ہم شکل دو بھائی رہا کرتے تھے یہ رہنے والے تو خورجے کے تھے لیکن وہاں کے شلغمی رنگ سے محروم تھے بلکہ خاصے سانولے سلونے تھے دونوں کی آنکھوں میں ایک مخصوص چمک بھی تھی وہ جب اکثر رات کے وقت کمرے سے اکٹھے برآمد ہوتے تو آنکھوں کی چمک معنی خیز ہو جاتی چنانچہ ان کو اُلّو برادران (OWL BROTHERS) جیسا حسبِ حال نام عطا کر دیا جو خوب چلا۔ اسی طرح سینئر بھائی وہاب خان صاحب جن کی ساری عمر ہی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن سے وابستگی اور خدمت گزاری میں گزری اپنے دَور میں دَھاکڑ قسم کے طالب علم تھے، ان کی جڑیں یونیورسٹی اسکول میں تھیں اور دس بارہ برس بعد ۱۹۳۷ء میں ٹھینچی پر پہنچ کر وہاں سے رُخصت ہُوئے، اس بڑائی کے

باوجود ان کے ساتھیوں نے ان کو 'وہاب معمولی' کا لقب عنایت کیا تھا جو آج بھی اتنا ہی مزہ دیتا ہے۔ وہاب بھائی کا وضاحتی بیان یہ ہے کہ ان دنوں علیگڑھ میں کئی اور وہاب بھی تھے مثلاً وہاب وائن، وہاب خیری وغیرہ اس لئے اُس غول بیابان میں مجھے معمولی درجہ عنایت کیا گیا مگر ان کے لنگوٹیا معاصرین کا قول ہے کہ محض یہ بات نہیں دراصل یہ ہے بھی معمولی۔ اب وہاب بھائی دل میں انہیں گالیاں سناتے ہوں تو علیحدہ بات ہے لیکن وہ ایسے حملوں کا دفاع زوردار ہنسی سے کرتے ہیں۔ گویا معترضین کی رائے پر سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں۔ ہم نے وہاب بھائی کی نجی ڈائری سے چند اہم نام حاصل کئے ہیں جو ناظرین کی نذر ہیں اگر پسند آئیں تو وہاب بھائی کا معمولی شکریہ ادا کر دیجئے۔

اس دور میں ایک صاحبزادے بمبئی سے وارد ہوئے تھے۔ کلاس ٹیچر صاحب باری باری سب لڑکوں سے متعارف ہونے کے لئے ان کے نام دریافت کر رہے تھے چنانچہ بھائی بمبیا سے نام پوچھا گیا تو انھوں نے 'محمد' بتایا۔ یہ سن کر کسی بے تاب نے نعرہ لگایا 'فقط محمد' اور یہ ایسا مقبول ہوا کہ وہ ہمیشہ کے لئے 'فقط محمد' بنا دیئے گئے۔

ایک اور بزرگ خواجہ صاحب تھے جن کے کمرہ کا محلِ وقوع ایسا تھا کہ آس پاس جھاڑ جھنکاڑ بلکہ نلواڑ لگی ہوئی تھی اس مناسبت اور پھر اپنی عادات و جسمانی ساخت کی وجہ سے وہ 'خواجہ فارسٹی' کہے گئے۔ ہمارے زمانے میں وہ یونیورسٹی جمنیزیم کے ڈائرکٹر تھے۔ ہر دلعزیز انسان تھے، جثہ اچھا تھا اسی موزونیت سے موٹر سائیکل منتخب کرتے جس پر ہمیشہ بہت اسٹائل سے سواری کرتے اور بھلے لگتے لیکن جب وہ قریب سے گزرتے تو بچے اور لڑکے ایک دوسرے سے کہتے دیکھو وہ خواجہ فارسٹی صاحب جا رہے ہیں جو کبھی کبھار وہ سن بھی لیتے تھے۔ اس سے خود بھی لطف اندوز

ہُوا کرتے۔ ہمارے ہی ہم عصر ایک نہایت شائستہ و سنجیدہ رُو، جو مولینا کی تیسری کو الٹی معلوم ہوتے تھے محامد اللہ انصاری صاحب ہُوا کرتے تھے۔ عثمانیہ ہوسٹل میں رہائش تھی۔ ان حضرت کو 'کسیرو' کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اَب کراچی میں تو بیشتر لوگوں نے اس پھل کا دیدار ہی نہیں کیا تو بیچارے نام کیا جانیں اور وہ اسکے مفہوم سے کیونکر حظ اُٹھا سکتے ہیں مگر اس میں شک نہیں جب بھی ہم نے مولینا کو پاکستان آنے کے بعد بھی دیکھا 'کسیرو' یاد آئے اور کسیرو پر نظر پڑ گئی تو معاً مولینا یاد آ گئے۔ افسوس کہ ابھی چند سال پیشتر ہی وہ جنّت کے پھلوں میں ایک نئی قسم کا اضافہ کرنے منتقل ہوگئے اور علیگ برادری بے کسیرو زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔

ہمارے دَوران قیام علیگڑھ میں دینیات کے ڈین مولینا وصی الدّین صاحب مُقرّر ہُوئے تھے جو نماز جمعہ کی امامت بھی فرماتے۔ اس نماز کے لئے وہ خاص چغہ پہنا کرتے، خود نہایت وسیع و عریض واقع ہُوئے تھے لیکن خُطبہ سُناتے وقت اپنے قد سے بھی زیادہ فربہ و دراز ایک نہایت چمکدار ڈنڈا ہاتھ میں تھامے رہتے۔ چُنانچہ ان کی وضع ڈنڈا گیری' بلکہ اس سے زیادہ ڈنڈے کے ڈیل ڈول کی مناسبت سے یہ حضرت 'مولوی ڈنڈا' بنا دیئے گئے اور ان کا یہ نام جلد ہی مقبول ہو کر ایسا زبانوں پر چڑھا کہ مولوی ڈنڈا کہہ دیجئے تو سب سمجھ جاتے ہیں درآنحالیکہ وصی الدّین کو کوئی نہیں پہچانتا۔ ان مولینا کے وصال کو تو ایک عرصہ ہو چکا لیکن علیگڑھ کی جامع مسجد میں ۱۹۹۰ء میں نماز جمعہ کی جن صاحب کی امامت میں ہم نے نماز ادا کی ان کے متعلّق یہ جان کر خاصا اطمینان ہُوا کہ وہ 'آلِ ڈنڈا' میں سے ہیں اور اپنے اس 'عصائی' تعلّق پر نازاں بھی ہیں۔

ہمارے دَور کے ناموں میں بھائی 'قا' اور کڑے خاں بہت معنی آفریں و ہر دلعزیز نام تھے جن کے احوال اپنی کتاب 'دیوانِ عام' میں شرح و بسط سے بیان

کئے جا چکے اِس لئے ان پر مزید روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے ہاکی ٹیم کے پُرانے ساتھی اور اولڈ بوائز ایسوسی ایشن میں ہمارے دیرینہ مُعاون، محمد اظہر خان ہاکی ٹیم کے ساتھ دہلی کے ہوٹل میں مقیم تھے۔ ان دنوں سب لڑکے اپنا بستر بچھونا ساتھ لے کر جاتے اور فرش پر بچھا کر عیش کرتے یعنی ڈبل اسپرنگ بیڈ یا فوم وغیرہ کے نخرے نہ تھے۔ جاڑوں کی سرد رات تھی، تیز ہوا چل رہی تھی وقفے وقفے سے بوندیں بھی پڑ رہی تھیں کہ یکایک کمرے میں دھم سے کسی بھاری چیز کے گرنے کی آواز ہوئی جس سے ہم سب چونک پڑے لحافوں سے نکل کر دیکھا تو ایک عدد بکرا سیڑھیوں پر سر کے بل لڑھکتا نیچے کی سمت رواں ہے اور ادھر بھائی اظہر خان ایک کشتی مارنے والے پہلوان کی طرح اپنی پنڈلی کی کمر ٹھونک رہے ہیں معلوم ہوا کہ جاڑے کی شدت اور بارش کی یورش سے پناہ لینے کے لئے نہ جانے کدھر سے یہ بکرا ہوٹل میں داخل ہو گیا اور بغیر کسی سے علیک سلیک کئے اظہر خان کے بستر پر چیک اِن (CHECK IN) کر گیا۔ اظہر خان کی جو آنکھ کھُلی تو اُنہوں نے بلا تامّل اپنے قانونی اسلحہ پنڈلی سے ایسا کِک جمایا کہ یہ بھاری بھرکم بکرا فٹ بال بن گیا اس کے بعد جب زیرِ استعمال اسلحہ کا بغور مُعائنہ کیا گیا تو اظہر خان کی پنڈلی تو قابلِ لائسنس ہتھیار سے کم نہ تھی۔ دورانِ کھیل جب وہ اس 'فخرِ ساقاں' پر اونی موزہ پہننے کی کوشش فرماتے تو بڑے سائز کا موزہ بیچارہ مُنھ پھاڑ کر حیران رہ جاتا اور ہار مان لیتا۔ اس لئے نہیں کہ اظہر ہمارے بڑے پکّے دوست ہیں لیکن یہ امرِ واقعہ ہے کہ ایسی گرانڈیل اور مؤثر پنڈلی ہماری نظر سے نہیں گزری اور اس کا پُورا پُورا فائدہ جس طرح اظہر خان نے اُٹھایا وہ بھی انہیں کا حصّہ ہے یہ جان لینے کے بعد اب آپ بھی قائل اور واقف ہو گئے ہوں گے کہ 'اظہر خان پنڈلی' کون ہیں اور کیوں ہیں!

علیگڑھ میں مُعید خان صاحب بھی ایک حلقے کی شے گزرے ہیں تقریباً

چالیس کی دہائی سے ساٹھ کی دہائی تک ان کا دَور دَورہ رَہا اور اس زمانے کا شاید ہی کوئی لڑکا ہو جو ان سے واقف نہ ہو۔ اب یہ اس کا مُقدّر کہ ان کے اثرات سے محفوظ رَہا ہو۔ مُعید خان نے عجیب نام پایا تھا یعنی "مُعید خان لاحول ولا قوّۃ"، اَب اس کی وَجہ تسمیہ بھی سمجھ لیجئے۔ مُعید خان بڑے با اِخلاق چُقندری رنگ رُوپ کے اِنسان تھے۔ گھر کے کھاتے پیتے تھے۔ بی اے علیگ ہونے کے بعد بھی جب علیگڑھ سے جُدائی گوارا نہ ہوئی تو بَرائے نام ڈیوٹی سوسائٹی میں کسی کام سے مُنسلک ہو گئے۔ لیکن دَر اصل وہ سارا دن اپنی سائیکل پر ساری یونیورسٹی میں چکّر کاٹا کرتے جس کا مقصد نہ تو جب کسی کے سمجھ آیا تھا نہ اَب تک آسکا۔ ان کا لباس بھی دیدہ زیب تھا اکثر کالی شیروانی اور ترکی ٹوپی پہنے ہوتے۔ گویا یونیفارم میں رَہا کرتے۔ ان کی دلآویز بے ضرر سی مُسکراہٹ اور وضع قطع دیکھ کر ہر ایک ان سے جلد مانوس ہو جاتا اور لڑکے انہیں اَپنا ہمدرد اور بُزرگ سمجھنے لگتے۔ لیکن رفتہ رفتہ ان کی شخصیّت حالات و واقعات پر اثر انداز ہونے لگی اور بالعموم یہ محسوس کیا جانے لگا کہ جس کسی کی جس دن مُعید خان سے مُلاقات ہو گئی اس دِن اس کے سارے پروگرام ٹھپ ہو گئے۔ اگر بھُوک میں کھانا کھانے جا رہے ہیں تو کھانا ہاتھ نہ آئے گا۔ اگر کسی سے ملنے جا رہے ہیں تو اس کا کمرہ بند ملے گا۔ شہر جانے کی نیت ہو گی تو کچھ نہیں تو سائیکل میں پنکچر ہو جائے گا۔ میچ کھیلنے جا رہے ہیں تو ہارنا مُقدّر ہو گیا۔ اسٹیشن جا رہے ہیں تو ریل چھوٹنا لازمی ہے حتیٰ کہ پرچہ کرنے جا رہے ہیں تو پاس ہونے کے لالے پڑنا ضروری ہیں۔ الغرض مُعید خان بیچارے کو اپنے ان غیبی کمالات کا علم ہو نہ ہو لیکن یونیورسٹی میں ہر لڑکا ان پر نظر پڑتے ہی سچ مچ ایسا خائف ہو جاتا جیسے کوئی بدرُوح دیکھ لی ہو۔ چنانچہ بنظر احتیاط معید خان کی سبز قدمی کے جن سے محفوظ و مامون رہنے کے لئے ان کے نام کے ساتھ 'لاحول ولا' کا لاحقہ لگا دیا گیا۔ اَب مُصیبت جو کچھ بھی ہو

لیکن لوگوں کا خیال تھا کہ یہ کہنے سے نحوست کے اثرات زائل ہو جاتے تھے۔ اس ضمن میں ایک بڑا انوکھا واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ اس زمانے میں اسٹریچی ہال اور اس کے قرب وجوار آسمان منزل وغیرہ میں سالِ آخر کے امتحانات شروع ہونے والے تھے ایک دن علی الصبح لڑکے جونہی بابِ اسحاق کی طرف سے سرسیّد ہال میں داخل ہونے لگے تو ان کی نظر وہاں آویزاں ایک بڑے سے بینر پر پڑی جس پر خاصے جلی حروف میں BEST OF LUCK (FROM: MOEED KHAN) لکھا تھا۔ بس پھر کیا تھا امتحان میں شریک ہونے سے قبل جیسے تیسے اس منحوس بینر کو وہاں سے اُتارا گیا یہی نہیں سُنا ہے چند متاثرین نے وائس چانسلر صاحب کو باقاعدہ درخواست پیش کر دی کہ "دورانِ امتحان مُعید خان کو بند رکھا جائے"۔ رمضان شریف میں شیطان کا بند ہونا تو سُنا کرتے تھے امتحان شریف میں مُعید خان کا بند ہونا پہلی مرتبہ سُن کر طبیعت خوش ہو گئی۔ لیکن اب تو ہمارے نہ مُعید خان رہے نہ ان کے اثرات مگر مُعید خاں لاحولَ ولاقوۃ پڑھنے سے لوگ باز نہیں آتے۔ مجبوری یہ ہے کہ صرف مُعید خاں کہو تو کوئی کچھ سمجھ نہیں پاتا۔

۱۹۶۵ء سے ۱۹۹۰ء تک جب کئی مرتبہ اپنے ارمانوں کی بستی میں ہمارا جانا ہوا تو وہاں اقبال 'برُولا' کا نام نامی نت نئے انداز اور مختلف ذرائع سے گوش گزار ہُوا۔ ایک سُہانی شام کباب پراٹھے کی خوشبو میں مہکے ہُوئے ہم علیگڑھ کی نمائش میں چہل قدمی کر رہے تھے کہ یکایک ایک، دو، تین اور اس کے بعد برُولا کا نعرہ بُلند ہُوا۔ اس قسم کے نعرے مثلاً بلنڈر، بور اور قا، وغیرہ ہم نے خود لگائے بھی ہیں اور لگوائے بھی ہیں اس لئے ہم چونکے ضرور البتہ اس سُنّت کو جاری دیکھ کر خاصا اطمینان ہُوا اور ہم نے اس شبہ نام کی وجہ تسمیہ جاننے اور نامدار سے نیاز حاصل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو ہمارے میزبانوں نے بڑے خلوص سے برُولا صاحب کا بائیو ڈیٹا، جو انہیں

آزبر تھا سُنا دیا، لیکن افسوس کہ ہمیں ان کی زیارت نصیب نہ ہوسکی، اگر قسمت نے یاوری کی تو کبھی آئندہ تکمیلِ آرزو کی کوشش کی جائے گی تاکہ بروالا دیدگان میں ہمارا بھی شمار ہوسکے۔

میاں اقبال طول قامت، ۶۰ء کے عشرے کی یافت ہیں جو کھیل کے معیار نہیں بلکہ اپنے جثہ کی وجہ سے 'ایتھلیٹکس' کے یونیورسٹی کپتان بھی بنائے گئے۔ ایک مرتبہ اسپورٹس کی ٹیم اقبال صاحب کی سربراہی میں لکھنؤ پہنچی دوپہر کے وقت کپتان صاحب بڑی فراخدلی کا ثبوت دیتے ہوئے لڑکوں کو ایک ہوٹل میں لے گئے اور وہاں بُرولوں (مونگ کی دال سے تیار کردہ ایک قسم کے بڑے) کا آرڈر دے دیا، لڑکوں نے اسے لنچ سے قبل کی تواضع سمجھتے ہوئے بھوک افزائی کا کام لیا لیکن بعد میں جب پتہ چلا کہ یہ تو دراصل لنچ کا 'سورالبدل' تھا تو لڑکوں نے اپنے اپنے پیٹ پیٹ لئے۔ اس وقت تو اقبال صاحب نے بُرولوں کی بدولت سو پچاس رُوپے ضرور بچس انداز کر لئے ہونگے لیکن انہیں شاید یہ اندازہ نہ تھا کہ وہ اس بُرولا لنچ کی بدولت ہمیشہ کے لئے اقبال بُرولا بنا دیئے جائیں گے۔ ناظرین کو شاید یہ گمان ہو کہ یہ سودا اقبال صاحب کو گراں پڑا تو ہماری عرض اس بارے میں یہ ہے کہ اقبال صاحب کو ہزاروں روپے خرچ کر کے بڑھیا سے بڑھیا کھانے کھلوانے پر بھی وہ دوامی شہرت میسّر نہ آتی جو چند ٹکوں کے بُرولوں سے مل گئی۔ شاید وہ گھڑی قبولیت کی تھی جو لڑکوں کے معدوں کی تہ سے نکلی ہوئی دُعاؤں نے بُرولا کو لازوال مقبولیت عطا کی۔ اب یوں تو اس مادرِ علمی میں نہ جانے کتنے ہزار اقبال رہ چکے ہوں گے اور آئندہ بھی آئیں گے لیکن 'اقبال بُرولا' کے منصب پر کون فائز ہوسکتا ہے؟ اس کے بعد پھر مختلف موقعوں پر لطائف بُرول بھی سُننے میں آئے جس سے معلوم ہوتا ہے علیگڑھ میں بُرولا صاحب کی اتنی ہی قدر و منزلت ہے جتنی پنجاب میں سکھ بھائیوں کی۔ خداوندِ کریم قد کی طرح ان کی عُمر بھی دراز کرے اور اقبال بھی بلند رکھے تاکہ ان کو بھائی لوگ دیکھ کر ہی آنکھیں ٹھنڈی کیا کریں

اقبال بُرولا صاحب سے بغیر تعارف حاصل کئے ہم نے اسبابِ شہرتِ بُرولا رقم کر دیئے ہیں تاہم اس بارے میں ہمیں اپنی بے بضاعتی کا پُورا پُورا احساس اس لئے ہے کہ بہرحال شُنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ اُمید کہ عزیزم بُرولا اور ناظرین اس کوتاہی کو محلِ نظر نہیں بنائیں گے۔ اَب رہا "حورانِ بہشتی" میں نام رکھنے کی روایت تو علیگڑھ کے ریشمی پَردے کی خبریں بمشکل ہی باہر پہنچتیں اور جو پہنچتیں وہ بھی ادھوری اسلئے گرلز کالج میں عطا کردہ خطابات سے ہمیں آگاہی نہیں تاہم ہمارے دَور میں ایم اے جُغرافیہ کی شوخ و شنگ مردانہ خوبیوں کی حامل ایک خاتون کو 'جانڈی خاں' کا لقب دیا گیا تھا اَب چُونکہ یہ عطیہ اپنے دل کی گہرائیوں سے منن خاں مرحوم کا عطیہ تھا، اس لئے اس دَور میں خُوب مشہور ہو گیا تھا اَب معلوم نہیں محترمہ ابھی تک ہماری طرح مقیدِ حیات ہیں یا مُنن خاں کا ساتھ دینے بعید ترین منزل میں آسودۂ راحت ہیں۔

علیگڑھ کی خواتین میں سب سے مشہور و مقبول نام 'انور توپ' ہے جو پچھلی نصف صَدی سے زیادہ عرصہ سے علیگڑھ میں اسی طرح ڈٹی ہُوئی ہیں جیسے لاہور میں نیشنل میوزیم کے سامنے دَمدمہ نامی توپ نصب ہے خُدا گرلز کالج کی اس شاندار رُعب دار نشانی کو سلامت رکھے۔ انور آپا اپنے بھاری بھرکم سراپے کے ساتھ خوش شکل بھی ہیں اور خوش مزاج بھی اور ہمارے خیال میں ان کو توپ بنانے اور ان کی مقبولیت میں ان تمام شخصی اور جسمانی خوبیوں کو دخل ہے۔

اساتذہ کا کمال ادب احترام ہوتے ہُوئے ان میں سے بھی با صلاحیت کو خطابات سے نوازا جاتا تھا کچھ نام تو ایسے تھے جو دَورِ طالب علمی سے ہی ان پر چسپاں تھے لیکن نئے خطاب دینے میں بھی تامّل یا تکلّف سے کام نہیں لیا جاتا تھا اور جب ایک مرتبہ نام عطا کر دیا گیا تو اپنی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہُوئے خطاب یافتہ اُسے قبول کر لیتا تھا مثلاً قاری محمود حسین جو انگریزی کے بڑے ہر دلعزیز پروفیسر تھے

اَب پڑھنے والوں کو ضرور حیرانی ہوگی کہ یہ انگریزی کا قاری کیسا؟ تو حضرات قاری صاحب جس لہجے سے انگریزی کا لیکچر دیتے تھے تو محسوس یہ ہوتا تھا کہ قرأت فرما رہے ہیں۔ چنانچہ تادم آخر نہ علیگڑھ ان سے چھوٹا اور نہ یہ نام بلکہ کیا عجب جو روز محشر بھی اسی مقبول نام سے پکارے جائیں۔ اسی طرح ہمارے ایک کیمسٹری کے محترم اُستاد تھے جو بشیر بطخ کہے جاتے تھے۔ بوٹا سا قد، کچھ چکلے بھی تھے، بالعموم شیروانی پہنتے تھے لیکن چلتے وقت اپنے نام کی صحیح تعبیر معلوم ہوتے تھے بلکہ کلاس میں جب وہ بولا کرتے تو شُبہ ہوتا جیسے بطخیں محوِ گفتار ہیں۔ ایک اور بزرگ شعبۂ جغرافیہ میں لیکچرر تھے جو بیک وقت خوبصورت و سیرت واقع ہوئے تھے لیکن کلاس لینے کے معاملے میں بالکل گول تھے لہٰذا ان سے عقیدت و اُنس کے باوجود ان کو 'قادری دی بوگس' کا لقب دے دیا گیا۔ ایسے نامدار اُستادوں میں جمیل کوّے، جمیل بُلبُل، وغیرہ مقبول تھے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ بعض اصحاب کی وجہ شہرت و مقبولیت ہی ان کا خطاب تھی تو مُناسب ہوگا۔ ورنہ یونیورسٹی میں تو سینکڑوں اساتذہ ایسے گزر گئے ہیں کہ عام طور سے لڑکے ان کی زندگی میں ہی ان سے ناواقف رہے اور مرنے کے بعد تو انہیں یاد کرنے کا سوال ہی نہیں، اس کے برعکس خطاب یافتہ اُستادوں اور لڑکوں کے نام قرونِ اوّل سے آج تک ذہنوں میں محفوظ اور زبان زدِ خاص و عام ہیں۔

اَب مزید چند دلچسپ نام پڑھیے پسند آجائیں تو مرحومین کے لئے ایصالِ ثواب کر دیجئے اور باقی کے لئے ہم سے رُجوع فرمائیے تاکہ نامدار کی مُنہ دکھائی کروائی جاسکے۔ کالا دیو۔ ساجد کوفتہ۔ سعید انڈا۔ اُستاد چھورا۔ غشو ڈھیلا۔ عزیز خاں وائلڈ بور۔ واؤ خان۔ میر ٹینڈی۔ گردھاری لال۔ نیوا قانونی۔ فاروق مہوکا۔ عزیز نوزبری۔ سعید بخ بخ۔ (یہ بخ بخ صاحب کرکٹ کپتان ہُوا کرتے تھے اور آئی جی پولیس کے عہدے سے ریٹائر ہوئے) اللہ میاں کا فاؤن ٹن پن۔ بدیع الدین ہنومان (یہ بزرگ سری لنکا میں

دس بارہ سال وزیر رہے ہم نے وہاں ان سے ملنے کی سعادت بھی حاصل کی) مرزا حسین علی بابا بائے حرم۔ ناصر لوفر نفیس اَدّھا (واقعی مرحوم ایک رتّی نہ کم نہ زیادہ نپے تُلے اَدّھے تھے) رفیق آل انڈیا مصباح ٹری فری۔ سلطان بانو۔

—·>·(※)·<·—

علیگڑھ کی آفیشل سواری

علیگڑھ سے روانگی اور وہاں آمد کے بھی کچھ اپنے ہی طور طریق تھے۔ چنانچہ جب بھی کوئی اپنے گھر سے واپس یونیورسٹی آتا تو وہ لازماً چھ سات دوستوں کی تواضع کے لئے ناشتہ دان بھر کر انواع و اقسام کے کھانے لاتا حلوے اور مٹھائیاں اس کے علاوہ، چنانچہ اپنے اس بھائی کی خوب خوب پذیرائی ہوتی اور جوں ہی یکہ کمرے کے سامنے رُکتا بھائی لوگ اس میزبان سے زیادہ گرمجوشی سے اس کے ٹفن کیریئر کا استقبال کرتے اور ہاتھ میں آتے ہی کھا پی کر خوب دھوم دھام سے دوست کی واپسی منائی جاتی۔ وہاں تنہا خوری فعل مکروہ بلکہ بڑا عیب سمجھی جاتی تھی اور اگر کوئی ناواقف یہ حماقت سرزد کر بیٹھتا تو پھر اسے اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا تھا یعنی اس کے حلوے اور مٹھائی سے اس کو قطعی محروم کر دیا جاتا اور سب کو مال اُڑاتے ہوئے خود وہ تکتا رہ جاتا۔ یہ آداب خورد و نوش کسی وائس چانسلر یا پرووسٹ کی طرف سے کبھی نافذ نہیں کئے گئے تھے لیکن ان کا احترام احکامات سرکاری سے زیادہ ہوتا، اسی وجہ سے کھانے پینے کے معاملے میں کوئی شکایت وارڈن صاحب بھی سننے کو تیار نہیں ہوتے بلکہ صاحبزادہ کی تشفی کے بعد سمجھا دیا جاتا کہ آئندہ یار دوستوں کے ساتھ مل بانٹ کر کھایا کریں۔ یہی وہ تربیت تھی کہ کھانے کے میدان میں علیگڑھ والا تکلف ناآشنا ہوتا ہے اور اپنے کسی میزبان کو درخواست مکرر کرنے

کا کبھی موقع نہیں دیتا۔ چُنانچہ عمروں کے پچاسوں سال گزرنے کے باوجود ابھی تک یہ عالم ہے کہ پُرتکلّف اغیار کی تقریبات میں تو البتّہ کسی قدر رعایت برتی جاتی ہے لیکن جب کبھی علیگڑھ ایسوسی ایشن کے احاطہ میں یا اس کے زیرِ انتظام دعوت کا اہتمام کیا جاتا ہے تو اس میں بلا حفظِ مراتب و عمر ہر ایک زیادہ سے زیادہ انفرادی اسکور بنانے کا خواہش مند رہتا ہے۔ یہی نہیں حصُولِ راشن کے لئے داؤں پیچ بھی کرتا ہے۔ ان مواقع پر اگر کوئی ذرا اپنی پلیٹ سے غافل ہو جائے تو کوئی نہ کوئی نہایت خاموشی سے ہاتھ کی صَفائی دکھا دیتا ہے اور جب تک وہ مُڑ کر دیکھتا ہے پلیٹ سے مُرغ پرواز کر چُکا ہوتا ہے۔ اس قسم کی حرکتیں جو معمولات دسترخوان کا حصّہ رہی ہیں اس لئے ان سے نہ صرف کباب اُچکنے والا محظوظ ہوتا ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ لُطف دیکھنے والے اور محروم کباب خود لیتے ہیں۔

آج کل ہمارے یہاں پاکستان میں جس قدر دعوتوں کی تعداد اور کھانوں کی اقسام میں اضافہ ہو رہا ہے مہمانوں میں اسی قدر پریشانی اور بے چینی بڑھتی جا رہی ہے چُنانچہ میزوں پر کھانے چُننے کے بعد جوں ہی بجا بجا کر قابوں سے سرپوش ہٹائے جاتے ہیں تو اشارہ پاتے ہی خاصے ثقہ صُورت حضرات بھی میزوں پر اس طرح ٹوٹ پڑتے ہیں جیسے امریکن رگبی شروع ہو گئی ہو۔ ہر شخص بغیر کسی کا لحاظ کئے اپنی پلیٹ میں اتنا کچھ بھر لیتا ہے کہ دو تین آدمی بھی مل کر ختم نہیں کر سکتے اس لئے آدھے سے زیادہ رزق برباد ہوتا ہے، ادھر کیونکہ اتنی عجلت سے ڈشیں دوبارہ پُر نہیں کی جا سکتیں اس لئے حلیم و بُردبار ضعیف قسم کے مہمان سلاد اور دہی پر ہی اکتفا کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اس طرح دسترخوان پر تمام نعمتیں ہوتے ہوئے کچھ مہمانان محترم کر دیئے جاتے ہیں۔ ایسی دعوتوں میں ہم نے علیگڑھ والوں کو شرمساری سے بچنے کے لئے ایک خاص رویّہ اپناتے دیکھا وہ کھانا ضائع کرنے کے تو قائل نہیں لیکن محرومی

کی ندامت کے لئے کبھی آمادہ نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ علیگڑھ کی خصوصی تربیت کی وجہ سے کوئی علیگ بھوکا نہیں رہتا۔ چنانچہ یہ حضرات اکثر ایسی جگہوں پر اڈّہ بناتے ہیں جدھر سے کھانے کی رسد بہم پہنچائی جاتی ہے اور ان کی ابتدائی جدّوجہد تو یہی ہوتی ہے کہ پہلی کوشش میں حقِ مہمانی پوری طرح ادا کردیں، لیکن اگر ایسا ممکن نہ ہوسکے تو پھر سپلائی لائن سے استفادہ کرسکیں۔ اگر آپ کو ایسا اتّفاق ہو تو ہمارا مشورہ ہے کہ ایسے تربیت یافتہ ماہرینِ خورد و نوش کے آس پاس ہی جگہ حاصل کرلیں تاکہ واپس ہوکر گھر کھانا تلاش کرنا نہ پڑے۔

اولڈ بوائز کی علیگڑھ میں بالخوراک آمد کی روایت تو بیان ہوچکی اب مراجعت کا حال بھی سُن لیجئے۔ لڑکے جب جاڑوں کی یا کسی اور چھٹّی کے موقع پر گھروں کو واپس ہوتے ہیں تو انہیں یار دوست بشکل جلوس اسٹیشن لے جاتے ہیں، چھٹّی جانے والے حضرات پر نہ صرف احباب کی آمد و رفت کا کرایہ واجب ہوتا ہے بلکہ ساتھیوں کی چائے وائے سے معقول تواضع بھی ان کے خوشگوار فرائض میں شامل ہے۔ ایسے موقع پر بالعموم چائے سے زیادہ وائے پر یار لوگوں کا زور ہوتا ہے۔ اس طرح رُخصت ہونے والے کو گاڑی کا انتظار نہیں کھلتا اور 'بور' ہونے کے بجائے سارا وقت ہنستے بولتے گزر جاتا ہے۔ یہاں یہ وضاحت کرتے چلیں کہ مراجعت کا یہ پروگرام بلا قید موسم و وقت رائج رہتا، یعنی کڑاکے کے جاڑوں اور بارش میں بھی خدا حافظ کہنے والے رضاکاروں کا جتھا اسٹیشن جانے کو تیار ملتا۔ سنہ ۱۹۹۰ء میں ہم جب یونیورسٹی روڈ سے گزر رہے تھے تو ہم نے دیکھا کہ ایک صاحبزادہ اٹیچی کیس لئے رکشا میں بیٹھے ہیں ان کے اِرد گرد سائیکل سوار دوستوں کا چاق و چوبند دستہ ہے اور اس قافلے کا رُخ اسٹیشن کی جانب ہے۔ یہ منظر دیکھ کر ہمیں بہت اطمینان ہوا کہ دیرینہ رسمِ رفاقت اب بھی ویسے ہی جاری ہے اور ہمراہیوں نے اپنی چائے کا انتظام کر رکھا ہے۔

ذکر ہو علیگڑھ کا لیکن اس میں یکہ کا نام نہ آئے تو ہر ایسا تذکرہ بے سواری کے تانگہ کی طرح معلوم ہوگا۔ یوں بھی علیگڑھ میں سواریوں کا حسن اور ان کی روایات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا جس طرح اولمپکس اور ورلڈ کپ کے مقابلوں کا آفیشل مشروب۔ آفیشل لباس۔ آفیشل گھڑی و کیمرے وغیرہ ہوتے ہیں اسی طرح یکہ کو علیگڑھ کی آفیشل سواری قرار دینا یکے کی خدمات کا اعتراف اور یکہ نشینوں کی دلجوئی کا باعث ہوگا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ علیگڑھ کی سواریوں میں یکہ کو وہی مرتبہ حاصل تھا جو تاش کے یکہ کو ہوتا ہے۔ اب بڑا ہوا مندا دزمانہ کا جس کی رُو سے یکہ جیسی عوامی سواری بھی نہ بچ سکی کیونکہ جب سے انسان نے انسانوں سے حیوان کا کام لینا شروع کیا ہے اور بھوک اور افلاس نے آدمیوں کو جانوروں کے کام اپنانے پر مجبور کیا ہے صفحۂ یونیورسٹی سے یکہ کا نام بالکل مٹ چکا ہے۔ اب سواریوں کے اس محبوب کو یونیورسٹی میں تلاش کرو، شہر کی خاک چھانو، اسٹیشن پر آواز دو یا نمائش میں پکارو، یکہ کے نام لیوا کو کسی طرف سے اثبات میں جواب نہیں ملے گا۔ پچھلے سالوں میں استحصال سے چند بچے کھچے یکہ والوں سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ یکے کی دن بھر کی کمائی سے تو ٹٹو کا پیٹ بھی نہیں بھر سکتا تھا، اس لئے یکہ والوں اور ان کے اہل خاندان کو ہر روز فاقہ کشی کا سامنا تھا اور یہی وجہ ہے کہ اب علیگڑھ میں یکہ تو یکہ کہیں تانگہ بھی دیکھنے کو نہیں ملتا۔ ظاہر ہے برصغیر سے جب شاہی اٹھ گئی تو شاہی سواری کیسے رہ سکتی تھی۔ چنانچہ اب یکہ اور تانگے کی متبادل رکشائیں، یکوں سے دُگنی سواریاں لئے ہر طرف دوڑتی، بھاگتی، رینگتی اور کراہتی نظر آتی ہیں جن میں بیٹھو تو پاپ اور نہ بیٹھو تو اس سے بڑا پاپ معلوم ہوتا ہے۔

اپنے عہدِ عروج میں یکہ کو علیگڑھ میں سب سواریوں سے زیادہ مقبولیت حاصل تھی اور اس کی پوزیشن ہمعصر گاڑیوں میں ایسی ہی تھی جیسے آج کے دور میں

بسوں کی۔ یہ بظاہر ناتواں سواری پہلے دن سے ہی طالب علموں کی رفیق بن کر تادم رُخصت گویا سالہا سال تک حق رفاقت نبھاتی۔ ہم جب پہلی بار علیگڑھ اسٹیشن پر اُترتے ہی یکّہ نشین ہوئے تو اسپ لاغر کے ہر ہر قدم پر اپنی خیر مناتے رہے اور ڈھلک ڈھلک کر کبھی اپنے ساتھی پر گرتے تو کبھی اپنے ہولڈال کا سہارا لیتے غرض تمام راستے لاحول پڑھتے رہے خدا خدا کر کے جب آدھے پون گھنٹے بعد میل ڈیڑھ میل کی مسافت طے کر کے ہوسٹل پہنچے تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور یکّہ سے سامان اُتارتے وقت ہم اس کی عالی ظرفی سے مُتاثّر ہوئے بغیر نہ رہ سکے کیونکہ اس نے چار سواریوں کا مع سامان اپنے اندر ٹھکانہ بنا لیا تھا۔ یہ بات وہ ہے جو کہنے سے مشکل سے سمجھ میں آئے گی کیونکہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے اور سچ پوچھئے تو یکّہ پر یکّا تو بہت بے جوڑ معلوم ہوتا ہے یکّہ پر تو پورا سواد چھکّے میں ہی آتا ہے یعنی جب تک چھ بندے یکّہ پر سوار نہ ہوں تو نہ تو یکّہ کا پیٹ بھرتا ہے نہ ٹٹو کو حُسنِ کارکردگی دکھانے کا موقع ملتا ہے۔ یونیورسٹی کے داخلوں کے زمانے میں تو یکّہ کی افادیت حَد سے بڑھ جاتی تھی اور بسا اوقات یہاں تک گمان ہونے لگتا کہ اگر علیگڑھ میں یہ سواری نہ ہوتی تو شاید آدھے سے زائد طلبا بغیر داخلہ ملے ہی گھروں کو واپس لَوٹ جاتے۔

یکّہ کا صحیح لُطف اس وقت آنا شروع ہوتا جب چند ماہ کی مشق کے بعد اس میں نشست و برخاست کے آداب سے اچھی طرح واقفیت ہو جاتی وَرنہ ہر یکّہ نشین اپنے آپ کو اس میں غیر محفوظ اور اس کو دیکھنے والے اسے یقینی بے وقوف سمجھتے تھے۔ علیگڑھ میں یکّہ کے طرح طرح کے مصرف تھے لیکن اس کا ٹیسٹ میچ اس روز ہوتا جب نو واردانِ علیگڑھ شہر سے چارپائی، میز، کُرسی، صُراحی، مچھّر دانی کے ڈنڈے وَغیرہ، گویا اپنا جہیز بھر کر دو تین دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر چوراہے سے یونیورسٹی تشریف لاتے اس منظر پر آج بھی غور کریں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اتنا کچھ یکّہ

میں کیسے سما سکتا ہے۔ البتہ یکہ نشیں اس عالمِ بے چارگی میں دونوں ہاتھوں سے کبھی یکہ کے ڈنڈے پکڑتے تو کبھی چار پائی کا توازن درست کرتے اور پھر جب کٹھ پلے کی چڑھائی کا مرحلہ درپیش ہوتا تو سوار ہونے والوں کی اُوپر کی سانس اُوپر اور نیچے کی نیچے رہ جاتی۔ اگر اس منزل میں ذرا توازن بگڑتا تو نہ جانے لڑھکتے لڑھکتے کہاں تک پہنچ جاتے، مگر یکہ بانوں کی مہارت اور 'ٹٹو' کی ہمت کی داد دینا چاہیے کہ کبھی اس قسم کا واقعہ پیش نہ آتا اور سواریاں بغیر بال بیکا ہوئے اپنے ٹھکانوں پر پہنچ جاتیں۔ ان دنوں اتنی باوزنی خدمت کا صلہ بھی کس قدر ہلکا تھا یعنی صرف چھ آنے میں سارا لطفِ سفر مکمل ہو جاتا۔

افسوس اس زمانے کے یکہ بانوں کو نہ سوجھی ورنہ اگر یکہ میں ٹیوب ٹائر والے پہیے لگائے ہوتے تو پھر دُو ہی مریل گھوڑے، سواریوں سمیت یکہ کو اُڑائے اُڑائے لئے پھرتے۔ یکہ کو ایک فضیلتِ ساخت یہ بھی حاصل ہے کہ اس میں سوار ہونے والا تمام دُوسری سواریوں کو نیچا دیکھنے کا عادی ہو جاتا ہے خواہ وہ تانگہ ہو بگھی یا کار ہی کیوں نہ ہو، ہمیں یقین ہے کہ اگر بروقت اسے جدید سہولتوں کی سہولت مُہیّا کر دی گئی ہوتی تو یہ پھر کسی دُوسری سواری سے مات کھا کر اس طرح روپوش نہ ہوتا جیسا کہ اب ہو گیا یا کر دیا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ علیگڑھ میں رہ کر یکہ نشینی میں وہ مزہ آنے لگتا تھا جو تانگہ میں کبھی نہیں آسکا اس لئے ہم ۱۹۶۱ء میں جب علیگڑھ گئے تو اپنے آپ کو یکہ کے عشق میں مبتلا پایا اس لئے بکوشش شرفِ یکہ نشینی حاصل کیا کیونکہ یکے اس وقت تک تقریباً معدوم ہو چکے تھے۔ ہم جب شہر کے پھول چوک سے اپنے یار ڈاکٹر نواب حسن خاں چیئرمین زُولوجی ڈپارٹمنٹ کی معیت میں یکہ میں سوار ہو کر عہد نازو انداز فاتحانہ روانہ ہوئے تو چند لڑکے اظہارِ ہمدردی کے لئے ہماری طرف دوڑ پڑے اور کہا ڈاکٹر صاحب ذرا ٹھہر جائیے ابھی ابھی ہم تانگے لے کے آتے ہیں

گویا آپ جیسے محترم بھلا یکہ میں کیسے بیٹھ سکتے ہیں اب ان نیک بختوں کو یہ کیسے سمجھایا جاتا کہ ہم تو نکلے ہی یکہ سواری کا ثواب کمانے اور لطف اُٹھانے کے لئے تھے، شہر تک جانا تو محض ایک بہانہ تھا۔

بطور سواری علیگڑھ میں سائیکل کی بھی بہت قدر منزلت تھی جو باوجود کم قیمت ہونے کے یعنی صرف پینتیس روپیہ میں نئی انگلش سائیکل دستیاب تھی، بورڈنگ ہاؤس میں مشکل سے دس فیصدی لڑکوں کے پاس ہوتی تھی لیکن اس میں شک نہیں کہ لاکھ احتیاطوں اور حفاظتوں کے باوجود ہر ایک سائیکل چار پانچ لڑکوں کے زیر استعمال رہا کرتی تھی۔ اس کا خصوصی مصرف نمائش کی روزانہ سیر، اسٹیشن پر چائے پینا یا بہشت علیگڑھ گرلز کالج کے اطراف واکناف کی ہوا کھانا تھا۔ یہ دوست گر سواری بعض وقت باعث ناگواری بھی بن جایا کرتی۔ ایمرجنسی میں البتہ کوئی انکار نہیں کرتا اور سب کے کام آتی۔ ویسے علیگڑھ شہر سے یونیورسٹی آنے والے ہر طالب علم کے لئے یہ سواری ناگزیر تھی اس لئے ہر "ڈے اسکالر" پیدائشی سائیکل سوار ہوتا تھا۔ بعض احباب کو اپنی سائیکل سے کچھ زیادہ ہی محبت ہوتی تھی چنانچہ بارش کے موسم میں وہ سائیکل کو گریز لگا کر دو ماہ کے لئے کمرے میں لٹکا دیا کرتے تھے تاکہ زنگ سے حفاظت ہو سکے درآنحالیکہ خود کیچڑ پانی میں شپٹر شپٹر کرتے پیدل کالج جایا کرتے۔ سائیکل کے ایسے کڑے عاشق ہمارے دیرینہ دوست آفتاب الدین خان اور ان کے بھائی شمس الدین خان تھے وہ تو کہیئے خدا کا شکر تھا کہ یہ حضرت ہوسٹلوں میں مقیم نہ تھے ورنہ اس محتاط روی پر نہ تو ان کی خیر ہوتی نہ ان کی سائیکلوں کی اور دونوں سے خوب مڈرائٹ کھیلا جاتا۔

کہنے کو علیگڑھ میں تانگے بھی تھے لیکن ان کی حالت قابل رشک سے زیادہ واجب رحم تھی۔ بالعموم تانگوں کے انجر پنجر اتنے ڈھیلے ہوتے کہ معلوم ہوتا دوران سفر پہیے داغ مفارقت دے جائیں گے۔ پھر جانور بھی ایسا فاقہ زدہ کہ اس کی کھال

پسلیوں کو لگی ہوتی تھی۔ وہاں تانگے بالعموم پراکٹوریل مانیٹر صاحبان یا یونین کے وائس پریسیڈنٹ، دیگر اہم عہدیداران اور اسٹاف کے ممبران استعمال کرتے یا پھر برقع پوشان علیگڑھ کی یہ پسندیدہ سواری تھی جسے دیکھتے ہی سائیکل سوار کافی دور تک تانگوں کے ساتھ ساتھ رہ کر تاک جھانک کی کوشش کرتے اور کبھی کبھی اس احمقانہ فعل پر دھر بھی لئے جاتے۔ ہمارے دور کے چند طلبا کے پاس موٹر سائیکلیں بھی تھیں جو سواری سے زیادہ ان کی شخصیت سازی کے کام آتی تھیں، البتہ بورڈنگ ہاؤس میں موٹر والا ایک بھی نہ تھا۔ پروفیسر صاحبان صاحبِ کار تھے لیکن یونیورسٹی آنے جانے کے لئے بیشتر یہ حضرات بھی سائیکل کی سواری کو فضیلت دیتے یا پھر خوش خرامی کا مظاہرہ کیا کرتے۔ اس لئے اگر یہ نتیجہ اخذ کیا جائے کہ علیگڑھ کے طالب علموں اور اساتذہ میں سائیکل قدر مشترک تھی اور اس میں اور طلبا میں چولی دامن کا ساتھ تھا جو بے چاری سائیکل ہر حال میں نبھانے کی کوشش کرتی تو اس بے زبان خدمت گار کی خدمات کا بجا اعتراف ہوگا۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے آفیشل سواری نمبر ۲ بھی قرار دینا مناسب ہوگا۔

ہم نے علیگڑھ کی روایات اور جمالیات پر اکثر نظمیں سنیں۔ مجاز مرحوم نے تو انجن کے کالے کالے دھوئیں تک میں رومان پیدا کر دیا اس لئے وہاں گرلز کالج کی معشوق در آغوش بسوں کا تو رتبہ ہی کچھ اور تھا۔ لیکن افسوس کہ کسی شاعر کا توسنِ طبع ہمدم و دمساز یکہ کی طرف مائل نہ ہوا جبکہ رنگین مزاج دلبر نوازانِ پنجاب نے یکہ والی کی اداؤں سے مسحور ہو کر ایک پکچر تک بنا ڈالی جو یکہ سے زیادہ یکہ والی کی شہرت کا باعث بنی۔ بہر حال قبول کرنے والا اللہ ہے شاید وہ ہمارے ان ٹوٹے پھوٹے بے ربط الفاظ کو مقبولیت کا شرف بخشے اور بروزِ قیامت ہم یکہ والے محسنوں کے سامنے شرمسار نہ ہوں۔

—·>·(※)·<·—

کھیلوں کی سرزمین

علیگڑھ کے نام کو زیادہ پُرکشش بنانے میں وہاں مُروّجہ کھیلوں کے ڈسپلن اور کھلاڑیوں کے کمالات کا بڑا حصّہ ہے کیونکہ وہاں پہلے دن ہی سے درس وتدریس کے ساتھ ساتھ کھیلوں اور کھلاڑیوں پر غیر معمولی توجّہ دی جاتی جس کے لئے ایک ایسا جامع پروگرام نافذ تھا جس کی بدولت لڑکوں کو اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے اور بہتر سے بہتر کھیل پیش کرنے کے کثرت سے مواقع میسّر آتے۔ وہاں تین سطحوں پر کھیل کھیلے جاتے جن کی ابتدا بورڈنگ ہاؤس سے ہوتی جس لڑکے میں اس سے زیادہ بہتر کھیلنے کی صلاحیّت ہوتی وہ 'ہال' کی ٹیم کے میدان میں طبع آزمائی کرتا اور جوان میدانوں سے کامیابی سے گزرنے کی اہلیت رکھتا وہ پھر یونیورسٹی کے گراؤنڈ پر مشق کرنے کے لئے مدعو کیا جاتا۔ جہاں مہینوں اور کبھی برسوں رگڑائی کے بعد یونیورسٹی ٹیم میں شمولیت کا اعزاز نصیب ہوتا اور یہ ایک ایسی آرزو تھی جو ہر کھلاڑی کے دل میں روزِ اوّل سے موجزن رہتی۔ ہوسٹل میں کھیل تو برائے نام ہوتے جن کا مقصد تفریح یا وقت گزارنا ہوتا اس لئے وہاں اناڑی ہی زیادہ حصّہ لیتے سچّے ہُنرمندوں کو ہال یا یونیورسٹی میں مشق کرنے کا موقع ملتا' ہال' اور یونیورسٹی کے لئے ہر سال کھیل کے معیار اور سینیارٹی کے اعتبار سے کپتان مُقرر کیا جاتا۔ ہال کپتان کو بھی اچھا کمرہ دیا جاتا جس پر کپتانی کی پلیٹ نصب ہوتی۔ ایک ملازم دیا جاتا جو گراؤنڈ پر

کھیلوں کا سامان پہنچاتا۔ اب چونکہ ان ٹھکانوں پر شرکت کے لئے صلائے عام نہ تھی اس لئے صرف ۲۲ کھلاڑیوں کے نام ہر روز نوٹس جاری ہوتا جس میں کھیل کے میدان پر مقررہ وقت اور یونیفارم میں پہنچنے کی ہدایات درج ہوتیں، جو کھلاڑی بلا عذر کھیل میں شریک نہ ہوتا یا دیر سے پہنچتا تو اس کے خلاف تادیبی کارروائی کی جاتی یعنی کچھ روز یا چند ہفتے اسے کھیلنے کے واسطے نہیں بلایا جاتا۔

یونیورسٹی کی سطح پر یہ نظام اور بھی زیادہ سخت تھا وہاں کا کارندہ جب نوٹس لئے کلاس یا کمرے پر پہنچتا تو دوسرے ساتھی اس لڑکے کے رتبے پر رشک کرتے کہ اسے یونیورسٹی میں پریکٹس کا اعزاز حاصل ہو گیا۔ یونیورسٹی میں کپتانوں کو تو عام اساتذہ سے بھی زیادہ وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا وہ جدھر سے گزرتے نظریں ادھر اٹھ جاتیں اور علیک سلیک کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ ہر کپتان کے لئے ایک سجا سجایا کمرہ مقرر ہوتا جس میں فرنیچر، پردے، قالین یونیورسٹی کی طرف سے مہیا ہوتے اس کمرے میں پرانی ٹیموں کے نام کے بورڈ اور فوٹو گروپ بھی آویزاں رہتے۔ کمرے پر کام کے لئے ایک چپراسی مع سائیکل ہوتا، گراؤنڈ میں اس کے علاوہ علیگڑھ میں بغیر کسی مداخلت ٹیم منتخب کرنے، مشقیں کروانے، کھلاڑیوں کو کھیل کا سامان اور لباس مہیا کرنے حتیٰ کہ ٹیم کو بیرون علیگڑھ مقابلوں میں حصہ لینے کی غرض سے لے جانے کی تمام تر ذمہ داری بھی کپتان ہی پر عائد ہوتی۔ یوں تو ہر کھیل کا کوئی نہ کوئی پروفیسر صدر ہوتا لیکن سچ پوچھئے تو ان صدور کی حیثیت اپنے مرحوم صدر چوہدری فضل الٰہی سے زیادہ نہ تھی۔ کپتان اپنے کمرے میں پارٹنر بھی اپنی مرضی کا رکھ سکتا تھا اور اسے یہ بھی رعایت تھی کہ اگر وہ چاہے تو ڈائننگ ہال میں جانے کے بجائے اپنے کمرے پر ہی کھانا منگوایا کرے۔

رائڈنگ اسکول کا ادارہ بھی علیگڑھ میں منفرد تھا جو انتہائی نامساعد حالات

کے باوجود اب بھی قائم ہے جس کی نظیر ہندو پاکستان کی کسی یونیورسٹی میں نہیں۔
اس کے کپتان جو 'گھڑ کپتان' پکارے جاتے تھے کی سواری کے لئے خاص گھوڑا
بورڈنگ کے کمرے پر لایا جاتا تھا جبکہ دوسرے تمام سوار اپنی سائیکلوں سے رائڈنگ
اسکول تک جایا کرتے۔ الغرض علیگڑھ میں کپتان کو ایسا مقام ارفع دیا گیا جو شاید
کسی اور ادارہ میں کسی کپتان کو میسّر نہیں ہوتا۔ اس لئے ہر یونیورسٹی کپتان اپنے
وقت کا ہیرو سمجھا جاتا۔ اسی طرح یونیورسٹی کے تمام کھلاڑیوں کی بھی اساتذہ اور
لڑکے بہت عزّت و توقیر کرتے اور ہر طرح سے خیال رکھتے اور وائس چانسلر
صاحبان بھی خصوصی شفقت فرمایا کرتے چنانچہ اس حُسن و سلوک اور تفوّق کا نوجوانوں
کے دل پر گہرا اثر ہوتا اور وہ بجائے شیخی میں مُبتلا ہونے کے کھیل کے میدان میں ان
احسانات کا بدلہ چکانے کی پوری کوشش کرتے اور ڈٹ کر محنت کرتے۔

ہمیں یاد ہے کہ انجینیرنگ کالج کے داخلہ کا اِمتحان پاس کرنے کے بعد
جب ہم انٹرویو بورڈ کے سامنے پیش ہوئے تو بورڈ میں کالج کے پرنسپل پروفیسر
میتھیومین (MATTHEWMAN) اور سول انجینیرنگ کے چیئرمین مسٹر آربٹناٹ
(ARBUTKNOT) صاحبان کے علاوہ ڈاکٹر طاہر رضوی مرحوم بھی تھے۔ اس بورڈ
میں لڑکوں سے خاصے پیچیدہ سوالات کئے جارہے تھے اِس لئے ہمیں بھی ذہنی پریشانی
لاحق تھی لیکن ہم جب کمرے میں داخل ہوئے تو سلام کرنے کے بعد کسی اور کو سوال کا
موقع دینے سے پیشتر ہی ڈاکٹر طاہر صاحب مرحوم کچھ چونکنے کے انداز میں بول پڑے
"ارے تم یہاں کیسے! کیا ابھی تک ٹیم نہیں گئی؟" ہم نے عاجزانہ جواب دیا "نہیں
اِنشاء اللہ رات میں روانہ ہوں گے"۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ہماری حیثیت
سے کہیں بڑھ چڑھ کر شاندار الفاظ میں پورے بورڈ سے ہمارا تعارف کروایا اور کہا
"یہ نوجوان یونیورسٹی ٹیم کا مایہ ناز کھلاڑی ہے جو آج رات کابل کے لئے روانہ ہو رہی

ہے ایسے کھلاڑی کی شمولیت یقیناً انجینئرنگ کالج کی شہرت کا باعث ہوگی" اور پھر مزید فرمانے لگے" جاؤ تیاری کرو اور ہاں کامیاب ہو کر لوٹنا"۔ اس کے بعد دونوں گورے بزرگوں کے منھ سے بھی سوالات کے بجائے (BEST OF LUCK) کا ہی جملہ نکلا' اِس طرح ہماری ساری تیاری تو دھری کی دھری رہ گئی اور ہاکی اسٹک انجینئر سازی میں بروقت ہمارے کام آیا، تو یہ تھا مخصوص انداز جس طرح علیگڑھ یونیورسٹی میں ادنیٰ کھلاڑیوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ یہاں یہ بیان باعثِ دلچسپی ہوگا کہ اِس انٹرویو سے قبل ہم نے نہ تو خود ڈاکٹر طاہر رضوی صاحب سے ملنے کی کوئی جسارت کی اور نہ ہی کسی سے کہلوایا سُنوایا' اس لئے ان کا بَرملا ہمدردانہ رَویّہ اس فراخدلی کا ثبوت تھا جو وہاں کے شفیق اساتذہ کھلاڑیوں کے معاملے میں بَرتا کرتے تھے۔

علیگڑھ کی ٹیموں کے اعلیٰ معیار کی خاص وجہ یہ بھی تھی کہ وہاں کے کپتان ہندوستان بھر سے اُبھرتے ہوئے کھلاڑیوں کا اِنتخاب کر کے اپنی ذاتی کوششوں اور رسوخ سے انہیں یونیورسٹی میں داخلے دلواتے جہاں ان کو ایسی مراعات دیجاتیں جو کوئی اور ادارہ نہیں فراہم کر سکتا تھا۔ ایسے شہرۂ آفاق کھلاڑیوں میں: کرکٹ میں مشتاق علی' لالہ امرناتھ جیسے لیجنڈ۔ ٹینس میں ہندوستان کے قومی چیمپئن غوث محمد خان' ارشاد حسین۔ اسپورٹس میں لالہ رفیق خان صاحب۔ فٹ بال میں صمد جونیئر۔ ہاکی میں میجر شکوز اسد علی قدوائی، فیروز خان، ناصر علی، مسعود زیدی، مبرور شاہ، اختر حسین' قیوم خاں، مشتاق احمد، انوار احمد خاں، انعام الرحمٰن وغیرہ جنھوں نے اپنے مُلک اور یونیورسٹی کا نام روشن کیا۔ علیگڑھ میں ہونہار کھلاڑیوں کے نہ صرف کھیل پر نگاہ رکھی جاتی بلکہ ان کو رہائش و خوراک وغیرہ کی سہولیات بھی بطورِ خاص مُہیّا کی جاتیں، پھر ٹیموں کی روزانہ کی مشقوں پر اکتفا نہیں کیا جاتا تھا اور دَوران سال بیرونِ

علیگڑھ پابندی سے ٹورز پر بھی بھیجا جاتا تھا تاکہ وہاں زیادہ سے زیادہ تجربہ حاصل کیا جاسکے اور ٹورنامنٹ جیت کر علیگڑھ کی ناموری ہو۔

کھیلوں کا جہاں تک تعلق ہے کرکٹ علیگڑھ کا سب سے پرانا کھیل چلا آرہا ہے اور وہاں کی ٹیموں نے ہر دور میں کھیلوں کے بے مثل مظاہرے کئے ہیں۔ اس ٹیم میں پرنس حمید اللہ خان آف بھوپال کی شمولیت سے چار چاند لگ گئے جنھوں نے گدّی نشینی کے بعد کرکٹ کلب کو خوب نوازا بلکہ ان کی عنایات مسلسل تاحیات جاری رہیں جس سے کرکٹ کا معیار بڑھنے میں بہت مدد ملی۔ اس ٹیم کو ۱۹۳۶ء میں سیلون تک دورہ پر بھیجا گیا جس سے جواں سال کھلاڑیوں کی بہت حوصلہ افزائی ہوئی۔ وقتاً فوقتاً ٹینس، فٹبال اور دیگر اسپورٹس میں بھی کھلاڑیوں کی بہترین کارکردگی رہی ہے تاہم کھیلوں کی دنیا میں علیگڑھ کے نام کو بام عروج پر پہنچانے میں ہاکی ٹیم کا سب سے بڑا حصّہ ہے۔ علیگڑھ یونیورسٹی کی وہ پہلی ہندوستانی ٹیم تھی جس نے ۱۹۱۴ء میں کلکتہ کا مشہور زمانہ بائٹن کپ جیتا چونکہ اس سے پیشتر وہاں ہمیشہ گوروں کی ٹیمیں ہی چھائی رہی تھیں۔ علاوہ ازیں ہندوستان کا کوئی بڑا ٹورنامنٹ ایسا نہ تھا جو علیگڑھ نے نہ جیتا ہو جس میں آغا خان بمبئی، سندھیا گوالیار، ڈاکٹر رام لال لکھنؤ۔ عُبید اللہ خان بھوپال وغیرہ کے مشہور ترین نام ہیں۔ یہی نہیں ہاکی ٹیم نے انٹر ورسٹی مقابلوں میں جتنی مرتبہ کامیابی حاصل کی کسی اور کھیل کی ٹیم کو اس قدر فتوحات حاصل نہ ہوسکیں۔

علیگڑھ کی ٹیمیں جیسا کہ بیان کیا گیا سال بھر میں کئی کئی دورے کرتیں لیکن ہر ٹیم کپتان ہی کی سرکردگی میں جاتی 'ٹور' پر ساتھ جانے کے لئے کبھی کسی اُستاد کو بحیثیت نگراں نہیں بھیجا جاتا۔ گویا کھیل کے علاوہ ٹیم کے سفر، رہائش، خورد و نوش کا دروبست انتظام صرف کپتان کے ہاتھ میں ہوتا وہ جب چاہتا کسی کھلاڑی کا

بستر گول کروا دیتا، اور کیا مجال کہ کوئی چون وچرا کرے۔ اس ڈسپلن کا اندازہ اس ایک مثال سے ہی لگایا جا سکتا ہے کہ نواب حمید اللہ خان جو ہاکی کے بھی اچھے کھلاڑی تھے وہ کپتان کی ہدایت کو نظر انداز کرتے ہوئے کئی مرتبہ گراؤنڈ پر تاخیر سے پہنچے چنانچہ اس وقت کے کپتان محبوب عالم صاحب نے بلا تامل ان کا نام ٹیم سے خارج کر دیا۔ اب اس کارروائی سے ہاکی کلب کو بھوپال سے کبھی کوئی عطیہ نہیں مل سکا جو کرکٹ کی طرح نواب صاحب ضرور دیتے۔ یہ نقصان اپنی جگہ مگر کپتان صاحب نے ضبط و نظم کی ایک ایسی نظیر قائم کر دی جس پر ہاکی کلب ہمیشہ فخر کرتا ہے۔ اتنی غیر معمولی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے سے نہ صرف کپتان بلکہ ہر کھلاڑی میں ایسی خود اعتمادی آجاتی جو قوتِ فیصلہ میں اضافہ کا سبب بنتی۔ اب قارئین خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ علیگڑھ اپنے نوجوانوں کی صلاحیتوں پر کس حد تک انحصار کرتا تھا اور ہماری یادداشت میں کوئی مثال ایسی نہیں جہاں کپتان اس اعتماد پر پورا نہ اترا ہو یا کہیں کھلاڑیوں نے کپتان کے فیصلوں یا رویے کے خلاف علم بغاوت بلند کیا ہو یا اتنا بجٹ ہوتے ہوئے کوئی مالی بدعنوانی کی گئی ہو۔ ضبط و نظم کی اتنی بڑی مثال محکمۂ فوج کے علاوہ تعلیمی ادارے تو درکنار کسی سرکاری محکمے میں بھی نہیں ملے گی۔

افسوس کہ آج کل جدھر نظر دوڑائیے ہر طرف بدنظمی کا بازار گرم ہے بلکہ اختیارات کے لئے چھینا جھپٹ کا کھیل کھیلا جاتا ہے۔ مالی بے قاعدگیاں اور لوٹ کھسوٹ معمولات میں شامل ہیں۔ طالب علم غریب کس گنتی میں ہیں جو جتنے اونچے مقام پر فائز ہے وہ ہاتھ بھی اتنا ہی اونچا مارتا ہے۔ سرکاری خزانوں اور بینکوں سے ڈاکو تو چند لاکھ روپئے موت کا خطرہ مول لے کر لیتے ہیں لیکن چند معزز ممبران پارلیمنٹ سینیٹ یا ان کے حواری اربوں روپئے نہ صرف دونوں ہاتھوں سے لوٹ لیتے ہیں بلکہ مسلسل ہضم بھی کر لیتے ہیں اس کے باوجود قومی دولت کے امین اور ارباب

اقتدار بلند بانگ دعووں کے علاوہ اتنی اخلاقی جرأت بھی نہیں دکھاتے کہ قومی خزانے کو لوٹنے والے ان سفید پوش روسیاہوں کے کرتوتوں سے قوم کو آگاہ کریں۔ ہر آنے والی حکومت گزرے ہوئے پر صلواتیں تو بکثرت بھیجتی ہے لیکن اتنا نہیں ہوتا کہ ان غاصبوں سے بھاری بھاری رقومات وصول کر کے انھیں کیفر کردار کو پہنچایا جائے۔ اس کی وجہ غالباً حکومتوں کے درمیان بغیر لکھا ایسا معاہدہ ہے جس کی رُو سے ہر نئی حکومت کو سابقہ حکومت کی پردہ پوشی کرنا لازمی قرار دیا گیا ہے اسی وجہ سے آج کے حکمراں اپنی جگہ مطمئن ہیں کہ کل حکومت خواہ کسی فریق کی ہو لیکن کھیل کا اُصول وہی برتا جائے گا اور جس طرح انھوں نے خاموشی سے کام لیا ہے آئندہ حکمراں بھی اسی طرح ان کے معاملے میں بھی چشم پوشی برتیں گے۔ لیجئے کھیل کے میدانوں سے اُچھل کر گیند سیاست دانوں یا ملک گیروں کے میدان میں جا پہنچی اگر ہمارے اس والہانہ اظہار کے اسٹروک سے کوئی مجروح ہُوا ہو تو اسے چاہیئے آئندہ صاف ستھرا کھیل کھیلے اور فاؤلز سے گریز کرے تاکہ چوٹوں سے بچ سکے۔

قارئین محترم، ہم یہاں علیگڑھ ہاکی ٹیم کے دوروں کا کچھ حال بھی بیان کر دیں جو یقیناً باعث دلچسپی ہوگا۔ بالعموم ہر ہاکی ٹیم پندرہ کھلاڑیوں پر مشتمل ہوتی ہے، لیکن علیگڑھ کی ٹیم جب سفر پر روانہ ہوتی تو بیس بائیس سے کم افراد کبھی نہیں ہوتے جن میں کبھی کبھی سابقہ کپتان اور مشاہیر کھلاڑیوں کے علاوہ کپتان کے حلقۂ احباب کے زندہ دل بھی شامل ہوتے۔ اتنی بڑی ٹیم کے لئے ریل کے تیسرے درجے کے پانچ چھ ٹکٹ لئے جاتے اور بے چارے ٹکٹ چیکر صاحبان ان پر ہی قناعت کرتے۔ پوری ٹیم مع کپتان نہایت شان سے ہر سفر تھرڈ کلاس میں کرتی اور بوگی بک ہوتے اتنے تندرست و شوخ جوانوں کی موجودگی سے از خود ریزرو کمپارٹمنٹ بن جاتی۔ بالعموم دوران سفر کھانا خریدا نہیں جاتا بلکہ کلب سے دیرینہ وابستہ رہنے والے کارندے خانساماں گیری

کے جوہر دکھاتے۔ ہاکی کلب کی خوش نصیبی تھی کہ اسے فقیرے خان جیسا کھیل شناس، کھلاڑیوں کا ہمدرد، فرماں بردار اور بُردبار شخص میسّر آگیا تھا جو کھانا پکانے میں بھی خصوصی مہارت رکھتا تھا۔ قطع نظر موسم کی ریشہ دوانیوں کے، جاڑا ہو، گرمی ہو یا برسات ہو، کمپارٹمنٹ کھچا کھچ بھرا ہو لیکن فقیرے خان اپنے باورچی خانہ کا کاروبار پھیلانے میں کبھی دِقّت یا ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔ چلتی گاڑی سے انگیٹھی میں کوئلے ڈال کر ذرا کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر ہَوا دی کہ انگیٹھی میں لال لال انگارے دہکنے لگے اس طرح ڈبے میں بیٹھے بیٹھے ہی بڑھیا مال اُڑانے کو ملتا۔ فقیرے خان باورچی خانے کے ایسے ماہر تھے کہ انہیں خانِ مطبخ کہنا بھلا لگتا ہے وہ منزل پر پہنچنے کے بعد کچھ زیادہ ہی ہُنر دکھاتے اور انواع و اقسام کے کھانے کھِلا کر کھِلاڑیوں کو خوش رکھتے۔ یُوں تو فقیرے خانی مُرغ کا مزہ ہی ناقابلِ فراموش تھا لیکن قدرت نے ان کے ہاتھ میں ایسی لذّت دی تھی کہ آلو ٹماٹر کی بھاجی بھی پکاتے تو سب اُنگلیاں چاٹتے رہ جاتے۔ کپتان کی ہدایت یہ ہوتی کہ میچ سے قبل لڑکے کم سے کم کھائیں تاکہ دَوران کھیل سُستی نہ دکھائیں لیکن فقیرے خان کا سالن پُکار تا کہ "کھائے جا اور کھیلے جا"۔ ذائقے کے علاوہ فقیرے خان کے ہاتھ کا اصل کمال یہ تھا کہ کھانا کبھی کم نہیں پڑتا تھا۔ علیگڑھ کی ٹیم جہاں بھی پہنچتی وہاں شام کو تو بلا ناغہ دعوتیں کھانے کو ملتیں لیکن دن میں مقامی اولڈ بوائز ٹیم کے ساتھ ہی بھڑ جائے رہتے۔ اس طرح بعض وقت اپنے بیس بائیس کے علاوہ دس بارہ مزید افراد شریکِ طعام ہو جاتے لیکن اللہ نے اس فقیرے خان کے کام میں اِتنی برکت دی تھی کہ کھانا پھر بھی پُورا پڑ جاتا۔ اس فنّی مظاہرے کے لئے کھانا پکانے یا کھِلانے میں وہ کونسا نسخہ استعمال کرتے تھے یہ بھی کسی کے پلّے نہیں پڑا۔ البتہ ناشتے کے دَوران جب یکدم آدمی زیادہ ہو جاتے تو پھر فقیرے خان بڑی چابکدستی سے بغیر مکھن کے ہی توسوں پر خالی چھری پھیرتے رہتے اور کسی کو اس

عجیب بلا مکھن مکھن بازی کا پتہ تک نہیں چلتا۔

یہ تو رہا فقیرے خانی کھانوں کا معاملہ اب خوبیٔ قسمت سے ڈبہ میں کوئی مسافر ناشتہ بدست میسّر آجاتا تو اسے خدائی میزبان سمجھ کر ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا اور بالعموم سب اس کے ساتھ مل کر کھانے سے لطف اندوز ہوتے۔ توشہ خانے کے مذکورہ اہتمام کے علاوہ موسیقی کا ذوق رکھنے والے ہارمونیم کی پیٹی اور بانسری وغیرہ بھی زادراہ میں شامل کرتے چنانچہ جتنا لمبا سفر ہوتا اتنی لمبی محفل جمتی اور فن کار نغمہ سرا ہو کر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے رہتے۔ یہاں تھوڑی توضیح کر دی جائے کہ ٹیم کے ممبران ہر کس و ناکس کو سمع خراشی کی چھوٹ نہیں دیتے تھے بلکہ اس محفل میں آزمودہ لوگ ہی پسندیدہ گانے سنا کر خود بھی شاد کام ہوتے اور سارے کمپارٹمنٹ سے داد و تحسین وصول کرتے ایسے دلنواز کھلاڑیوں میں ہمارے بزرگ ایم ایچ عبّاسی صاحب کا نام سرفہرست آتا ہے۔ جو ۱۹۴۰-۴۱ء میں علیگڑھ کے کپتان رہ چکے ہیں، لیکن ہارمونیم نے نہ تو ان کا ساتھ کپتانی کے دوران چھوڑا اور نہ کبھی اس کے بعد، بلکہ یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ آج نصف صدی گزر جانے کے باوجود بھی عبّاسی صاحب اسی طرح ہارمونیم کو گلے لگائے ہوئے ہیں اور ہارمونیم بھی اتنے ہی پریم سے ان کو لپٹا ہوا ہے۔ اور اس طرح لے اور سُر کا یہ طویل ساتھ قائم چلا آرہا ہے اور اب بھی جب بھائی لوگوں کا اساتذہ کی غزلیں سننے کا موڈ ہوتا ہے تو عبّاسی صاحب اسی رفیقِ گلوکی سنگت پر سنگیت کے ہنر دکھانے لگ جاتے ہیں۔ آپ شاید سمجھتے ہوں کہ محض روٹی اور ہارمونیم کے سہارے سفر کی بے لطفی و طوالت کم ہو جاتی تھی تو ایسا ہرگز نہ تھا چونکہ بھائی لوگ تاش کی گڈیاں بھی ساتھ لے کر چلتے اور راستے بھر فلاش، رمی، برج وغیرہ سے تفنن طبع فرماتے رہتے اس لئے علیگڑھ سے کلکتہ جانا ہو یا مدراس کا سفر درپیش ہو ہنستے کھیلتے گزر جاتا اور منزلِ مقصود کے پلیٹ فارم پر اترتے وقت تمام کھلاڑی ایسے تر و تازہ نظر آتے

جیسے محض علیگڑھ سے دہلی تک برائے تفریح گئے ہوں، جس میں دو ڈھائی گھنٹے لگا کرتے تھے۔ ٹیم کی منزل ہندوستان کا بڑا شہر رہا ہو یا چھوٹا وہاں کے مسلمانوں بالخصوص اولڈ بوائز کے جذبۂ علیگیت کی بدولت ایسا استقبال ہوتا کہ باید و شاید کسی بھی دوسری ٹیم کو نصیب ہوتا ہو۔ ہر شام میچ کھیلتے، رات کو ڈنر اڑاتے جن کا لطف ہی کچھ اور تھا دعوتیں بھی سادہ نہیں ایک سے ایک بڑھیا، پھر دسترخوان پر نظریں پلیٹوں پر گاڑ کر گم سم بیٹھنا کس کے بس میں تھا۔ پرانے قصے سنائے جاتے، تازہ لطیفے گھڑے جاتے، نئے واقعات دہرائے جاتے۔ بعض خوش مذاق میزبان راگ رنگ کا اہتمام بھی کر گزرتے لیکن ان محفلوں میں صرف اپنے وقت کے مشاہیر فنکاروں کا ہی گزر جائز سمجھا جاتا۔ ہمیں ایسی ہی ایک محفل میں گوالیار میں برِصغیر کے مشہور سرود نواز استاد حافظ علی خاں کو سننے کا نادر موقع ہاتھ آیا تھا جو ہمیشہ یاد رہے گا۔ اس طرح مرغن سے مرغن غذا قیام گاہ تک پہنچتے پہنچتے خود بخود ہضم ہو جاتی۔ واقعی جوانی کا دور بھی کیا عجب دور ہوتا ہے جس میں بھوک بھی جوان ہوتی ہے اور بجائے چورن کی احتیاج کے غذا پر غذا کی مزید تہ جما کر ہی ہضم کر لیا جاتا ہے۔ سہ پہر کو میچ کے دوران البتہ کاندھوں پر غیر معمولی ذمہ داریوں کا بوجھ محسوس ہوتا چونکہ ہمارے ہمدرد کثیر تعداد میں ہمارے میچ دیکھنے آتے اور خوب خوب شور مچا کر ٹیم کی ہمت افزائی کرتے رہتے۔ ایسے میں بھول چوک اور معمولی غلطی بے حد شرمساری کا باعث بن جاتی جب پالی مار لیا کرتے تو خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ ہوتا اور معاملہ اس کے برعکس ہوتا تو ملال بھی بے حساب ہوتا۔ ٹیم میں تو پندرہ کھلاڑی ہوتے لیکن ان میں سے کون سے گیارہ کھلائے جائیں گے اس کا پتہ میچ سے دو ایک گھنٹے پیشتر تک نہیں چلتا تھا اور علاوہ چند علی پایہ کھلاڑیوں کے باقی کے دلوں میں کھد بد مچی رہتی اور وہ اپنے بستروں پر لیٹے لیٹے امید و بیم کے عجیب و غریب عالم سے گزرا کرتے۔ پھر جب میچ کا نوٹس لے کر

فقیرے خاں دستخط کروانے نکلتا تو پریشانی کچھ اور ہی بڑھ جاتی، بالکل اس طرح جیسے کمرۂ امتحان میں نگراں کے ہاتھ میں پرچۂ امتحان دیکھ کر طاری ہوتی ہے۔ بلاشبہ اتنی مختصر مگر گھبراہٹ خیز صورتِ حال سے زندگی میں کم ہی سابقہ پڑتا ہے۔ نوٹس پاتے ہی منتخب کھلاڑی بڑی مستعدی سے میچ کی تیاری میں مصروف ہو جاتے۔ ادھر محرومین ضبط و تحمّل سے کام لیتے ہوئے بستر پر ہی انگڑائیاں لیا کرتے ایسے موقع پر اگر کسی کے ساتھ حق تلفی بھی کی گئی ہو جو کبھی کبھی ہو جاتی تھی تب بھی کسی میں تاب نہ تھی کہ صدائے احتجاج بلند کرے یا اپنے رویّے سے اظہارِ ناراضگی کرے۔ اسے ہر حال میں میچ کے دوران گراؤنڈ پر موجود رہنا ہوتا تھا۔ دراصل ڈسپلن کا یہ ایسا مؤثّر ترین ہتھیار تھا جس نے علیگڑھ کے کھلاڑیوں کو کھلاڑی اور کھیلوں کو ایک بامقصد و باعثِ توقیر مشغلہ بنا دیا۔ یہاں ان روایات کو قدرے تفصیل سے رقم کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے نوجوان کھلاڑی، کھیلوں کے منتظمین، اساتذہ اور تعلیمی اداروں کے سربراہان غور کریں اور سمجھنے کی کوشش کریں کہ "اسپورٹس مین اسپرٹ" پیدا کرنے اور کھیلوں کو فروغ دینے کے لئے کتنی جانفشانی اور مستحکم تنظیم کی ضرورت ہوتی ہے جس پر عمل پیرا ہو کر ہی کامیابیوں سے ہمکنار ہُوا جا سکتا ہے۔

—·>·(:):·<·—

www.taemeernews.com

کابل کے باغات پر ہاکی بازوں کی یلغار

اس سے پیشتر علیگڑھ میں نظام کھیل سے متعلق مضمون میں ہم نے وہاں کھیلوں کی غیر معمولی سہولتوں، کھیلوں کے معیار اور ضبط و نظم کا تذکرہ کیا، آئیے اب ایک غیر ملکی سفر کا حال بھی ملاحظہ فرمایئے جس سے احوال مذکورہ کی مزید تصریح و تائید ہو سکے گی۔

یادداشت کا بھی اللہ میاں نے کچھ عجب حساب رکھا ہے یعنی عمر کے آخری دور میں داخل ہونے کے بعد تازہ واقعات اور نئے نئے نام تو دماغ کی 'سلیٹ' سے مٹتے جاتے ہیں لیکن اس کے برعکس پچاس ساٹھ سال پرانے قصے اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ ذہن میں ابھرتے چلے آتے ہیں جس کا ثبوت قارئین کو اس تحریر میں ملے گا۔ چنانچہ ہم نے جب سوچا کہ علیگڑھ ہاکی ٹیم کے کسی دلچسپ ٹور کی سرگزشت رقم کریں تو آج سے ۴۷ سال قبل درپیش آنے والے سفر افغانستان کی یادیں بڑے زور سے ہمارے ذہن پر دستک دینے لگیں۔ پھر جب حسن اتفاق سے ایک بوسیدہ ڈائری سے ہمیں اپنی اس پہلی بیرون ملک سیاحت کی کچھ معلومات مثلاً روانگی، قیام اور واپسی کی تواریخ میسر آگئیں، گویا بنیاد تیار ہو گئی تو ہم نے بھی اس پر عمارت کھڑی کرنے کا تہیہ کر لیا اب اپنی تمام سچائیوں کے ساتھ یہ مختصر سفرنامہ قارئین کی نذر ہے۔

نہ صرف یہ کہ افغانستان، ہندوستان کا قریب ترین اسلامی مُلک تھا بلکہ ہمارے آباؤ اجداد کا مسکن ہونے کی وجہ سے ہمیں افغانستان سے بچپن سے گہرا لگاؤ تھا اور اسی عقیدت کی شدّت نے ہمیں لڑکپن میں اپنے کمرے میں ظاہر شاہ کا فوٹو آویزاں کرنے پر مجبور کر دیا تھا، بغیر یہ جانے ہوئے کہ موصوف کی سیرت و کردار میں کتنی خوبیاں یا خامیاں ہیں کیونکہ ہمارے نزدیک ہیرو ہونے کے لئے ان کا ہمارے اسلاف کی سرزمین کا بادشاہ ہونا ہی کافی تھا۔ پھر اوائل عمر میں قرآن شریف کے بعد ہمیں گھر پر فارسی کی بھی باقاعدہ تعلیم دی گئی تھی اور شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کی گلستاں بوستاں کی خوب خوب سیر کر چکے تھے جس کی وجہ سے فارسی بولنے والوں سے اُنس و محبّت ہونا لازمی امر تھا۔ ان سب سے بڑھ کر ہمارے دادا مرحوم کی جن کے ہم چہیتے تھے کی وہ تمنّا تھی جس کی وہ اکثر ہدایت فرمایا کرتے تھے اور وہ یہ کہ "بیٹے جب بڑے ہو جاؤ تو اپنے بزرگوں کی ولایت ضرور جا کر دیکھنا"۔ چنانچہ جولائی ۱۹۴۵ء میں جب علیگڑھ کی ہاکی ٹیم کو کابل کے 'جشنِ استقلال' کے موقع پر شرکت کرنے اور وہاں نمائشی میچ کھیلنے کی دعوت ملی تو ہماری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی اور ہم نے سوچا کہ یقیناً یہ ہمارے مرحوم دادا میاں کی دُعاؤں کا ہی نتیجہ ہے کہ ان کی دیرینہ خواہش کی تکمیل کا موقع میسّر آگیا۔

علیگڑھ میں وسط جولائی میں ٹیم سازی کا کام شروع ہو گیا تھوڑی بہت مشقیں بھی کی جانے لگیں اور ۱۹ جولائی ٹیم کی روانگی کا اعلان کر دیا گیا اس وقت بلاشبہ ہماری سرخوشی کا جو عالم تھا اس کا اظہار الفاظ میں نہیں کیا جا سکتا، ایک تو بیرونِ مُلک جانے کا پہلا موقع، وہ بھی اپنے محبوب اسلامی مُلک کا گویا سونے پر سہاگہ، اسی طرح ساتھ دیگر اراکین ٹیم اپنی اپنی جگہ بغلیں بجا رہے تھے۔ اس ٹیم میں کئی جہاں دیدہ پرانے کپتان بھی تھے اور تازہ وارد نوجوان بھی

پُرانے کپتانوں میں جانڈی خان ومحمود بھائی مرحوم، درمیانوں میں اظہر خان، حامد خان فاروق فاطمی، اکرام اللہ صاحب، میر کاظم حسین، تسلیم احمد، مبرور شاہ اور فاضلات میں چند بے فکرے اور ڈاکٹر خالد مرحوم جو بااعتبار ڈگری نہیں بلکہ بزور ورثہ ڈاکٹر کہلاتے تھے اور نہایت ملنسار و دلچسپ واقع ہوئے تھے شامل تھے افسوس کہ اس تاریخی سفر میں منن خاں کپتان ہونے کے باوجود شریک نہ ہو سکے تھے کیونکہ وہ سپلیمنٹری امتحان کے عارضہ میں مبتلا تھے لیکن ان کی کمی کو سب نے شدت سے محسوس کیا اور ان پر جو کچھ گزری اس کا ملال تو وہ زندگی بھر کرتے رہے۔ اکثر کہتے "میاں میری بی اے کی ڈگری بہت مہنگی ہے اس کے لئے کابل کے سفر کی قربانی دی ہے"۔ اب صورت حال یہ ہے کہ قافلے کے چند راہرو تو دور دیس جا بسے جہاں نہ ہماری تحریروں کی رسائی ہے نہ ہی ہماری۔ دو ایک غالباً بھارت میں ہوں لیکن باقیات کی اکثریت ابھی کراچی میں ہے۔ خدا ایام زریں کی ان نشانیوں کو تاباں و سلامت رکھے۔ یہ تمام دوست مثلاً بھائی اظہر خان پنڈلی، حامد خان نواب زادہ جواب نوابی کے دعویدار ہیں اہل ہوں یا نہ ہوں یہ جُدا بات ہے، مشہور زمانہ مبرور شاہ خان، گوشہ نشیں برادرم فاروق فاطمی جب کہیں اکٹھے ہو جاتے ہیں تو وہی پُرانے قصے اور داستانیں دُھرائی جانے لگتی ہیں جو نصف صدی گزر جانے کے باوجود اب بھی کل کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

خدا خدا کر کے ارمان بھرے دل لئے نوجوانوں کا یہ قافلہ ۱۹ جولائی کی شب میں علیگڑھ سے روانہ ہو کر صبح صبح دہلی پہنچا۔ جہاں سب لاہور جانے والی گاڑی میں منتقل ہو گئے اسی اثناء پلیٹ فارم پر حسب عادت چہرے پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ لئے عاقل خان نے نمودار ہو کر سب کو فرطِ حیرت میں ڈال دیا۔ یہ عاقل خان خدا غریق رحمت کرے بڑے توشہ کی چیز تھے ان کا نام تو عاقل حسین جعفری تھا

لیکن منن خان مرحوم کے مُسلسل فیضِ صحبت نے انھیں عاقل خان بنا دیا تھا۔ اَب وہ جعفری ہوں یا پٹھان لیکن عقل سے ان کو کوئی سروکار نہ تھا۔ موصوف پشتینی 'ڈے اسکالر' تھے یعنی شہر میں سکونت پذیر تھے۔ چوبیس گھنٹے منن خان کی صورت پر سوار بلکہ ان کی اردلی میں رہتے تھے اِس لئے ان کا زیادہ وقت ہوسٹلوں میں کٹتا اور ڈائننگ ہال کے کھانے سے پیٹ پلتا۔ باعتبارِ شخصیت عاقل خان وجیہ آدمی تھے، رنگ بھی اُجلا، بڑی بڑی آنکھیں، درمیانہ قد، زیادہ تر سیاہ شیروانی پہنتے جسے سجانے کے لئے جاڑوں میں گلے میں سفید ریشمی 'اسکارف' ڈالے رہتے۔ کثرتِ استعمال یا عاقل خان کے اعمال کا شیروانی پر تو خاک اثر نہیں پڑا کہ وہ تو خود ہی کالی کلوٹی تھی لیکن اِس گلوبند کی مٹی جس طرح عاقل خان نے پلید کی شاید ہی کسی اَور نے کی ہو۔ اس بے چارے کی ہیئت ایسی بَدل گئی تھی کہ اصل چاند جیسی رنگت پر میل کی کثیف تہیں جمی ہُوئی تھیں جو ہر دیکھنے والے کو کھلتیں لیکن پہننے والا ایسے تاثّرات سے قطعاً بے نیاز تھا۔ اگر کوئی مذاق میں مشورہ دیتا کہ بھائی اسے دھو بھی لیا کرو تو منن خان کہہ دیتے "خبردار کسی کے کہنے میں نہ آنا بھلا اصلی ریشم کو بھی کوئی دھوتا ہے"۔ عاقل خان کی ایک مخصوص اور منفرد ادا یہ بھی تھی کہ شیروانی پہنے ہوں یا کوٹ پتلون اور ٹائی لیکن کیا مجال جو پاؤں پر موزہ کا بار ڈالیں یا جوتے پر پالش کا بھُولے سے ہاتھ پھیر لیں اس کے باوجود ان کا بے پالش کا جوتا ان کے پاؤں سے زیادہ صاف معلوم ہوتا تھا کیونکہ بغیر جُرّابوں کے ان کے قدم شریف کی گندگی دیکھی نہیں جا سکتی تھی۔ خیر عاقل خان نے جو احبابِ ٹیم کو دیکھا تو کچھ دیر تک ڈبہ میں بیٹھے بیٹھے اپنے بمبئی کے سفر کی روداد سُناتے رہے کیونکہ موصوف اسی وقت بمبئی سے تشریف لا رہے تھے اور علیگڑھ جانا تھا لیکن ہمارے ڈبے کے ماحول کا اثر ان پر کچھ ایسا پڑا کہ بس وہیں پھیل گئے

اور کہنے لگے افغانستان تو میں بھی جاؤں گا۔ شروع شروع میں ہم عاقل خان کی اس خواہش کو محض دل لگی سمجھتے رہے لیکن انھوں نے منن خان کے ناتے محمود بھائی کا اتنا پیچھا لیا کہ مجبوراً انھوں نے کہا "لیکن تمہارا ویزا وغیرہ نہیں ہو سکا تو پشاور سے واپس لوٹنا ہوگا"، اس طرح عاقل خان بھی اپنا بستر بوریا لے آئے اور اپنے ڈھیٹ پن کے طفیل شریکِ سفر بن گئے۔ حالانکہ ٹیم کی علیگڑھ واپسی پر منن خان نے اپنی عدم شرکت پر اتنا اظہارِ افسوس نہیں کیا جتنا صدمہ انہیں عاقل خان کے جانے کا ہوا۔ بار بار کہتے "یار تمہیں علیگڑھ سے ساتھ لے جانے کو یہی نمونہ رہ گیا تھا کوئی اور معقول آدمی نہیں ملا"۔ پھر خوب ہنستے تھے اور کہتے "یار ذاکر آخر کابل والے کیا کہتے ہوں گے اور انھوں نے انھیں کیسے برداشت کیا"؟

دہلی سے روانہ ہو کر جب ٹرین لاہور پہنچی تو رات ہو چکی تھی، لاہور اسٹیشن پر ہماری ملاقات اپنے قافلہ سالار (CHIEF-DE-MISSION) آغا محمد اکرم صاحب سے ہوئی جو بہاولپور کے ریٹائرڈ آئی جی پولیس تھے اور معروف اولڈ بوائے تھے۔ آغا صاحب نہایت خوش مزاج، خوش لباس اور خوبرو انسان تھے گویا اولڈ بوائے کا گولڈن نمونہ وہ تھوڑی ہی دیر میں سب سے گھل مل گئے اور ڈنر ہم سب نے ساتھ کھایا، جس کے دوران اولڈ بوائز کے پرانے چٹکلے سنتے سناتے رہے۔ لاہور سے روانہ ہو کر ہم ۲۰ جولائی کی سہ پہر پشاور کینٹ کے اسٹیشن پہنچے جہاں چند اولڈ بوائز اور سرحد ہاکی کے کرتا دھرتا لالہ ایوب موجود تھے۔ ریل سے اترتے ہی سیدھے گرین ہوٹل کینٹ میں ڈیرہ ڈالا اور تھوڑی دیر میں ہی پریکٹس کے لئے پولیس گراؤنڈ کو آباد کر دیا۔ رات میں طوالتِ سفر کے طفیل خوب نیند آئی اور علی الصباح روانگی کا عمل شروع ہو گیا۔ تقریباً نو دس بجے افغان کونسلیٹ پہنچے، کاغذاتِ سفر مکمل کروائے گئے اور وہیں سے دو افغانی بسوں میں سوار ہو کر سوئے منزلِ مراد روانہ ہو گئے۔ اس طرح ہنستے بولتے

گاتے، گنگناتے نوجوانوں پر مشتمل یہ کارواں جمرود پہنچا جہاں خلاف توقع بڑی سخت چیکنگ کی گئی۔ زیادہ زور کاغذوں، اخبارات اور کتابوں پر تھا۔ یہی نہیں کیمرے تک سیل کر دیئے گئے۔ بالآخر اس سے چھٹکارا پا کر ساڑھے گیارہ بجے دن ہم مشہور درّہ خیبر میں داخل ہوئے اس وقت سب عجیب کیفیت سے دوچار تھے۔ سینما اور تصاویر میں دکھائے جانے والے حسین نظارے ہمارے منتظر تھے۔ پہاڑوں کے پہلو میں لہراتی، بل کھاتی، اٹھلاتی سڑکوں کا منظر انتہائی دلفریب تھا۔ گرچہ گردونواح میں سنگلاخ پہاڑ ہی پہاڑ تھے، لیکن اس وقت وہ بھی حسن و رعنائی کے مجسمہ بنے ہوئے تھے۔ پھر اس تصوّر سے کہ ہم جس راہ پر گامزن ہیں نہ جانے کتنے بڑے بڑے فاتحین اور ان کی افواج گزر چکی ہیں بہت لطف اندوز ہو رہے تھے سب سے بڑھ کر یہ خیال کہ یہ وہ رہ گزر ہے جس پر ہمارے اسلاف نے ہندوستان آ کر نئی نئی بستیاں بسائیں، ریاستیں اور شہر آباد کئے تھے، ہمیں انتہائی فخر محسوس ہو رہا تھا بلکہ ہمیں سکون میسّر آ رہا تھا کہ کسی نہ کسی طرح ہمیں اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق تو میسّر آئی۔

تھوڑی دیر میں لانڈی کوتل آ گیا جہاں اسکول کے کمسن بچے جو پختون تھے، ظاہر شاہ کو گالیاں دے رہے تھے جو یقیناً انگریزوں کی تعلیم کا نتیجہ تھا جس سے انگریز کی شر انگیز ذہنیت کا اندازہ ہوا۔ اس کے برعکس بغیر دیکھے بھالے ظاہر شاہ ہوں، رضا شاہ یا عصمت انونو ہم ہر ایک کو اپنا ہیرو گردانتے تھے اس لئے ان معصوموں کا تبرّا سُن کر دل ہی دل میں اپنے آقاؤں پر صلواتیں بھیجنا شروع کر دیں کہ ان کمبختوں نے تو بچوں کے ذہنوں کو بھی پراگندہ کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد جب ہم ہندوستان اور افغانستان کی سرحد تورخم پہنچے تو دن کے ڈھائی بج رہے تھے۔ تورخم پہنچ کر تربوز سے تراوٹ حاصل کی اور جوس کے ساتھ نان کھا کر گویا لنچ کی کمی دور کی۔ یہاں پاسپورٹوں کی جانچ پڑتال شروع ہو گئی۔

سب لوگوں کے پاسپورٹ توضع پروانہ راہداری مکمّل تھے جو پیش کر دیئے گئے لیکن عاقل خان کو وہاں کے عملے نے حراست میں لے لیا معلوم ہوتا تھا جیسے ان پر غیر قانونی آمد پر کارروائی کی جا رہی ہو۔ اس غیر متوقع کارروائی سے عاقل خان کی باچھیں سکڑ گئیں اور ان کا رنگ زرد پڑ گیا تب انھیں یاد دلایا گیا کہ آپ کو اس شرط پر آنے کی اجازت دی تھی لہٰذا اب کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ اس وقت ہمیں پہلی مرتبہ عاقل خان کے لبوں کو بلا مسکراہٹ دیکھنے کا موقع بلا وہ التجائیں کر رہے تھے کہ کوئی تدبیر ان کی نجات کی کی جائے۔ الغرض جانڈی خان جو مُنّن خان کی غیر موجودگی کی وجہ سے کپتانی کے فرائض انجام دے رہے تھے یہ آہ و بکا سُن کر بس سے اُترے چوکی پر گئے اور تھوڑی کچھ کارروائی کے بعد عاقل خان کو اپنے ساتھ لئے بس میں آ گئے۔ عاقل خان ان چند لمحات میں اتنے خوفزدہ و مایوس ہو گئے کہ واپسی کی مسرّت سے ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ ہم سب نے ان کی اسیری پر تعزیت کرنے کے بجائے رہائی پر خوشیاں منائیں۔ اتنے میں ہماری بسیں ہندوستان کی سرزمین پار کر کے افغانستان کی سرحد میں داخل ہو گئیں۔ زندگی میں پہلی بار ہمیں ایک آزاد اسلامی مملکت پر قدم رکھنے اور غلامی کی کثافت سے مُبرّا فضاؤں میں سانس لینے کا موقع ملا تھا اور اس احساس سے جو تازگی اور بے پناہ خوشی حاصل ہوئی تھی وہ بیان نہیں کی جا سکتی۔ سرحدی چوکی پر افغان افسران نے ہمارا پُرتپاک اِستقبال کیا اور پشتو کے ساتھ ساتھ پہلی دفعہ فارسی کی حلاوت و شیرینی کانوں کو نصیب ہوئی تو رُوح خوش ہو گئی۔ راستے میں ڈھکہ کے مقام پر سب نے پھلوں کا عُمدہ عرق نوش کیا اور تر و تازہ ہونے کے بعد جلال آباد پہنچے تو رات ہو چکی تھی۔ وہاں بھوک کا غلبہ تھا اس لئے رات کا کھانا ہوٹل میں خوب ڈٹ کر کھایا اور اپنے افغانوں کی میزبانی کی اچھی طرح داد دی۔ چاندنی چٹکی ہوئی تھی ہوٹل کی روِشوں پر چنبیلی

اور موتیا کے پھول عطر بیزی میں مصروف تھے اور ہم سب ٹہل ٹہل کر اس خوبصورت منظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے کیونکہ علی الصباح کابل کے لئے روانگی تھی اس لئے رات میں کسی قسم کی دھما چوکڑی مچانے یا تاش وغیرہ کھیلنے کا موقع نہ تھا چنانچہ چارپائیوں پر لیٹتے ہی ایسی آنکھ لگی کہ معلوم ہوتا تھا پلک جھپکتے ہی صبح ہوگئی۔ اس باغ میں صبح کا منظر بھی اتنا ہی پُرکیف اور سہانا تھا ہوٹل کے دائیں بائیں ایستادہ پہاڑ ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے قوی ہیکل پہرے دار قدرت نے متعین کر دیئے ہوں۔ صبح صبح ناشتے سے فارغ ہو کر ۲۲ جولائی کو ۷ بجے منزلِ مقصود یعنی سمتِ کابل روانہ ہو گئے۔ راستہ طویل، سڑک ندارد، نوکیلے پتھروں اور پتھریلی گرد پوش زمین ہماری راہگزار تھی پھر اطراف کا علاقہ بھی بے آب و گیاہ رہی سہی کسر گرمی اور دھول نے پوری کر دی۔ اس بوریت کو دور کرنے اور ماحول کو گوارا بنانے کے لئے جانڈی خان نے اس زمانے کا مقبول ترانۂ جوانان، شروع کر دیا، پھر کیا تھا ہر طرف سے ؎ میری بھینس کے ڈنڈا کیوں مارا

تیرے باپ کا وہ کیا لیتی تھی

کا کورس شروع ہو گیا، جس سے طبیعتوں میں اکساہٹ اور اضمحلال کے بجائے تازگی پیدا ہو گئی لیکن رندوں کے اس ہنگام شور و شر میں عاقل خان بیچارے پژمردہ سے بیٹھے تھے وہ کچھ ایسے خائف تھے کہ کہیں آئندہ کسی چیکنگ پر بس سے نہ اتار دیئے جائیں اور دیارِ غیر میں پس زنداں جانا نہ پڑ جائے ان کی رونی صورت دیکھ کر جانڈی خان نے بھانڈا پھوڑا کہ "بارڈر پر ہونے والا واقعہ محض ایک کھیل تھا اور یہ ایکٹویٹی، انتظاماً اس لئے کی گئی تھی کہ آئندہ عاقل خان جیسے مدِ فاضل، خواہ مخواہ ٹیم کے گلے نہ پڑیں جو ہونا تھا سو ہو چکا" یہ سن کر عاقل خان کی مقفل باچھیں کھل گئیں جس کے بعد انھوں نے بھی، بھینس کے ڈنڈا

کیوں مارا' کی تانیں اُڑانا شروع کر دیں۔

ایک تو راستہ دشوار گزار اس پر بسیں عُمر دراز اس لئے مسافت کا ٹنا دُوبھر ہو گیا تھا اور بسوں کے پیہم جھٹکوں نے آنتوں کو بھی قوتِ گویائی بخش دی اسلئے ہر ایک بھُوک کی شدّت میں مُبتلا نظر آتا تھا اِدھر ستم یہ ہُوا کہ ہمارے میزبانوں کے پروگرام کے بموجب قافلے کو ڈیڑھ دو بجے تک کابل پہنچنا تھا اِس لئے راستے میں دوپہر کے کھانے کا کوئی اِنتظام نہیں کیا گیا تھا۔ اب اس ویرانے میں ہوٹل کہاں' دُور دُور جا کر تو کہیں آبادی کی صُورت نظر آتی تھی اور اگر مقدّر سے کہیں دُور سے تنور کا دُھواں دکھائی دے جاتا تو سب اُدھر لپک پڑتے چُنانچہ کئی منزلیں طے کرنے کے بعد جگی نما ہوٹلوں پر لنچ کا مسئلہ بالاقساط حل ہُوا۔ ان ڈھابوں پر چند نفوس کے کھانے کا اِنتظام ہوتا وہ بیک وقت اتنے گاہکوں کو دیکھ کر خوشی اور گھبراہٹ میں مُبتلا ہو جاتے لیکن جس طرح عُجلت سے فٹافٹ وہ مُرغ تیّار کرتے اور ساتھ میں روٹی بھی ڈالتے جاتے وہ ان کا ہی حصّہ تھا معلوم ایسا ہوتا تھا کسی نے سُنی یا نہ سُنی ہو ہماری آنتوں کی فریاد ان نان بائیوں نے ضرور سُن لی، لڑکوں کا عالم یہ تھا کہ انھیں ایسے میں ہر شے خوش ذائقہ معلوم ہو رہی تھی اور جتنی تیزی ڈھابے والا روٹی تیّار کرنے میں کرتا اس سے کہیں زیادہ سُرعت سے لڑکے سُپردِ شکم کرتے جاتے۔ اس طرح پیٹ تو جیسے تیسے بھر لئے گئے لیکن ان احتیاجی قیاموں سے سفر طول پکڑتا چلا گیا۔ مگر نشاطِ شکم ہونے کے بعد ٹیم میں نئی اسپرٹ سی پیدا ہو گئی اور خُوب شور مچا کر سُستی کو دفع کیا گیا۔ اب اطراف کا منظر بھی کچھ مائل بہ کرم ہو چلا تھا اور ہماری آنکھیں ٹھنڈی کرنے اور دل بہلانے کے لئے دریائے کابل ہمارا شریکِ سفر بن گیا تھا جو کہیں ساتھ ساتھ چلتا تو کہیں نیچے غوطہ لگا جاتا۔ بالآخر سفر میں چڑھائی کا مُشکل مرحلہ بھی درپیش ہو گیا جس سے گاڑیوں

کے انجنوں کی سانس پھولنا شروع ہوگئی اور انہوں نے طیش میں آکر دھواں چھوڑنا شروع کر دیا اس لئے ہر گھنٹے آدھ گھنٹے بعد پانی ڈال کر ان کا غصہ ٹھنڈا کرنا بھی ضروری ہوگیا۔ تاہم اس بلندی سے ہوا میں بھی خنکی پیدا ہوگئی جس سے گرمی کی ناگواری میں خاصی کمی واقع ہوگئی۔ دورانِ مسافت بیشتر علاقے میں ہمیں جو افغانی ملے وہ خاصے لمبے چوڑے اور وجیہ تھے اور تقریباً سب کے چہرے ڈاڑھیوں سے مسجّع تھے بلکہ ماتھوں پر نشانِ سجود اور اکثر کے ہاتھوں میں رائفلوں کے ساتھ ساتھ تسبیحیں بھی تھیں گویا دونوں طرح کا اسلحہ موجود تھا۔ زبان سب کی پشتو تھی تاہم سلام علیک کا جواب نہایت گرمجوشی سے ملتا۔ پہاڑوں میں بعض جگہ کچھ گہرے تاریک غار بھی نظر آئے جن کے متعلق ہمارے ڈرائیوروں نے بتلایا کہ ایسے غار مردم خوروں کا مسکن ہوتے ہیں۔ واللہ عالم بالصواب لیکن بعد میں سیانے کابلیوں نے بھی تسلیم کیا کہ اس وقت یعنی ۱۹۴۵ء تک وہاں کہیں کہیں مردم خور پائے جاتے ہیں۔ پھر کابل پہنچ کر کچھ فوٹو ایسے دستیاب ہوئے جس میں آدم خور اعضائے انسانی کو لکڑیوں کی آگ پر بھون رہے تھے۔ چلتے چلتے جب قافلہ ایک پُرفضا چوٹی پر پہنچا تو گاڑی کو آرام دینے کی ضرورت لاحق ہوئی اس لئے سب لوگ بس سے اُتر کر اِدھر اُدھر بنسی دل لگی میں محو ہوگئے۔ دریائے کابل یہاں اتنا نیچا تھا کہ محض ایک نالہ سا معلوم ہوتا تھا۔ اوپر سے باری باری سنگ باری کی مشق کی گئی کہ کس کا پتھر دریا میں گرتا ہے سب لوگ ان مشقوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ کسی نے گاڑی میں سے اُٹھا کر ایک گیہوں کی بالیوں کا بنا ہوا ہیٹ (STRAW HAT) ہوا میں اُچھال دیا جو ہوا کے دوش پر سوار دریائے کابل کی سیر پر روانہ ہوگیا۔ جس وقت اس ہیٹ کو تاک تاک کر نشانہ بنایا جا رہا تھا عاقل خان بھی اس نشانہ بازی میں ہمارے شریک تھے اتنے میں بسوں کی

رَوانگی کا اعلان ہوگیا۔ اَب جو عاقل خان نے وَاپس آکر اپنی نشست پر عاقلانہ نظر دوڑائی تو برسہابرس کا رفیق اپنا سَرپوش غائب پایا۔ اس لئے ہر ایک سے گمشدہ کی بابت استفسار کرنے لگے آخر میں محمود بھائی سے بھی اس ہیٹ کے فراق کا سوال کر بیٹھے جس پر ان جیسے سنجیدہ آدمی بھی بول اُٹھے "ارے میاں اتنے ننھے کیوں بنتے ہو جیسے کچھ پتہ ہی نہیں، تم نے جب سے لیا تھا بیچارے کو صاف تک تو کیا نہیں تھا اس لئے وہ مُنہ دھونے دَریائے کابل میں گیا ہے" یہ سُننا تھا کہ معلوم ہُوا جیسے عاقل خان کے کڑوے تیل کا تڑکا لگ گیا ہو۔ ان کا بس چلتا تو دَریا میں کُود پڑتے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس عاقل خانی ہیٹ کو نئی زندگی مِل گئی وَرنہ اس غریب کے بَدن پر سفیدی تو نام کو نہیں رَہی تھی ہر طرف میل کا لیپ کیا ہُوا تھا۔ یہ سب ماجرا دیکھ کر ہمارے بُزرگ سالارِ قافلہ آغا صاحب سے بھی خاموش نہ رَہا گیا اور بولے "بھائی ہم تو سمجھے تھے فضول ہی آگئے ہیں مگر عاقل خان تو خاصے کارآمد آدمی نکلے"۔

دوپہر ختم ہوکر سہ پہر نے چارج سنبھالنا شروع کر دیا تھا کہ ہمارے قافلے نے راستے کی سب سے بُلند چوٹی سَر کر ڈالی۔ وَہاں ہمیں جب یہ بتلایا گیا کہ ہم تقریباً ۹۰۰۰ فٹ کی بُلندی پہ براجمان ہیں تو سَردی کا احساس ہونے لگا پھر قریبی چوٹیوں پر نظر ڈالی تو انہیں سَفید پوش پایا جہاں سے برف کا شفاف پانی پگھل کر آرہا تھا جو نہایت ٹھنڈا مزیدار اور تازہ تھا چونکہ ہمارا اگلا پڑاؤ کابل تھا اس لئے سب نے موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اس یخ بستہ پانی سے مُنہ ہاتھ خوب صاف کر ڈالے۔ اللہ اللہ کر کے ہماری خستہ حال گاڑیوں نے جو ڈھلوان دیکھی تو بیریر لگائے دَوڑنے لگیں اور چند منٹ بعد ہی نیچے وادی میں کابل کی عمارات نظر آنے لگیں۔

جس وقت ہم کابل میں وارد ہوئے اس وقت شام کے ۶ بج کر ۴۵ منٹ ہوئے تھے

تھے اس طرح جیسے تیسے یہ طولانی سفر ۹ گھنٹے میں مکمل ہوا۔ اَب اس غیر معمولی تاخیر کی وَجہ سے ہمارے میزبانوں نے فیصلہ کیا کہ ہم اسی حالت میں استقبالیہ میں شریک ہوں جو جشنِ استقلال کے تمام مہمانوں کے اعزاز میں دیا جا رہا تھا کیونکہ اگر ہم قیام گاہ پر جاتے تو وقت میں اس قدر گنجائش نہ تھی کہ بعد میں اس عصرانے میں شرکت کر سکیں۔ اَلغرض اپنی ہیئت پر شرمسار ہوتے ہوئے اپنے گَرد پوش ملبوسات میں ہی مقام استقبالیہ پر پُہنچا دیئے گئے۔ یہی نہیں وَہاں پہنچ کر نہایت شاندار صوفوں کو بھی اپنی گَردِ راہ میں سے خاصا حِصّہ عنایت کر دیا۔ عصرانہ گاہ نہایت ہی پُر فضا مقام تھا، جھیل کے کنارے نہایت خوبصورت شامیانے لگے تھے چاروں طرف باوردی خدمت گار تعمیلِ حکم کے لئے بے تاب تھے۔ میزوں پر خوش رنگ پھلوں کی ایسی ایسی اقسام موجود تھیں کہ معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی ابھی خصُوصی آرڈر دے کر جنّت کے چمن سے منگائے گئے ہوں۔ ان فواکہاتِ بہشتی کے علاوہ ولایتی اشیاء یعنی کیک پیسٹریاں بسکٹ اور اس قبیل کا ہر فرد ہماری مہماں نوازی کے لئے پلیٹوں اور قابوں سے نِکلا پڑتا تھا۔ ہم جس بڑے جسمانی اور شکمی اِمتحان سے گزُر کر آ رہے تھے، اس کے بعد یہ بتانا کہ ہم نے اس شاہی مہماں نوازی کا کس کس طرح حق ادا کیا بے سُود ہے۔ غرض چائے کے چند آتشیں گھونٹوں نے ساری تکان یکسر ختم کر دی اور ہم صُوفوں میں فی الحقیقت مہمانانِ شاہ کے انداز سے براجمان ہو گئے۔ بُزرگوں نے آنکھوں ہی آنکھوں اشارہ دیا کہ اَب رُخصت ہونا چاہیئے اور ہم چلنے کے لئے اُٹھ کھڑے ہُوئے کہ آئس کریم نے راستہ روک لیا اور وہ بھی نوجوان حسیناؤں جیسے رنگ و رُوپ میں مجبوراً چلتے چلتے یہ اہم فریضہ بھی تہ دل سے ادا کرنا پڑا۔

اَلغرض جب ہم اپنی قیام گاہ حبیبیہ کالج پُہنچے تو رات کی عملداری شروع

ہوگئی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر اس وقت بس میں ہوتا تو ہم سب بغیر بستر بچھونے کا انتظار کیے فرش پر ہی لوٹ لگا لیتے لیکن ریت کے ذرات نے ہمارے گلوں میں اپنی جانہیں ایسی جکڑ کر ڈالی تھیں کہ ان سے گلوخلاصی حاصل کیے بغیر نیند کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اس لیے فوراً ہی گرم اشنان کا سلسلہ شروع ہو گیا جس سے فارغ ہوتے ہوتے گھنٹے نے رات کے نو بجا دیئے۔ استقبالیہ کے دوران بے حساب و بے وزن خوراک داخل شکم کی جا چکی تھی اس لیے ارادہ تھا کہ اب گھوڑے بیچ کر سویا جائے، لیکن چند منٹوں بعد ہماری یہ خوش فہمی رفو چکر ہوئی جب اعلان ہوا کہ "نیچے کھانا لگا دیا گیا ہے"۔ ہم سب لوگوں کا قیام پہلی منزل پر تھا جبکہ دسترخوان درازی کا سلسلہ نچلی منزل پر تھا۔ بادل ناخواستہ ہم نیچے اترے تو خیال تھا کہ یوں ہی منھ جھوٹا کر کے جلد پلٹ آئیں گے تاکہ میزبانوں کو شکایت نہ ہو، لیکن جب کھانے کے کمرے میں پہنچے تو سارے دسترخوان پر پلیٹوں میں پہلوانوں جیسے سینہ تانے مرغ محفل آرائی فرما رہے تھے۔ سچ پوچھیے تو یہ دسترخوان کیا تھا خوانِ مرغ تھا۔ بھنا ہوا مرغ۔ مرغ کے پارچے۔ مرغ کا قورمہ اور مرغ بھی مؤذن یعنی اصلی۔ کیونکہ فی زمانہ تو فارم کے مرغوں کی افراط نے اس سیدالطعام کی ذات کو نیچ قوم کا فرد بنا دیا ہے۔ نام تو مرغ کا ہی بدنام ہے جسے "انگلشیا" "کراب" "چکن" کا لقب دے دیا گیا ہے لیکن مزہ نام کو نہیں، اگر ہم سے پوچھتے ہیں تو آجکل کے انسانوں اور پرانے لوگوں میں بھی اتنا فرق ہے جتنا چکن اور اصلی مرغ میں ہوتا ہے۔ الغرض دسترخوان کی رونقیں دیکھ کر بھلا ہاتھ کیسے رک سکتا تھا اس لیے گنجائش شکم سے بڑھ کر حقِ مرغ ادا کیا اور دوسری ڈشوں پر بمشکل ہی متوجہ ہو پائے۔ یوں تو شہ دسترخوان میٹھا بھی ہمیں میٹھی میٹھی نظروں سے دعوت دست اندازی دے رہا تھا لیکن پھلوں کی دلکش و متنوع اقسام دیکھنے کے بعد ان قدرتی نعمتوں کی قدردانی اور تعریفیں کرتے رہے۔

اس شب کھانے کے بعد کب بستر جمائے اور کون کہاں سویا اس کا کسی کو ہوش نہیں البتہ صبح جب جگائے گئے تو معلوم ہوا ۲۳ جولائی کی صبح آٹھ بج چکے اور ناشتہ ہمارا منتظر ہے چنانچہ بڑی عجلت میں منھ ہاتھ دھو کر کمرۂ طعام کا رُخ کیا۔ یوں تو میزوں پر صبح کی چائے سجانے کیلئے سارے مقبول آئیٹم یعنی انڈے توس مکھن، دلیہ موجود تھے انگور، سیب، آلوچے، خوبانیاں ان پر مستزاد لیکن ناشتے کی اسی میز پر تعجب انگیز موجودگی جناب مرغ کی تھی جو ہاتھ پاؤں باندھے ہماری پذیرائی کے منتظر تھے۔ غرض کہ دستر خوان کے پہلے تین معرکے سر کرنے کے بعد یہ یقین ہو چلا کہ دراصل ہمیں کھیل کے لئے نہیں بلکہ مال کھلانے کیلئے بلایا گیا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ان مقابلوں کی اہمیت کو نظر انداز نہ کیا جائے اور اس کے ساتھ اپنے پیٹ کی گنجائش کو بھی ملحوظ رکھا جائے تاکہ کثرتِ خوراک سببِ رسوائی نہ بن جائے۔ ناشتہ تمام کرنے کے بعد سوچا گیا کہ کچھ باہر نکل کر ہوا بھی کھالی جائے لیکن بغیر رہنما یا نگراں ہمیں باہر گھومنے کی اجازت نہ تھی۔ پھر اسی روز سہ پہر اسٹیڈیم میں جشنِ استقلال کی تقریب ہونا تھی اور یہی وہ تقریب تھی جس میں ہم سب مدعو تھے جو ہر سال نہایت تزک و احتشام سے عرصہ دراز سے منائی جا رہی تھی غالباً یہاں استقلال سے مراد شاہ ظاہر شاہ کی حکومت کو مستقل بنانے اور عوام میں مقبول بنانے کی کوشش تھی، جیسے ہم خود اپنے ملک میں گزشتہ [illegible] دیکھ رہے ہیں کہ ہر نیا حکمراں اپنے اقتدار کو مستحکم اور دراز کرنے کے کھیل تماشے کیا کرتا ہے چنانچہ حکمرانوں کی اس [illegible] خود غرضانہ یا [illegible] عوام الناس یوم جمہوریت اور جشنِ آزادی کے مقدس و محترم دنوں [illegible] جوش و ولولے کا اظہار نہیں کرتے جس کی قوم کے ہر فرد سے توقع کی [illegible] گویا ان غلط روایتوں نے ہلاکو کو یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا ہے کہ یہ [illegible]

بڑے بڑوں کے لئے خوشیاں لے کر آتا ہے جو دعوتوں اور تقاریب کے انعقاد پر بے دریغ روپیہ ضائع کرتے ہیں لیکن عام لوگوں کو صرف گھروں پر جھنڈے اور جھنڈیاں لگانے کی تلقین فرمائی جاتی ہے۔

سہ پہر ہونے سے پیشتر ہی ہمارے لئے بسیں کالج کے احاطے میں آگئیں اور ہم اس وسیع و عریض سرسبز اسٹیڈیم میں پہنچا دیئے گئے جہاں پریڈ وغیرہ منعقد ہونے والی تھی۔ چاروں طرف ہرے بھرے پہاڑی ٹیلوں کے درمیان سطح مرتفع کا دور دور تک پھیلا ہوا قطعہ فرش مخمل معلوم ہو رہا تھا اور ہمیں اس سے قبل جتنے اسٹیڈیم دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا یقیناً یہ پریڈ کا مقام سب سے زیادہ پُر وقار و دلکش تھا۔ مہمان ٹیموں کی نشستوں کا بہت نمایاں جگہ انتظام تھا جہاں سے اسٹیڈیم کا حسن نظروں میں خوب خوب سما رہا تھا۔ شروع شروع میں عام مہمان اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے اس کے بعد بڑی بڑی شاندار گاڑیوں میں وزراء اور سفارت کاروں کی آمد شروع ہوئی اور سب سے آخر میں بگل بجا کر شاہ کی آمد کا اعلان کیا گیا۔ شاہ افغانستان جناب ظاہر شاہ تشریف لے آئے تو سارا میدان تالیوں سے گونج اٹھا سب نے کھڑے ہو کر شاہ کا استقبال کیا۔ افغانستان کا قومی ترانہ بجایا گیا۔ دستور کے مطابق بادشاہ نے فوجی دستوں سے سلامی لی اور مارچ پاسٹ دیکھا، اس کے بعد اپنی مخصوص نشست پر متمکن ہونے سے پیشتر جملہ مہمان ٹیموں کا شاہ سے تعارف کروایا گیا۔ کسی آزاد ملک کے سربراہ سے ہاتھ ملانے کا شرف ہم سب کو ہی پہلی مرتبہ حاصل ہو رہا تھا اور سربراہ بھی اسلامی مملکت کا' اس لئے اس موقع پر ہمیں مسرّت و انبساط کے ساتھ فخر کا بھی احساس ہو رہا تھا۔ چنانچہ جوں ہی انھوں نے ہمارا ہاتھ اپنے دستِ شاہی میں لیا، بدن میں خوشی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اب ظاہر شاہ اس اظہارِ عقیدت کے مستحق تھے یا نہ تھے یہ ایک علیحدہ بات ہے جس کا نہ ہمیں ادراک تھا اور نہ ہی اس سے کوئی

سرکار، کیونکہ ہم پر تو حُبِّ لسلامی کے جذبہ کا غلبہ تھا جس نے ہمیں یہ شادمانی عطا کی تھی، تعارف کی رسم کے بعد رنگارنگ کے عسکری کھیل تماشے شروع ہو گئے جو آجکل کے جشنِ آزادی کے معیار کے پاسنگ بھی نہ تھے لیکن ہمارے لئے یہ مظاہرہ بالکل انوکھا تھا اس لئے ہمیں پروگرام کا ہر آئیٹم بھلا لگ رہا تھا۔ اسی اثنا گھوڑوں کے کرتب دکھانے کی باری آئی تو گھڑ سواروں نے نیزہ بازی وغیرہ کے جوہر دکھانا شروع کر دیئے ایک تو گھوڑے مصوّری کا اعلیٰ شاہکار پھر اس پر قدآور و خوبرو شہسوار اس لئے یہ منظر عجب بہار دکھا رہا تھا اور ہم سب دیکھنے میں محو تھے کہ یکایک ایک سوار سر کے بل نیچے آن گرا معلوم نہیں اُسے کتنی چوٹ آئی لیکن ہم نے دیکھا کہ فوراً بادشاہ سلامت نے اپنی کار میں بیٹھ کر اس سوار کی جانب رُخ کیا اور یقیناً اس بروقت اظہارِ ہمدردی نے مضروب کے درد میں بہت کمی کر دی ہوگی لیکن اس اقدامِ شاہی نے ہمیں فرطِ حیرت میں ڈال دیا اور ہم کہ غلامِ سرکارِ برطانیہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ آزادی کے معنی کیا ہیں اور یہ کتنی بڑی نعمت ہے کہ آزاد مُلک کے ایک ادنیٰ سپاہی کی تکلیف نے ظلِ اللہ کو بے چین اور پُرسشِ احوال پر مجبور کر دیا درآنحالیکہ ہمارے مُلک ہندوستان کے لاکھوں بھائی دوسری جنگِ عظیم میں محض انگریز کی غلامی کی بدولت لڑائی کی آگ میں بھون دیئے گئے اور کسی مردود کا دل نہ پسیجا۔ اس دن ہمیں اپنی غلامی کا شدید احساس ہوا اور یہ بھی پتہ چلا کہ ایک آزاد مُلک کا شہری ہونا کتنا بڑا اعزاز ہے۔ مگر سچ پوچھئے آج جب ہم اپنے مُلک میں خود بپا کردہ خلفشار اور وطن کی شکست و ریخت کے کلمات سُنتے ہیں اور پڑھتے ہیں تو اُس دن ہونے والے احساس سے کہیں بڑھ کر صدمہ ہوتا اور دل سے دُعا نکلتی ہے کہ ربُّ العزّت جب تُو نے اپنے لُطفِ بے پایاں سے اس نعمتِ عُظمیٰ سے بہرہ ور کیا ہے تو اس کی قدر کرنے اور آزادی کا حق ادا کرنے کی ہمّت و توفیق ارزانی بھی فرما، اور خدا نہ کرے

کہ آنے والی نسلیں بے رہروی اور تغافل پیہم کی بدولت غلامی کے قعرِ مذلّت میں گر جائیں۔

جشن کی تقریبات کے موقع پر مجلّے بھی تقسیم کیے گئے جو طباعت کا بہترین نمونہ اور بہت سی تصاویر سے آراستہ تھے ہم سب خوشی خوشی یہ یادگار رسالے لئے اپنی قیام گاہ پر پہنچے تو خدا کا شکر کیا کہ سفر کا اہم ترین دن بخیر و خوبی گزرا کیونکہ وہ پہلا موقع تھا جو اعلیٰ حضرت اس طرح عوام سے ملے ہوں۔ اس سے قبل ان کے والد شاہ نادر شاہ صاحب کسی تقریب کے موقع پر قتل کئے گئے تھے اس لئے امکان تھا کہ تاریخ اپنے آپ کو نہ دُہرا دے۔ خدانخواستہ اس قسم کی کوئی واردات اگر سرزد ہو جاتی تو پھر ہمیں تو بستر گول کرنا ہی پڑ جاتا۔

جشنِ استقلال کا دوسرا روز اس لئے ہمارے لئے اہم تھا کہ اس دن ہمیں حقِ مہمانی ادا کرنا تھا یعنی اس سہ پہر کو ہمارا وہ ہاکی میچ ہونا تھا جس کے لئے ہمیں مدعو کیا گیا تھا۔ کابل میں ہاکی کا کھیل کوئی نیا نہ تھا کیونکہ افغانستان کی ہاکی ٹیم ۱۹۳۶ء میں برلن میں منعقد ہونے والے اولمپکس میں حصّہ لے چکی تھی اور اس ٹیم کی قیادت کا سہرا شہزادہ شجاع کے سر تھا جو خود فرزند علیگڑھ تھے۔ شجاع صاحب کا شاہی خاندان سے تعلق تھا اور اعلیٰ نسب ابدالی پٹھان تھے لیکن ان کی تعلیم و تربیت ابتدا ہی سے علیگڑھ میں ہوئی اسلئے ہلال اور کھجور کی چھاپ ان پر بہت گہری تھی۔ انھوں نے ۱۹۳۹ء میں علیگڑھ ہاکی ٹیم کی کپتانی بھی کی اور ہمیں ان سے علیگڑھ میں ہی نیازمندی کا شرف حاصل ہو گیا تھا پھر پاکستان میں بھی وہ شفقت فرماتے رہے اور جب کبھی کراچی تشریف لاتے تو ہمیں اپنی صحبت سے نوازنا نہیں بھولتے، ادھر چند سال سے ان کی کوئی خیریت نہیں ملی جو باعثِ تشویش ہے۔ انھوں نے فیصل آباد میں سکونت اختیار کی تھی اب خدا معلوم وہیں موجود ہیں یا

دائمی مسکن آباد کر چکے۔ شہزادہ صاحب کے متعلق ہم یہ بات بہت وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ افغان ہونے سے پہلے، ایک پکّے علیگ تھے اور انھیں اپنے شہزادہ ہونے پر اتنا ناز نہ تھا جتنا علیگ ہونے پر۔ یہ ٹیم کی بدقسمتی تھی کہ ہمارے ایسے رفیق بھائی ان دنوں کابل میں نہ تھے ورنہ حقِ رفاقت خوب خوب ادا کرتے۔

خیر تو عرض ہمیں یہ کرنا تھا کہ افغانستان میں ہاکی کا ذوق پرانا ہونے کے باوجود وہاں کا معیار واجبی تھا اسی وجہ سے کھیلوں کے منتظمِ اعلیٰ نے باتوں باتوں میں ہمارے کپتان کو اشارہ کر دیا تھا کہ کھیل اچھا ہونا چاہیئے اور ہم دونوں بھائی بھائی ٹھہرے اس لئے ہار جیت کی کوشش سے احتراز برتنا چاہیئے۔ یہ سُن لینے کے بعد مقابلے کی تو گویا رُوح ہی فنا ہو گئی اس لئے خیر سگالی بڑھانے کی پوری کوشش کی گئی اور میچ برابر رہا تاکہ آئندہ جشن کے موقع پر بھی علیگڑھ کا خیال رکھا جائے لیکن اس کے باوجود اس دورے کے بعد یہ سعادت کسی ٹیم کو نصیب نہ ہو سکی۔

میچ ختم ہونے کے بعد ضیافتوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا معلوم ہوتا تھا ٹیم ہاکی کھیلنے نہیں دعوتوں کا ٹورنامنٹ کھیلنے آئی ہے جس کا ہر میچ سابقہ میچ سے زیادہ دلچسپ و شاندار ہوتا۔ ہوتا یوں کہ علی الصباح ناشتے سے فارغ ہو کر سیر سپاٹے اور تاریخی مقامات پر لے جایا جاتا۔ دوپہر میں کسی وزیر یا شاہی خاندان کے فرد کے مہمان ہوتے۔ رات کو اس سے زیادہ با اثر امیر کے یہاں مدعو کیے جاتے۔ اس طرح مشق دسترخوان کے ساتھ ساتھ ہمیں اندرون و بیرون کابل خوب خوب گھومنے کے مواقع ملے۔ تاریخی مقامات میں شاہ ظاہر شاہ کے والد نادر شاہ کے مقبرے پر فاتحہ خوانی کی گئی۔ راستے میں آتے جاتے ایک نہایت عالیشان مغربی طرز کی عمارت پڑتی جسے غلّے کا گودام بنا دیا گیا تھا۔ اتنی عمدہ عمارت کے ساتھ یہ بدسلوکی سب کو بہت کھلتی اس لئے ہم نے اپنے گائڈ صاحب سے

اس بارے میں معلومات کرنا چاہیں تو وہ گول مول جواب دیتے رہے لیکن ہمیں اتنا مُتجسّس پاکر بالآخر انھوں نے بتایا کہ یہ شاہ اَمان اللہ خان کی تعمیر کردہ پارلیمنٹ کی طرز جدید کی عمارت تھی۔ اَب چونکہ مُلک میں شاہ امان اللہ کا نام لینا ہی جُرم ہے تو ان کی اس یادگار کو دانستہ یا سہواً یہ کمتر درجہ دے دیا گیا ہے جس سے مقصد یہ ہے کہ کہیں شکوہ عمارت سے بھی مرحوم شاہ کی تشہیر نہ ہو جائے۔ جس قوم میں اعترافِ حقیقت کا اس قدر فقدان ہو اور تعصّب یہاں تک پُہنچا ہو اس سے عصرِ حاضر کے تقاضوں کو پُورا کرنے اور ترقّی کی اُمید کیونکر رکھی جا سکتی ہے!

دعوتوں میں سَب سے زیادہ اچّھا پروگرام ہمارا صوبہ پغمان کا دورہ تھا جہاں اپستالیف کے ایک نہایت سرسبز و شاداب پھلوں سے لدے ہُوئے خوبصُورت باغ میں ہمیں کُھلا چھوڑ دیا گیا تھا۔ یہ باغ جو ریاض الجنۃ کا نمونہ معلوم ہوتا تھا حکمراں خاندان کے کسی فرد کی مِلکیت تھا وہاں پھلوں کی شادابی و اقسام دیکھ کر بعض وقت یہ محسوس ہوتا تھا کہ جیسے یہ پھل آرٹ کا نادر نمونہ ہوں یا پھر ہم تھیٹر میں کوئی سین دیکھ رہے ہوں، کبھی آلوچے کھاتے، کبھی خوبانیوں پر ہاتھ مارتے اِدھر اُدھر دوں کے عارضوں کا شباب دیکھتے تو دل لوٹ پوٹ ہو جاتا۔ سُرخ سُنہری سیبوں کی تو سج دھج ہی نرالی تھی۔ پھلوں کے اس نوروز کے موقع پر ناشپاتی البتّہ اپنی کم قدری پر شرمسار سی نظر آ رہی تھی اور یہ حقیقت ہے سب ہی اِدھر سے بے رُخی برت رہے تھے۔ عالم یہ تھا کہ ایک پھل کے درخت سے نیّت سیر ہونے نہ پاتی تھی کہ دوسرے ثمر رس دار کی ڈالی سر جُھکائے خوشہ چینی کے لئے آموجود ہوتی۔ پھلوں میں اِتنا تنوّع۔ رنگ۔ رس اور افراط تو اِنشاء اللہ جنّتی بننے کے بعد ہی ہاتھ آئے گی ورنہ اس دارالامتحان میں تو ایسا پھل گیر موقع نہ کبھی اِس سے پیشتر میسّر آیا نہ آئندہ ہی کبھی آئے۔ اِس لئے حقیقت یہ ہے کہ ہر ہر فرد اپنی جگہ ہر طرح کے تکلّف سے

کنارہ کش ہو کر پھل خوری میں مصروف تھا، لیکن پیڑوں میں پھل اسی طرح لدے ہوئے تھے، یعنی باغ پر اتنے شدید دھاوے اور پھلوں کی علی الحساب تڑائی اور چرائی کے باوجود وہاں کوئی کمی واقع نہیں ہو سکی تھی البتہ ہمارے میزبانوں نے جب ہماری حملہ آوروں جیسی کیفیت دیکھی تو انھیں ہمارے پیٹوں کی فکر لاحق ہو گئی چنانچہ نہایت نرمی سے ہمیں مشورہ دیا گیا کہ زیادہ خوری باعثِ اسہال و پیچش بھی ہو سکتی ہے۔ تاہم ہم لوگوں نے کسی نصیحت پر کان نہ دھرے اور پھلوں سے شغل جاری رکھا لیکن ابھی دسترخوانِ قدرت سے دست کش ہونے نہ پائے تھے کہ از خود ظہرانہ نمودار ہو گیا جس کے لئے گنجائش کیا ہو سکتی تھی لیکن میزبان کو شکایت کا موقع نہ دینے کی نیت سے اپنے اوپر یہ زیادتی بھی روا رکھنا پڑی۔

پچھلے دنوں افغانستان کی جنگ کے دوران جب بغان پر حملوں کی خبریں پڑھتے تھے تو ہماری نظروں میں رنگا رنگ پھلوں سے بھرے ان سرسبز باغات کا سلسلہ آجاتا تھا جنھیں بجائے بنی نوع انسان کے بارود اور آگ کے شعلے چاٹ رہے تھے۔

اس زبردست پکنک کے بعد شام کو پھر کسی وزیر صاحب کا مہمان بننا تھا اور بالعموم ہمارے ان تمام میزبانوں کا شاہی خاندان سے تعلق تھا چونکہ افغانستان میں تقریباً ساری وزارتیں ایک ہی خانوادے کو الاٹ تھیں اس حیثیت سے ہم پاکستانی قدرے بہتر ہیں جن کی صورت پر ایک نہیں بیس پچیس خاندان پچھلے پینتالیس سال سے مسلط ہیں۔ ظاہر شاہ اور ان کے کٹم سے جیسے تیسے افغانیوں کو تو نجات مل گئی لیکن اہلِ پاکستان کا ان جاگیرداروں، وڈیروں، میروں اور صنعتکاروں سے پیچھا چھوٹنے کے امکانات دور دور تک نظر نہیں آتے۔ یوں تو ہر حزبِ اختلاف کا لیڈر انقلاب کا راگ الاپتا ہے، لیکن ہر ایسے پُرفریب نعرے سے ان کا مطلب

حکومت میں تبدیلی لاکر خود مسند نشیں ہو جانا ہوتا ہے۔ ورنہ صحیح انقلاب جس دن آیا پاکستان اسی روز صحیح معنی میں پاکستان بن سکے گا۔ قومی سرمائے اور وسائل سے ارب پتی بننے والے جب تک تخت حکومت پر براجمان رہیں گے عوام مفلس سے مفلس تر ایک دوسرے سے دست و گریباں ہوتے رہیں گے۔ دیکھئے پاکستان اور پاکستان کے حقیقی مالکوں کی قسمت کب پھرتی ہے خدا وہ دن ہماری زندگی میں لائے۔

افغانستان کے اس دور کے حکمرانوں کے سلسلے پر جب ہم نے مجلہ استقلال پر نظر ڈالی تو ہر وزارت پر ایک ہی خاندان کے افراد متمکن پائے، وہاں سردار نعیم خان وزیر تعلیم تھے۔ سردار شاہ ولی خان اور سردار داؤد خان وغیرہ جنھوں نے اپنے دست مبارک سے ہی ظاہر شاہ کو ملک بدر کر دیا سب ہی اعلیٰ سے اعلیٰ وزارتوں پر قبضہ جمائے تھے۔ اب ہم اس بارے میں کچھ لکھتے ہوئے اس لئے ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں کہ سب کا نمک کھا چکے ہیں اور اچھی طرح سے کھایا ہے کیونکہ تقریباً تمام وزراء کو ہم نے شرف میزبانی دیا تھا۔ کابل شہر میں جا بجا زبوں حالی آشکار اور غربت اور پستی کے آثار ہویدا تھے لیکن جس دن عالی مرتبت حضرات کے محلوں میں جانا ہوا تو اس افلاس زدگی کے اسباب بھی نظر آئے کیونکہ ہر محل اپنی جگہ قصر شاہی سے کم نہ تھا پھر ان کی زیب و زینت جس مغربی انداز سے کی گئی تھی شاید مغربی ممالک کے وزراء کو اس کے عشر عشیر آسائشیں بھی میسّر نہ ہوں۔

بہرحال یہ حقیقت ہے کہ ہماری شہر بھر میں نہایت گرمجوشی سے پذیرائی کی گئی اور ہم ہر جگہ نئے نئے باغات نئے نئے پھل اور نئے کھانوں سے متعارف ہوئے جیسا کہ بیان کیا جا چکا۔ ہماری وہاں موجودگی کے دوران ہزاروں مرغوں کا قتل عام زور شور سے جاری تھا اس لئے دل چاہتا تھا کہ کسی دن اس سے پرہیز کیا جائے لیکن اتنا موقع دینے کو کوئی آمادہ نہ تھا۔ چنانچہ ایک ضیافت میں جب میز دسترخوان

کو یکسر غیر حاضر پایا تو سب نے اطمینان کا سانس لیا اور کھانا بھی کچھ توجّہ سے کھایا گیا جس کے بعد شاہ دَستر خوان یعنی میٹھے کی باری آئی جو چاولوں کی شکل میں قابوں میں موجود تھا لیکن جیسے ہی قاب میں چمچہ ڈالا گیا تو چاولوں کا لبادہ اوڑھے ہر قاب میں ایک نو عُمر مُرغِ مسلّم موجود پایا اس لئے دَورانِ قیام کوشش اور آرزو کے باوجود مُرغ کا ناغہ نہ ہو سکا۔ ان تمام ضیافتوں میں کھانے کے بعد پھلوں کا بھی خاص اہتمام ہوتا تھا چُنانچہ وَہاں چند انگوروں کی ایسی قسمیں کھائیں جو اس سے پیشتر کبھی دیکھی تک نہ تھیں ایک مرتبہ انگور ایسے کھائے جس کی ایک ہی ڈالی میں ایک خوشہ بڑے انگور اور دوسرا چھوٹے چھوٹے انگوروں کا تھا، پھر ایک شیریں تر جبکہ دوسرے میں مٹھاس کے ساتھ خوش ذائقہ کھٹاس بھی شامل تھی۔ مَزے سے قطع نظر ان خوشوں کا حُسن ایسا جاذب نظر تھا کہ دل چاہتا تھا کہ ان کو دیکھتے رہیں اور ہم اگر مُصوّر ہوتے یقیناً ایسے مُنفرد نمونہ فطرت کے شایانِ شان مُرقّع تیار کرتے۔ میزبانوں سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ وَہاں انگوروں کی کئی سو اقسام ہوتی ہیں۔ اسی طرح سَردے کی ایک انوکھی قِسم کھانے کا بھی اتّفاق ہُوا۔ ان دنوں گرمایا تو معرضِ وجود میں نہیں آیا تھا یا خاندانی قرابت کے سبب اس کا شمار بھی سَردے ہی میں کیا جاتا تھا۔ پاکستان قائم ہونے سے پیشتر تو ہم سَردے کی ایک ہی نسل و رنگ سے متعارف تھے لیکن کابل کی ضیافتوں میں ایسے سَردے بھی دیکھے جو اندر سے زَرد یا بادامی تھے ذائقہ میں ہر پھل دُوسرے سے زیادہ لذیذ لیکن لذّت میں اس تمام کنبے پر سبقت لے جانے والی سردے کی ایسی قسم تھی جو اندر سے سبز تھی جو نہایت خوش رَنگ ہونے کے علاوہ انتہائی خوش ذائقہ بھی تھی۔ سچ پوچھئے تو سرداوں کے اس سردار کے درشن کابل کے بعد پھر کہیں نصیب نہ ہُوئے، حتّٰی کہ پاکستان جیسی پیداوار اور درآمد کے لحاظ سے پھلوں کی بڑی منڈی میں بھی کوشش کے باوجود اس

سردۂ سبز سے ملاقات نہ ہو سکی۔ اب ممکن ہے ایوانہائے معلّٰی میں جہاں ہماری پہنچ نہیں ہو پاتی اس کی رسائی ہو تو اور بات ہے۔

صبح شام دعوتوں یا مرغ خوری کے مقابلوں کا حال رقم کیا جا چکا۔ کابل کے قرب و جوار کے باغات پر ہاکی ٹیم کے ہلّہ بولنے کی رپورٹ بھی بے کم و کاست پیش کی جا چکی اب آخر میں اُس ضیافت کا ذکر ہو جائے جو قیام کابل کا آخری عشائیہ تھا، جس میں نہ مرغوں کی بھرمار تھی نہ پھلوں کے انبار اس کے باوجود وہ اپنی جگہ ایک یادگار سب سے مزے دار دعوت تھی اس لئے اسے خاتم الدعوات لکھا جائے تو مناسب ہوگا۔ یہ ضیافت ہندوستان کے کمرشل اتاشی ممتاز حسن قزلباش صاحب کے دولت کدہ پر دی گئی تھی۔ قزلباش صاحب خود جنید علیگ تھے اور ان کے دو صاحبزادگان اس زمانہ میں ہمارے ہم عصر تھے اس لئے وہ اپنے علیگ بھائیوں کی جتنی بھی مدارات کرتے کم تھا اور یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے اس خوش گوار فریضے کی ادائیگی میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ اوّل تو آٹھ دس روز سے پھیکا سیٹھا کھانے کے بعد جب ہر چ مسالوں اور کیوڑے الائچی کی لپٹیں آئیں تو معدوں سے اہلاً و سہلاً کی صدائیں بلند ہونے لگیں اور آنتوں نے پذیرائی کے لئے خود ہی پٹ کھول دیئے، پھر سب سے بڑھ کر یہاں کا ماحول بالکل گھر جیسا۔ اس لئے پوری ٹیم نے لقمہ بازی کے خوب خوب جوہر دکھائے حتیٰ کہ ہمارے نگران محترم آغا محمد اکرم صاحب اس دستر خوانی مقابلے میں کسی سے پیٹے نہیں پائے گئے۔ کھانے کے درمیان بڑے رسیلے اور کٹیلے جملے بھی چل رہے تھے، کیونکہ اس سے پیشتر تو میزبانوں کی محفل میں دل کھول کر تعریف کرنے کا بھی موقع نہیں میسّر آسکا اور بے زبانی کے باعث اپنے جذبات کا زیادہ تر اظہار اشاروں یا کچّی پکّی فارسی میں کرتے رہے۔ طعام کی جملہ شقیں جب تمام ہوئیں تو آموں کے طشت دستر خوان پر اترنا شروع ہو گئے۔

اَب سچّی بات ہے کہ سَاری دُنیا کے پھلوں کی خوبیاں اَور ذائقے کی لطافت اپنی جگہ لیکن جو بات اپنے دیس کے لنگڑوں میں دستیاب ہے وہ بدیسی سالم ٹانگوں والے پھلوں میں بھی میسّر نہیں، اور "لنگڑا" تو اس عظیم ثمر کے خاندان کا ادنیٰ فرد ہے اس لئے شکم سیر ہوتے ہوئے بھی سب ندیدوں کی طرح آموں کو لپٹ پڑے اور یہ سین دیکھ کر ہمارے شفیق قزلباش صاحب کو کہنا پڑا کہ "اَب اندازہ ہُوا کہ واقعی یہ علیگڑھ کی ٹیم ہے، وَرنہ کھانے کی میز پر تو کھلاڑی اناڑی کی تمیز نہیں ہو رہی تھی"۔ ضیافت کا جب یہ اہم ترین کورس مکمّل ہُوا اور ہم فاتح ٹیم کی طرح اپنی نشستوں پر متمکن ہُوئے کہ لال لال جامے میں ملبُوس بَرگ سبز کی تشریف آگئی۔ ہرے بھرے پانوں کا پردیس میں پہلی مرتبہ دیدار ہُوا اس لئے نظر ملتے ہی دل اندر سے باغ باغ ہوگیا اور حد تو یہ ہے کہ بھائی جانڈی خان بھی جو پان کے قدر شناس نہیں اس موقع پر مُنھ لال کئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس طرح قزلباش صاحب نے گھر سے رُخصت کرنے سے پہلے پُوری ٹیم کو سُرخرُو بنا کر بھیجا۔ ایسا سُرخ کہ ابھی تک لبوں پہ اس لالی کا نمودنہ ہوتے ہوئے احساس باقی ہے۔

معمولاتِ روزانہ یعنی سَیر سپاٹا عصرانہ ظہرانہ وغیرہ سے جب بھی جتنا وقت بھی ملتا ہم شہر میں گھومنے چلے جاتے اور کابل کی سَیر کا لُطف اُٹھاتے۔ اس زمانے میں کابل ایک چھوٹا سا مگر بارونق شہر تھا۔ خال خال نئی عمارتیں سَربلندی کیلئے کوشاں تھیں مگر چاروں طرف قدیم طرز کے مکانات میں گھری ہُوئی تھیں، ترقی کے آثار دُور دُور نہ تھے البتہ جتنی آسائشیں تزئینات تھیں وہ وزراء اور شاہی خاندان کے محلوں میں بہت فراوانی سے تھیں۔ شہر میں چائے خانوں میں بیٹھنے کا رواج عام تھا لیکن ہر ہوٹل پر اس کے نام کے علاوہ وہاں گانے والے مُغنّی اور ساز بجانے والے کا نام جلی حروف میں بورڈ پہ تحریر ہوتا۔ مثلاً ساز و آواز اُستاد گل بادشاہ خان

وغیرہ۔ عام بول چال کی زبان شیخ سعدی کی فارسی تھی جسے سُن کر کانوں میں رَس گھُلنے لگتا۔ ہم نے سوچا کیوں نہ اس عرصۂ قیام میں اس علم کی تجدید کی جائے جو دس بارہ سال کی عُمر تک بہت محنت سے حاصل کیا تھا لیکن بعد میں سب بُھلا دیا۔ لامحالہ دو تین روز کی توجّہ اور مشق کی بدولت ہم کام چلاؤ فارسی بولنے لگے اور موقع محل سے ٹیم کے مُترجّم کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اس کی وجہ ایک یہ مجبوری تھی کہ اہلِ کابل خصوصاً اُمرا و حُکّام فارسی کے علاوہ فرانسیسی زبان سمجھتے تھے اس لئے انگریزی کی دال بالکل نہیں گلتی تھی۔ ہماری دیکھا دیکھی تمام ساتھیوں نے فارسی پر مظالم ڈھانا شروع کر دیئے۔ چُنانچہ اس زمانے کا جُملہ جو کابل کے سفر کے برسوں بعد زبان زَد رہا، ہمیں اس وقت بھی یاد آ گیا۔ ہم چار پانچ دوست ٹہلتے ٹہلتے ایک سینما پر پہنچے سوچا کابل میں فلم بینی کا تجربہ حاصل کیا جائے۔ یہاں یہ بتاتے چلیں کہ کابل میں بیشتر ہندوستانی فلمیں چل رہی تھیں۔ یہی نہیں اکثر ہوٹلوں پر سہگل اور خورشید بیگم کانن بالا وغیرہ کے مشہور ریکارڈ بڑے زور سے بجائے جاتے اور کابلی جوان جب اپنے لہجے میں اُنہیں گانا شروع کرتے تو کچھ اور ہی لُطف آتا۔ تو خیر شدّتِ ذوق میں ہم سینما کے ٹکٹ گھر کے اندر پہنچ گئے۔ اس وقت شو شروع ہونے میں غالباً کئی گھنٹے تھے اس لئے ٹکٹ گھر بھی سونا تھا۔ ہمارے بھائی اظہر خان پر اس وقت فارسی بولنے کا کچھ اس قدر غلبہ ہُوا کہ وہ ٹکٹ فروش سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے "شما ٹکٹ کُدام ایشو ہو ہیست؟" جس سے موصوف کا مقصد یہ تھا کہ آپ ٹکٹ کس وقت جاری کریں گے، اتنا سُن کر بیچارہ افغانی تو ہماری فارسی دانی پر ہکّا بکّا رہ گیا لیکن جب ہم سب لوگوں کے قہقہے بلند ہُوئے تو اس نے بھی سر دُھننا شروع کر دیا۔ غرض اس قسم کے پُرلُطف واقعات ہر روز ہوتے رہتے تھے جس پر ایک دُوسرے کی کھچائی کی جاتی۔ لیکن ان ادھوری کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ محض دس بارہ دن کی مُدّتِ قیام

میں ہر شخص فارسی کا کوئی نہ کوئی ٹکڑا بولنے کا اہل نہیں تو دعوے دار ضرور بن گیا۔
کابل کے باشندے مذموم کابلی پٹھانوں کی ضد تھے نہایت خلیق اور ہر دم آمادہ بہ
تواضع نظر آتے تھے، اس غیر معمولی پذیرائی کی شاید ایک وجہ یہ بھی ہو کہ اہلِ کابل
علیگڑھ کے نام اور علیگڑھ والوں کی خدمت سے کسی حد تک متعارف تھے علاوہ ازیں
ہم شاہی مہمان تو تھے ہی اس لئے ہر چھوٹا ہو یا بڑا ہمیں خوش رکھنے کی کوشش
کرتا۔ البتہ ہمارے اندازوں کے بالکل برعکس کابل کے باشندگان کے ڈیل ڈول
درمیانی اور رنگت بھی میلی گندمی تھی جس کو دیکھ کر ہمیں خاصی مایوسی ہوئی کیونکہ اس
سے پیشتر ہمارے ذہنوں میں جو افاغنہ کا تصوّر تھا وہ نہایت قوی ہیکل و مشیّن سرخ
سپید چہروں والے انسانوں کا تھا اور پشاور سے روانہ ہو کر دوران سفر جہاں
کہیں بھی پٹھان حضرات سے ملاقات ہوئی انھیں اپنی اس خیالی تصویر کا مکمل
نمونہ پایا۔ نہایت خوبرو دراز قامت تندرست و توانا لوگ جن کے ڈاڑھیوں سے
مرصع چہروں نے ان کی شخصیتوں کو زیادہ بارعب و معتبر بنا دیا تھا۔ پھر کابل میں
ہی معلوم ہوا کہ دارالسلطنت کے شمال، جنوب ہر طرف صحیح الشکل پٹھان بستے ہیں
اور فطرت نے صرف کابلیوں کی ساخت کے معاملے میں ڈنڈی ماردی ہے۔ اب
اس بارے میں ہم کیا منھ شکافی کریں۔ البتہ یہاں اتنا لکھتے چلیں کہ اگر ہمارے اسلاف
کو ایسے کم رو کابل والوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا تو انھیں اصلی پٹھان تسلیم کرنے میں
تامّل ہوتا۔

ہم کابل میں کوئی دس روز رہے لیکن تعجب ہے کہ اس دوران کسی خاتون
کا دیدار نہ ہو سکا اس قحط النسائے سے ہمارے رومان پسند ساتھی خاصے مایوس نظر
آتے تھے عورتوں کے عدم دیدار کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں کابل میں پردے
کا سختی سے اہتمام کیا جاتا تھا گرچہ خواتین مغربی پہناوے اسکرٹ میں ملبوس ہوتیں

لیکن پاؤں تک لمبی لمبی جُرّابوں سے ڈھکے رہتے۔ اس لئے کسی لڑکی کی شکل وصورت دیکھنا تو درکنار اس کے ناخن بھی بمشکل نظر آتے تھے۔ مگر "چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے کہاں جا سکتا ہے" اس لئے حامد خاں کو بازار میں یا سیر راہے کہیں رقیع پوشوں کا جتھا نظر آتا تو وہ ہوائی پوز مارے بغیر نہیں رہتے تھے۔

ٹیم خواہ کرکٹ کی ہو یا ہاکی کی لیکن ہر ٹور کے دوران تاش سے ضرور شغل کیا جاتا تھا لیکن ان کھیلوں میں پیسے کا لین دین تفریح کی حد تک ہوتا۔ پیسے کمانے کی نیت سے نہیں البتہ دوران کھیل اکثر جھک جھک بک بک بھی ہوتی جاتی جو اس کھیل کا خاصہ ہے اس لئے قابلِ غور نہیں۔ چنانچہ کابل میں بھی دن رات میں جب کبھی موقع ملتا یار لوگ پالی جما لیتے۔ ہمارے ٹور کے ساتھیوں میں جانڈی خان اور بھائی حامد کے علاوہ ڈاکٹر خالد مرحوم بھی پتّوں کے رسیا تھے یہ تینوں جب فرش پر بیٹھ کر تاش کی گڈی پھانٹ کر پتّوں کی آواز نکالنا شروع کرتے تو ادھورے شائقین از خود اُڑ کر بساط پر اُتر آتے بعض لوگ محض دیکھ دیکھ کر مشورہ دینے سے ہی مزے لوٹتے رہتے۔ آپس میں تھوڑا بہت قرض اُدھار بھی چلتا رہتا ہے، سُنا ہے کسی دن بھائی حامد صاحب پر مار پڑی تو انھیں قرض لینا پڑ گیا جو انھوں نے عاقل خان سے یہ کہہ کر لیا کہ ابھی بازی برابر ہوئی تو دیئے دیتا ہوں۔ اب معلوم نہیں حامد خاں کی سیدھ پڑی یا نہیں البتہ رقم کی واپسی میں دو تین روز لگ گئے! اب بیچارے عاقل خان جیسے نحیف قلب کو اتنی سہار کہاں، وہ بلبلاتے ہوئے ہر ایک کے پاس جاتے اور مدد کے طالب ہوتے کہ کسی طرح ان کی رقم واپس کروائی جائے۔ یوں آجکل کے لحاظ سے تو پانچ روپیہ ایک حقیر تر رقم ہے لیکن ۱۹۴۵ء کے پانچ روپیہ بلاشبہ دو سو روپیہ کا بل رکھتے تھے اور وہ بھی زمانہ طالب علمی میں، اس لئے عاقل خان کے لئے یہ صدمہ ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا تھا انھوں نے ہم سے بھی کئی بار رجوع کیا

لیکن ہم نے ان کو تسلّی دلاسہ دینے پر ہی اکتفا کیا۔ اِتّفاق سے ایک دن ہم بھی تاش بازوں کی سیر دیکھ رہے تھے اس وقت ہمارے یار حامد خان، پیہم ہارتے جا رہے تھے۔ ان شکستوں نے ان کے گالوں کو گلابی اور مزاج کھسیانہ کر دیا تھا ہم نے جب دیکھا کہ جھنجھلاہٹ اپنے شباب پر ہے تو سوچا کیوں نہ موقع سے فائدہ اُٹھا کر کچھ ایکسٹو ٹی کری جائے چنانچہ جا کر عاقل خان کو مشورہ دیا "بھیک کب تک مانگتے رہو گے اس وقت حامد جیت رہا ہے جا کر اپنے پانچ روپیہ لے لو" یہ سُنتے ہی عاقل خان سود خور پٹھان کی طرح تاش کی پالی میں پہنچ گئے اور دھرنا دے کر گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ ابتدا میں تو عاقل خان نے 'میاؤں میاؤں' کے لہجے میں تقاضے کیے جس کا جواب حامد خان نے خاؤں خاؤں کر کے دیا جس کی وجہ سے عاقل خان دھپ ہو گئے۔ بہت دیر کے بعد کہیں جا کر ایک ہاتھ اللہ اللہ کر کے حامد خان کو بھی جیتنا نصیب ہوا۔ ابھی وہ بڑے انہماک سے بورڈ کے پیسے سمیٹنے میں مصروف تھے کہ اسی اثنا میں عاقل خان نے چٹکی مار کر پانچ کا نوٹ یہ کہہ کر اُٹھا لیا کہ "یار اتنا جیت رہے ہو پھر بھی میرا قرض واپس نہیں کرو گے؟" حامد خان تو مسلسل ہار کے سبب یوں ہی تاؤ کھائے بیٹھے تھے انھوں نے جو یہ جارحانہ حملہ دیکھا تو بیتاب ہو گئے اور آناً فاناً عاقل خان کو چت کر دیا اور جب تک احباب بیچ بچاؤ کروائیں دو ایک ہلکے پھلکے اسٹروک بھی ٹکا دیئے۔ اب عاقل خان جتنے ہاتھ پاؤں کے ڈھیلے ڈھالے تھے اس سے زیادہ دل کے بودے، وہ بیچارے ہاتھ پھڑ پھڑاتے ہی رہ گئے۔ ادھر حامد خان لڑاکا تو نہ تھے لیکن جسامت کے اعتبار سے بہت گٹھے ہوئے تھے اس لیے بیچارے عاقل خان بغیر رقم وصولے چیختے پیٹتے وہاں سے سیدھے اپنے کمرے میں گئے۔ ظہارِ تعزیت کے لیے ہم بھی ان کے ساتھ ہو لیے کیونکہ عاقل خان کے اس انجام سے ہم بھی بے خبر تھے۔ کمرے میں پہنچ کر عاقل خان نے اپنا بکس کھولا اور کچھ نکالنا چاہا

ہم نے موقع کی نزاکت کو تاڑ لیا اور ان سے مل کر کھڑے رہے اور جیسے ہی انھوں نے ایک آبدار چھُری نکالی ہم نے ان کا ہاتھ مضبوطی سے اس اہتمام سے تھام لیا کہ چھُری کا کنٹرول ہمارے ہاتھ میں رہا۔ اس غیظ و غضب میں بھرے عاقل خان کو لئے ہم تاش گاہ میں پہنچے تو چھُری دیکھ کر سب حیرت زدہ رہ گئے۔ اس چھُری کے سہارے عاقل خان خُوب گرجے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ دو چار کو ڈھیر کئے بغیر نہیں رہیں گے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کچھ ڈرامہ انھوں نے عزّت سادات بحال کرنے کے لئے کیا تھا اِس لئے ہمارے تھپکنے سے رفتہ رفتہ نرم پڑتے گئے اور پھر چھُری بھی ہمیں سونپ دی۔ اس واقعہ کے بعد پانچ رُوپیہ تو عاقل خان کو بیشک واپس مل گئے لیکن طرفین بلکہ ساری ٹیم والے اس منظر کو آج تک فراموش نہ کر سکے چُنانچہ بیسوں سال گزرنے کے بعد بھی کہیں یار لوگ حامد خان اور عاقل خان کو یکجا دیکھتے تو تقاضا کر دیتے کہ "بھائی حامد خان اَب تو عاقل خان کے پانچ روپئے واپس کر دیئے ہوتے؟"

کابل میں مٹرگشت تو اچھی طرح کی لیکن اس دوران کوئی قابلِ توجّہ آئیٹم نظر نہیں پڑا اس لئے خریداری کا موڈ ہی نہیں بنا لیکن شاید خداوند کریم کو یہ کسر بھی پُوری کروانی تھی جو واپسی سے ایک دن قبل ایک میزبان دوست خبر لائے کہ سرکاری اسٹورز میں رُوس سے پہلی مرتبہ مال آیا ہے اور بطور مہمان آپ کو وہاں پر خریداری کی اجازت بھی ہے اس مژدۂ جانفزا کا سُننا تھا کہ دوپہر میں ہی دوڑے دوڑے سب اسٹور پر پہنچ گئے۔ جہاں متعدّد آئیٹمز مثلاً کاسمیٹکس، بجلی کا سامان، تمباکو، سگار، پائپ وغیرہ کے علاوہ عام توجّہ کا آئیٹم انواع و اقسام کا ریشمی کپڑا تھا چُونکہ جنگ عظیم ثانی شروع ہونے کے بعد سے اہلِ ہند اس قسم کے کپڑے کو دیکھنے کو ترس گئے تھے یہاں تک کہ ہندوستان میں تیار کردہ مال سے بھی ہندوستانی محروم

کر دیئے گئے تھے اور شادی بیاہ بغیر ریشمی ملبوسات کے ہو رہے تھے اس لئے یہ کپڑا یوں بھی مناسب معلوم ہوا کہ روسیوں نے افغانوں کو اپنے دام میں پھنسانے کے لئے قیمتیں بھی واجبی رکھی تھیں اس لئے جیبوں کی گنجائش کے مطابق سب نے ان پارچہ جات کی خریداری کر ڈالی اس طرح گھروں کے واپسی کے وقت ساکھ بحال ہونے کا سامان ہو گیا ورنہ سب یہی کہتے کہ اتنی دور گئے اور ڈنڈے بجا کر خالی ہاتھ لوٹ آئے۔ وہاں کسی کو کہاں اعتبار ہوتا کہ افغانستان عالمی جنگ میں مبتلا نہ ہوتے ہوئے بھی ہم اہل ہند سے زیادہ غربت و افلاس کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے اور وہاں خرید و فروخت کے لئے ماحول سازگار کہاں۔

الغرض خدا کا شکر ہے کہ کابل کی مدتِ قیام کسی افتاد و واردات کے بغیر گزری بلکہ خوب خوب گزری۔ دن رات میں جب ہمیں کوئی کام کرنے کو نہیں ہوتا تو فارسی میں حرف زنی کی مشقیں شروع کر دیتے جس کا ہدف ایک بڑا خوش مزاج نوعمر لڑکا تھا جو مہمانوں کے جوتوں پر پالش کرنے پر معمور تھا اور ہنسی خوشی اپنا کام انجام دیتا اس لئے ہم لوگ بطور سلوک یا اجرت نہیں، ازراہ خلوص اس کو کچھ نہ کچھ دیتے رہتے۔ بول چال کی مشقیں ہم دوسرے لوگوں پر بھی دن بھر کیا کرتے جو ہماری ہر طرح کی دیکھ بھال پر متعین تھے۔ چنانچہ اس بے تکلفانہ میل جول سے چند روز میں ہی ایسا معلوم ہونے لگا تھا کہ نہ جانے کب سے ہم سب اسی طرح اکٹھے رہتے چلے آئے ہیں۔ ویسے تو پردیس میں دو چار دن کے بعد دل اکتانا شروع ہو جاتا ہے لیکن کابل کا عشرۂ قیام پلک جھپکتے ہی گزر گیا اور بالآخر ۲ اگست کی صبح دم رخصت جب آیا تو ہر ایک سینے پر ایک بوجھ محسوس کر رہا تھا۔ جدائی کا بوجھ خلوص و محبت کا بوجھ خاطر و مدارات کا بوجھ حسن سلوک کا بوجھ۔ ہر آنکھ بھری ہوئی تھی لیکن جب ہماری بس کالج کے احاطے سے نکلنے کے لئے اسٹارٹ ہوئی تو ہمارے

نوجوان افغان رفیق نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا اور محبت کے اس معصومانہ اظہار سے سب کی آنکھوں سے آنسو چھلک اُٹھے۔ اشکوں کے اس سیل کے پیچھے وہ محبت کارفرما تھی جو فطرت نے روزِ اوّل سے ہر انسان کو ودیعت کی ہے جسے رُوحِ انسانیت کے علاوہ کسی اور نام سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ آج دُنیا میں یہ جذبہ ہی مفقود ہے جب ابرِ نیساں ہی نہیں تو گہر کہاں پیدا ہو سکتے ہیں اِس لئے انسانیت کی جگہ انسان کُشی کا دَور دورہ ہے اس پر لُطف یہ کہ دُنیا میں بڑے سے بڑا بھیانک ظلم انسانیت کے نام پر انسانوں پر کیا جا رہا ہے اور سارا عالم خاموش تماشائی ہے اور ایسا یقین ہو چلا ہے کہ انسانیت دُنیا ہی سے اُٹھ گئی ہے۔

صُبح صبح کابل سے سفرِ مراجعت کا آغاز ہُوا اور نہایت اطمینان سے ایک آدھ جگہ قیام کیا ورنہ برق رفتاری سے سفر جاری رہا، مسافت وہی مگر اس مرتبہ ڈھلوان کا سفر تھا اور پھر گاڑیاں بھی اچھی حالت میں تھیں اس لئے ہم شام تک پشاور پہنچ گئے لیکن سچ پوچھئے تو تمام راستے 'کابل' کی خوش گوار یادوں میں ایسے گُم سم رہے کہ سفر کی طوالت تک کا پتہ نہ چلا۔ گرچہ ہم سب اپنے وطن اپنے گھروں کی طرف رَواں تھے لیکن محسوس ہوتا تھا کہ ہم کوئی قیمتی شے کابل میں بھول آئے ہیں جس کی تلاش پھر ایک نہ ایک دِن ہمیں وہاں لے جائے گی۔

اہلِ افغانستان اپنے ہر مہمان کی اسی معیار کی مہماں نوازی کرتے ہیں یا یہ فضیلت محض شاہی مہمانوں کو حاصل ہے اِس کے بارے میں تو ہم کچھ نہیں کہہ سکتے البتہ اتنا ضرور ہے کہ اِس غیر معمولی تواضع میں علیگڑھ کے نام کی برکت کو بھی دخل تھا اور شاید امیر حبیب اللہ خان والی افغانستان کی علیگڑھ میں غیر معمولی پذیرائی کے کچھ نہ کچھ اثرات اس سرزمین میں اس وقت تک موجود ہوں۔

—·)·>·(※)·<·(·—

www.taemeernews.com

الیکشن بازی کی روئیں

منجملہ تمام مختلف النوع قدیم وجدید روایات کے علیگڑھ میں یونیورسٹی یونین کے سالانہ انتخابات کی روایت نہایت منفرد مؤثر اور شاندار ہے جو نہ صرف قابلِ دید بلکہ لائقِ تقلید ہے۔ ہم نے گاؤں کی پنچایت کی سطح سے لے کر قومی اسمبلی اور سینیٹ کے انتخابات مختلف اوقات میں متعدد مقامات پر لڑتے لڑاتے دیکھے اور اب تو عمر کی سرحد اتنی قریب آن لگی ہے کہ 'چناؤ' کی کوئی نئی شکل شاید ہی مشاہدہ میں آئے لیکن اپنے ساٹھ سالہ مشاہدات کی بنا پر یہ بات ہم وثوق سے لکھ سکتے ہیں کہ الیکشن لڑانے کے انداز میں علیگڑھ میں طلبا یونین کے انتخابات میں جو شائستگی، ہنرمندی، ذہانت، ظرافت، خوش اسلوبی اور سب سے بڑھ کر دیانت داری جو روزِ اوّل سے رائج ہے وہ ہم نے کہیں اور نہیں دیکھی نہ سنی اور اب تو دورِ جدید میں بے ایمانیوں کی ایجاد و ناانصافیوں کی بہتات کی وجوہ سے آئندہ اس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ گرچہ ہر الیکشن کی فصل کی بوائی سے قبل ہر امیدوار اور اس کے الیکشن گسار اور ملک کے ضلعی سطح سے لے کر اعلیٰ ترین منصب دار کا ایک ہی نعرہ ہوتا ہے یعنی انتخابات آزادانہ، غیر جانبدارانہ اور منصفانہ ہوں گے۔ حالانکہ صرف 'منصفانہ' طریقہ ہی اپنا لیا جائے تو وہی از خود الیکشن کو غیر جانبدارانہ اور آزادانہ بنانے کے لئے کافی ہے۔ لیکن فصل کی کٹائی کے بعد شکست خوردوں کی طرف سے ایک ہنگامہ بپا

ہوتا ہے۔ ایک مُلک گیر شور بپا کیا جاتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ دَورانِ انتخابات جس پیمانے کی بے ایمانیوں اور بدعنوانیوں کا مظاہرہ کیا گیا اس کی مثال نہ صرف پاکستان بلکہ دُنیا کے کسی مُلک میں نہیں ملتی اور پھر یہ کورس دوسری فصل کے شروع ہونے تک بشرطِ اِس کی نوبت آجائے، پورے زور شور سے جاری رہتا ہے، یعنی حزبِ اختلاف کی ہر تقریب اور تقریب کی ہر تقریر کی ابتدا الیکشن کی مُبیّنہ دھاندلیوں سے کی جاتی ہے اب یہ نہیں معلوم کہ انتخابات میں ہارنے والے اپنی نجی تقریبات یعنی شادی بیاہ جیسے مواقع پر بھی بسم اللہ کی جگہ الیکشن کی بے ایمانیوں سے تقریب کا آغاز کرتے ہیں یا نہیں۔ بہرحال اب پاکستان میں الیکشن گزرے دو سال سے زائد گزرے لیکن چھوٹا ہو یا بڑا سمجھدار ہو یا فاترالعقل ہوا باز ہو یا حُقّے باز ہر ہزیمت خوردہ لیڈر کی زبان پر الیکشن کی بدعنوانیوں کا چرچا ہے اور اُمید ہے کہ یہ مشغلۂ الزام تراشی اگلے چناؤ کی فصل پھلنے تک چلتا رہے گا۔

نہ ہے نصیب، تعلیم کے اس عظیم گڑھ میں جب ہماری رسائی ہوئی تو اس وقت تک ہم الیکشن اور اس کی لذات سے قطعاً ناآشنا تھے۔ ہم ٹھہرے ازلی کھیلوں کے رسیا اس لئے وہاں جاکر تعلیم سے بھی زیادہ ہم کھیلوں کی جستجو میں لگے رہے، تقریباً چھ ماہ گزرنے کے بعد رُت نے انگڑائی لی اور ماہ جنوری میں دیکھتے دیکھتے یونیورسٹی کا سارا مطلع الیکشن آلود ہوگیا۔ ہم ساحل پر بیٹھے بیٹھے اس طوفان سے لُطف اندوز ہونا چاہتے تھے کہ ہمارے سینئر کوکب صاحب مرحوم نے مشورہ دیا کہ ہم بھی انتخابی ہنگاموں میں فعال حصّہ لیں جو علیگڑھ کی زندگی کا ایک اہم جُزو ہے۔ یہی نہیں وہ ہمیں اپنے ساتھ نائب صدارت کے ایک اُمیدوار عزیز الرحمن صاحب کے کیمپ میں لے گئے جو آفتاب ہوسٹل میں واقع تھا وہاں پہنچ کر تو دُنیا ہی عجب نظر آئی دو تین کمروں میں فرش بچھے ہیں، پوسٹر پمفلٹ اور کارڈوں کے انبار لگے ہیں

تیس چالیس لڑکے جمع ہیں اور ہر لمحے بعد کچھ ٹولیاں جا رہی ہیں کچھ واپس آ رہی ہیں، بڑی رونق لگی ہوئی ہے۔ ہم ٹھہرے بڑے رنگروٹ اس لئے مبتدیوں کے ساتھ لیکچر سننے ایک کمرے میں جمع کئے گئے وہاں ہمارے اُمیدوار کے تعلیمی ریکارڈ اور تحریری و تقریری کارناموں پر روشنی ڈالی گئی پھر ایک ایک شق پر بحث کی گئی، اس کے ساتھ ہی متوقع اعتراضات کے جوابات سمجھائے گئے اور ضروری لٹریچر فراہم کیا گیا اور ایک تجربہ کار سینئر کی سرکردگی میں ہمیں ایک دُوسرے ہوسٹل کی مُہم پر رَوانہ کر دیا گیا۔ یہاں ہم یہ بیان کرتے چلیں کہ علیگڑھ کے اِنتخابات کا اِنحصار خالصتاً اُمیدواروں کی صلاحیتوں پر ہوتا تھا یعنی وہاں کی صدسالہ تاریخ میں شاذ ہی کبھی ایسا ہُوا ہو کہ کوئی اوسط سمجھ بوجھ رکھنے والا یا کوئی کھلاڑی یا مختار آزاد اپنے تعلّقات اور ہر دلعزیزی کی بنا پر الیکشن میں کامیاب ہو سکا بلکہ جہاں تک نائب صدر جوائن دنوں یونین کا اعلیٰ ترین منصب تھا، سکریٹری، لائبریرین وغیرہ کے اُمیدواروں کے پاس مطلوبہ استعداد اور تجربہ نہ ہو کوئی ایرا غیرا اِنتخابات کے میدان میں قدم رکھنے کی نیّت بھی نہیں کرتا تھا۔ اس لئے وہاں کے مقابلے ذات برادری یا کسی اور عصبیت کی بُنیاد پر کبھی نہیں لڑائے جاتے تھے بلکہ اُمیدواروں کا بہترین تعلیمی ریکارڈ، تقریری مقابلوں میں کامیابیاں، اور ان کی تصنیفات وغیرہ کو مدِّ نظر رکھا جاتا تھا اس لئے ہر اُمیدوار کے پمفلٹ میں اس کی کارکردگیاں درج ہوتی تھیں اور محض یوں ہی نہیں بلکہ ان کا مُعجّل ثبوت بھی عند الطلب پیش کرنا پڑتا تھا۔ الیکشن کیمپ میں یونیورسٹی کے سارے ہوسٹلوں کے نقشہ جات اس تفصیل کے ساتھ موجود ہوتے کہ کس ہوسٹل میں کون رہتا ہے؟ اس کے عادات و خصائل کیا ہیں؟ اس کے یار دوست کون ہیں۔ مخالف گروپ کے لوگ کن کمروں میں رہتے ہیں؟ کس قسم کے سوالات کرتے ہیں؟ وہ کون سے کمرے ہیں جہاں صرف مزہ لوٹنے کے لئے لڑکے اکٹھے

ہوتے ہیں ؟ کس کا مطلب محض تفریح لینا ہوتا ہے ؟ اور ایسے لڑکے کن کمروں میں ہیں جن کی ڈیوٹی یہ ہے کہ اپنے مخالف کارکنوں کا زیادہ سے زیادہ وقت ضائع کیا جائے ؟ چنانچہ ہمیں تاکید کی گئی بلاوجہ بحث میں کسی سے نہ اُلجھیں اور صبر و تحمّل سے کام لیتے ہوئے سخت ترین مُعترضانہ حملوں سے مشتعل نہ ہوں بلکہ دلائل کے ذریعے انہیں قائل کرنے کی کوشش کریں۔ ہم جب آفتاب ہوسٹل کیمپ سے نکلے تو روانہ ہونے سے پہلے ایک دَور گرما گرم چائے کا ہُوا۔ سردی سخت تھی۔ ہَوا بھی خوب خوب آنکھیں دکھا رہی تھی اس لئے احترام موسم کی وَجہ سے ہوسٹلوں کے کمرے بند تھے لیکن اِنتخابی ٹولیوں کی آمد و رفت سے ہوسٹل کے برآمدوں اور صحنوں میں ہر طرف رونق اور چہل پہل تھی۔ ہمارے لیڈر نے نہایت شائستگی سے ایک کمرے پر دستک دی ادھر اندر سے شائستہ آواز آئی "تشریف لائیے" ہم نے داخل ہو کر مؤدب سلام علیک کی اس کا جواب وصول کیا۔ بیٹھنے کو کہا گیا۔ ہمارے لیڈر نے عرض مدعا کیا۔ لٹریچر حوالے کیا اور آئندہ زحمت مزید کی بشارت دے کر رُخصت ہوئے۔ دراصل ہمارے گروپ کا یہ پہلا بلّہ تھا اس لئے بعض کمروں میں بیٹھنے تک کی نوبت نہ آئی۔ اس طرح سارے ہوسٹل کے ہر کمرے میں جا کر ہم نے اپنے اُمیدوار کا تعارف کروایا پمفلٹ اور کارڈ وغیرہ تقسیم کرنے کے بعد ہم کوئی ڈھائی تین گھنٹے بعد جب مرکز پر لوٹے تو یہاں ہم سے مختلف سوالات کئے گئے مثلاً کن کمروں میں پذیرائی ہوئی کہاں سرد مہری پائی گئی ؟ اور کہاں سے مخالفت کی چِرانڈ آئی ؟ الیکشن دفتر میں بیٹھنے والے صاحب نے تمام معلومات باقاعدہ نوٹ کیں۔ اس کے بعد نمک پاروں اور چائے سے توانائی بحال کرنے کے بعد ہماری زندگی کی سب سے پہلی الیکشن مہم اور انوکھے تجربے کا اختتام ہُوا۔

اگلے دن شام کو کھانا کھا کر ہم پھر ڈیوٹی پر پہنچ گئے۔ اس شب دوسرے

محاذ پر روانہ کئے گئے جہاں ہمارے اُمیدوار کا لٹریچر پہلے پہنچا دیا گیا تھا اور اب یہاں سے بحث و دلائل کا باب شروع ہوا جس کمرے میں گئے، رائے دہندگان سوالات کرنے کے موڈ میں پائے گئے جو دلچسپ بھی ہوتے اور فضول بھی مثلاً "اچھا صاحب۔ یہ بی اے میں فرسٹ پوزیشن تو آئی لیکن اس میں پانچ سال کیوں لگے؟ بی اے کی جگہ بی اے آنرز کیوں نہیں کیا؟ ایم اے میں یہ مضمون کیوں لیا؟ ان کے والد پروفیسر ہیں انھوں نے تو آپ کو نہیں بھیجا ہے؟ یہ تقریر تو کر لیتے ہیں لیکن حاضرین پر کنٹرول نہیں کر سکتے۔ یہ اتنے ڈھیروں انعامات انھوں نے جیتے، پہلی پوزیشن بھی حاصل کی، اب یہ نائب صدر کیوں بننا چاہتے ہیں؟ آخر کسی اور کا بھی حق ہے! ان کی قابلیت میں تو کلام نہیں مگر اتنی پُر وقار کرسی پر بیٹھتے ہوئے چڑونٹا (چڑا) لگیں گے آپ کا کیا خیال ہے؟ ان کی آواز میں نسوانیت ہے۔ انگریزی تو بول لیتے ہیں لیکن اُردو کی تقریر کون کرے گا؟ انھیں تو ایک شعر بھی یاد نہیں۔

اَب آپ اندازہ لگا لیجئے کہ ایسے انوکھے سوالات کا جواب دینا اور وہ بھی ہنس ہنس کر کتنا دشوار گزار مرحلہ ہوتا تھا مگر جناب یہ سب کچھ تو انتخابی مہم کے نصاب کا جزو تھا جس کے لئے سب کو آمادہ کیا جاتا تھا۔ ہمارا دوسرا دورہ کافی ہوشربا تھا لیکن ہر چکر کے بعد ہماری دلچسپیوں میں بجائے کمی کے اضافہ ہو رہا تھا اور وابستگیاں روز افزوں تھیں۔ دوسرے مرحلے سے بخیر و خوبی گزر کر ٹھکانے پر واپس پہنچے تو وہی چائے، نمک پاروں کا دَور چل رہا تھا۔ ان مُہمات کے سربراہ بہت ماہر سینئر ہُوا کرتے تھے جو در اصل شب و روز غریق الیکشن رہتے۔ ان کی بیشتر سگریٹ اور چائے پر گزر ہوتی۔ اپنی جیب کے سگریٹ ختم ہو جاتے تو بیڑیوں پر اُتر آتے۔ فی الحقیقت ان بیچاروں کو ٹھیک سے کھانا کھانے کی مہلت بھی مشکل سے میسّر آتی تھی کیونکہ ان بزرگوں کا اوڑھنا، بچھونا، کھانا پینا سب کچھ الیکشن ہی ہُوا کرتا۔ پولنگ کا دن جُوں جُوں

قریب آتا جاتا اِنتخاب کی مُہم زور پکڑتی جاتی اندازوں سے نتائج کے گراف بنائے جاتے جو لحظہ بہ لحظہ گھٹتے بڑھتے، جس کے ساتھ الیکشن کے کرتا دھرتا سینئر حضرات کے دلوں کی دھڑکنیں بھی گاہے مدھم گاہے تیز ہوتی رہتیں اور سچّی بات تو یہ ہے کہ دوڑ بھاگ کے علاوہ اکثر تنہائی میں کامیابی کے لئے ہم بھی بہت پلیج پلیج کے دُعائیں کیا کرتے۔ الغرض مسلسل چار پانچ شب ہوٹل نوردی کے بعد الیکشن کی رات آجاتی اس وقت تک تمام اُمیدوار اپنی اِنتخابی مُہم مکمّل کر چکے ہوتے لیکن یہ شب بہت فتنہ انگیز ہوتی ہے کیونکہ کمزور اُمیدوار اس رات میں اوچھے وار کرنے سے گریز نہیں کرتے یعنی غلط بیانی سے کام لے کر سراسر بے بُنیاد کہانیاں گھڑ کر سارے میں پھیلانے کی کوشش کرتے اس کے علاوہ پُراسرار طریقے سے رات میں بڑے بڑے پوسٹر لگانے کی کوشش کی جاتی اور اتّہامات سے پُر اِشتہارات تقسیم کئے جاتے، اور یہ دھماکہ خیز کارروائی ایسے وقت سے کی جاتی کہ اُس کے بعد مخالفین کو تردیدی بیان دینے یا کارروائی کرنے کی مہلت نہ مل سکے۔ لہٰذا کارکنوں کو دفاعی اقدامات کے لئے بہت چوکنّا رہنا پڑتا یہاں تک کہ بسا اوقات مچھّر دانی کے ڈنڈے لے کر پہرہ دیا جاتا کہ مخالفین کو ایسی حرکات سے جنھیں ANTI WORK کہا جاتا ہے باز رکھا جا سکے۔ اس عالم میں اگر کوئی شر انگیز گرفتار کر لیا جاتا تو اُس کا مُنھ کالا کر دیا جاتا یا کوئی اور سزا دے کر مُعاف کر دیا جاتا تھا۔ الغرض دیکھتے دیکھتے یہ چند دن ایسے گزر جاتے کہ پتہ بھی نہیں چلتا۔ گو کہ ہر روز سہ پہر ہوتے ہی سب پر الیکشن کا بھوت سوار ہو جاتا لیکن دن میں کلاسوں میں حاضری برابر رہتی البتہ وہاں بھی کارڈوں اور پمفلٹوں کی تقسیم کا سلسلہ جاری رہتا۔ مخالف دوستوں پر فقرے چست کئے جاتے اور ہر ایک اپنے اُمیدوار کو ہی سب سے بہتر ثابت کرنے کی کوشش کرتا اور فتح کی یقینی پیشگوئی

کرتا۔ شبِ انتخاب میں کنوینسنگ کا سلسلہ آخری مرحلہ میں داخل ہو جاتا اور تمام اُمیدوار اپنے مخالفین کو رام کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے۔ بالعموم یونیورسٹی بھر میں ریجگا منایا جاتا اور الیکشن کیمپوں میں چہل پہل اور گہما گہمی کے مناظر واقعی قابلِ دید ہوتے جہاں پریشانی، سراسیمگی، اطمینان، مسرت، بے چینی کی ملی جلی سی کیفیات دیکھنے کو ملتیں۔ ان سالانہ اِنتخابات میں یونین کے عہدیدار بننے کے خواہشمند یعنی نائب صدر، سکریٹری، لائبریرین حضرات کو تو باقاعدہ محاذ بنا کر الیکشن لڑانا پڑتے اور آپس میں اُمیدوار سمجھوتے بھی کرتے تھے لیکن بیچارے کیبنٹ ممبری کے اُمیدوار یہ ساری مہم خود یا اپنے ایک آدھ قریبی دوست کے سہارے سر کرنے کا عزم کرتے۔ بڑے عہدوں کے لئے اندرونی طور پر پینل از خود بن جاتے گو کہ بظاہر کسی پینل کا اعلان نہیں کیا جاتا۔ الیکشن کی پولنگ چالیس کی دہائی تک تو یونین کی عمارت یعنی 'رامپور حامد ہال' میں ہی ہوتی جو فضیلت اَب بھی اِسی عمارت کو حاصل ہے۔ اس 'ہال' کو پہنچنے والی ہر سڑک بالخصوص اور یونیورسٹی کی تمام شاہراہوں پر طرح طرح کے بینر آویزاں ہوتے۔ حامد ہال کو تو گویا پوسٹروں کا لباس ہی پہنا دیا جاتا۔ الیکشن خوشگوار ماحول میں ہوتے۔ کلاشنکوف کی پیدائش سے پیشتر کا زمانہ تھا لیکن ہم نے کبھی لاٹھی ڈنڈے بھی استعمال ہوتے نہیں دیکھے بلکہ کوئی الیکشن کار مسلح نہیں ہوتا۔ پولنگ کے بعد ہار جیت کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہو جاتا۔ ووٹوں کی گنتی تقریباً دس گیارہ بجے رات تک مکمل ہو کر نتائج کا اعلان ہوتا لیکن اس باقاعدہ اعلان سے قبل شکست خوردگان کے خاص خاص کارندوں کی تجہیز و تکفین کا بندوبست کیا جاتا مگر ایسے تمام حضرات کا گریجویٹ ہونا شرط تھی یعنی یہ بھی ایک اعزاز تھا جس کا ہر ایک مستحق نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ان سینئرز کی شان میں نوحے اور مرثیے لکھے جاتے

اور فتح و شکست کی اِطلاع ملتے ہی جنازہ بردار جلوس نعرے لگاتا نوحے پڑھتا، ناکام ہونے والوں کے کیمپوں کا رُخ کرتا جہاں چیف کارکن صاحب کو بڑے احترام سے باہر لاکر کھڑا کیا جاتا۔ ان سے اظہارِ ہمدردی کیا جاتا رونا دھونا ہوتا مزاحیہ اشعار اور مرثیے سُنائے جاتے، الغرض صبح تک جشنِ الیکشن یا مرگِ مخالفین منایا جاتا۔

علیگڑھ کے الیکشن کا باب تشنہ معلوم ہوگا اگر اس میں HUMOROUS PROPOSALS (مزاحیہ تجاویز) کا تذکرہ نہ رقم کیا جائے جن میں الیکشن سے قبل مشاہدات پر مبنی صدارت وغیرہ کے عہدوں کے لئے مزاحیہ طور سے چند نام تجویز کئے جاتے تھے اور اپنے اُمیدوار کی تعریف یا ہجو میں کچھ چبھتے ہوئے اشعار کے ساتھ نام بھی دیئے جاتے تھے۔ یہ تجاویز باقاعدہ سربمہر لفافوں میں محرّک اور تائید کنندہ کے دستخطوں کے بعد یونین میں جمع کروائی جاتی تھیں اور پھر الیکشن سے قبل رات میں بھرے جلسے میں ان کو لفظ بہ لفظ پڑھا جاتا تھا۔ اس دوران خوب خوب فقرے بازیاں ہوتیں پھبتیاں کسی جاتیں جس سے سارا ہال سیر حاصل لُطف اندوز ہوتا۔ یہاں اتنا عرض کر دیا جائے کہ ایسی تجاویز میں بالعموم یونیورسٹی کے سینئر اور جانے پہچانے طالب علموں کو ہدف بنایا جاتا لیکن ان کا اصلی نام پوشیدہ رکھا جاتا تاکہ لڑکے خود نتیجہ اخذ کر کے محظوظ ہوں۔

ذیل میں ہم ۱۹۳۵ء کی تجاویز سے اقتباسات قارئین کی تفنن طبع اور نسلِ نو کے تجدید ذوق کے لئے درج کر رہے ہیں۔

جناب سکریٹری صاحب تسلیم

میں مندرجہ ذیل اصحاب کے نام یونین کی وزارت کے لئے پیش کرتا ہوں اور ساتھ ہی ان کا تعارف اور عہدہ جس کے لئے وہ موزوں ہیں درج کرتا ہوں۔

برائے وائس پریزیڈنٹ :۔ "پاپائے حرم"۔ میرے صنم کے چہرے پہ چیچک کے داغ ہیں۔
کہیں کالا نوا خورشیدِ محشر بھی نہ ہو جائے بہا ہے پھیل کر کاجل مری تمام جدائی کا

برائے سکریٹری "مالیکول" :۔

نہ تو بھولن ہے نہ سوجن ہے نہ آماس ہے یہ
چشمِ بد دُور کہ بھیّا کا بدن دُوہرا ہے

برائے لائبریرین :۔ "نورِ چشم راحتِ جان ارنا بھینسا"

ڈاڑھی مُنڈائی سَر لَبسر مونچھیں بڑھائیں اس قدر
ناک میں مُرغی کا پَر آدھا اِدھر آدھا اُدھر

ممبران کیبنٹ کمیٹی :۔ "سینئر مہارانی آف دی ٹینس کلب"

صُورتیا جا کی متوالی پتلی کمریا عُمریا بالی
زاغ کی چونچ میں انگورِ خدا کی قدرت پہلوئے حور میں لنگورِ خدا کی قدرت

"بمبئی سے آنے والے سے خطاب"

فتنہ پرداز دغا باز فسوں گر عیّار ہائے افسوس دل آیا بھی تو آیا کس پر

"کمسن نازنین آف میکڈانلڈ"

کمسنی ہے تو ضدیں بھی ہیں نرالی ان کی اس پہ مچلے ہیں کہ ہم زخمِ جگر دیکھیں گے
خیر ہو یارب نو مشق ہے ناوک فگن میرا دُور ہے دل کا نشانہ اور پہلا تیر ہے
سبزۂ خط نے گھٹا دی تیرے عارض کی بہار تھا جو لالے کا چمن کھیت ہے اب دھانوں کا

"بلوچی پہلوان اپنی اہلیہ سے"

میں تھا جواں تو ترا کمسنی کا عالم تھا اب تو جوان ہے تو مرا عالم شباب نہیں

اس طرح ہفتوں پہلے شروع ہونے والے الیکشن کا آتش فشاں نتیجہ کالا وا نکلنے کے بعد سرد پڑ جاتا اور پھر طلبا حسبِ معمول درس و تدریس کی سرگرمیوں میں

از سرِ نو منہمک ہو جاتے۔

اِن انتخابات کی کچھ خصوصیات ہیں۔ اوّلاً یہ کہ کوئی بھی فریق جعلی ووٹ بھگتانے کا پروگرام نہیں بناتا، یوں تو دس بیس غلط ووٹ پڑ جاتے ہوں گے لیکن اِس کا اِمکان کم ہوتا۔ ہر ووٹر کی شناخت واضح تھی کیونکہ وہاں جو ووٹر تھا وہ ووٹر شناس بھی تھا، ثانیاً یہ کہ ایّام الیکشن کی ناخوشگواریاں قطعاً "ڈیرپا" نہیں ہوتیں اور ناگوار حادثات کو یکسر فراموش کر دیا جاتا پھر نئی کابینہ کی حلف برداری کے بعد یونین کی جملہ کارروائیوں اور تقریبات میں سارے فریق بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے اور آئندہ انتخابات کی فصلِ بہار میں پہلے سے زیادہ شدّ و مد سے الیکشن لڑنے لڑانے کا عزم نو کرتے۔

—•>•(※)•<•—

ایکٹویٹی (احوال شرارت)

اقامتی زندگی بغیر چھیڑ چھاڑ کے یقیناً بڑی سونی اور سپاٹ ہوتی کیونکہ شوخی و شرارت کے بغیر نونہالوں کے لئے ہوسٹلوں میں قیام دُوبھر ہو جاتا۔ علیگڑھ میں اِن شرارتوں کو بھی ACTIVITY کا نام دے کر ایک دلچسپ نصاب مقرر کر لیا گیا تھا جن کی مختلف اقسام وہاں نافذ تھیں۔ یہ بیشتر شائستگی کے دائرے میں ہوتیں لیکن جب بربنائے مخاصمت یا انتقام کی جاتیں تو تمام دائروں سے تجاوز کر جاتیں۔ ان کا پُرلطف پہلو یہ تھا کہ مُہذب طریقے سے کبھی اُستاد شاگرد پر کبھی شاگرد اُستاد پر ایکٹویٹی کر گزرتے جس کے بعد دونوں اس سے مزہ لیتے۔ مثلاً ایک مرتبہ ٹیوٹوریل کلاس میں ایک نئے پروفیسر صاحب کو آنے میں کچھ تاخیر واقع ہونے کا خدشہ تھا، یہ بات کسی ایک شاگرد کو معلوم ہو گئی جو کئی ہفتوں سے ہوم وَرک کے واجبات ادا نہ کر پائے تھے۔ انھوں نے نہایت سوکھا مُنھ بنا کر اہل جماعت کو پروفیسر صاحب کی اچانک علالت کی خبر سُنا دی، بلکہ سب کو مزاج پُرسی کا مشورہ بھی عنایت کیا جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ پروفیسر صاحب کلاس پہنچے تو کلاس برخاست ہو چکی تھی مگر بورڈ پر لکھا تھا "ایکٹویٹی کے لئے معافی کے خواستگار طلبائے جماعت فلاں"۔ اسی طرح دوست کے والد صاحب کو تار بھیج دیا گیا کہ اِمتحان کی کاپیوں کے لئے فیس کی ضرورت ہے لہٰذا پچاس رُوپے بھیج دیئے

جائیں اِس زمانے کے والدین محبّت کے مارے ہوتے تھے پھر سینکڑوں میل دُور ایسی وارداتوں کی تفتیش بھی کیونکر ممکن تھی اس لئے چار و نا چار مطلوبہ رقم بھیج دیتے۔ صاحبزادہ صاحب کو جب رقم ملتی تو انھیں سمجھا دیا جاتا کہ ایکٹیوٹی کرنی ہے، لیکن ادھیا میں تمہیں بھی شریک کئے لیتے ہیں۔ بعض شریر اپنے کم خواندہ بُزرگوں سے لاگ ٹیبل (LOG TABLE) کے لئے خصوصی رقم منگواتے جیسے یہ بھی کوئی ڈائننگ ٹیبل قسم کی شے ہو۔

ایک دُوسرے کا کھانا، یا حلوے وغیرہ کھا جانا تو ایکٹیوٹی کی ادنیٰ قسم تھی وَہاں تو کبھی کبھی بطور تفریح لوگ پرہیزی کھانا بھی کھا جاتے، اور کلاسز سے محض آرام کے لئے بطور ایکٹیوٹی شفاخانہ میں بھی براجمان ہو جاتے۔ وہ تو بُزرگوں کا یہ بڑا دانشمندانہ فیصلہ تھا کہ شفاخانے میں کوئی خاتون نرس نہ تھی اور جملہ فرائضِ محبوبانہ ایک مولینا انجام دیا کرتے تھے جو اپنی فنّی مہارت کی وجہ سے مولینا ENEMA (انیما) کے نام سے مشہور تھے۔

ایک مرتبہ ہمارے ایک مَعروف پیش رو بُزرگ کو نئی سوجھی، انھوں نے ڈائننگ ہال کی میزوں سے سیڑھی بنا کر راتوں رات ایک اونٹ کو ہوسٹل کی چھت پر چڑھا دیا اور میزیں موقع واردات سے ہٹا دیں۔ اَب صبح جو وارڈن صاحب اور لڑکے آئے تو شتر سر بام دیکھ کر حیران رہ گئے۔ وارڈن صاحب اسی پریشانی میں مُبتلا تھے کہ آخر یہ اونٹ چھت پر کیسے پہنچا؟ بالآخر عفو تقصیر کی یقین دہانی کے بعد ایک صاحب نے ایکٹیوٹی کا اعتراف کیا۔ بالعموم اس شُتری شرارت کو شریروں کے سرخیل مسعود نامی سے منسُوب کیا جاتا ہے۔ شرارت دَرجہ دوم میں پلنگ اُلٹ دینا، مچھر دانی غائب کر دینا، سوتے بندوں پر ٹھنڈا پانی ڈال دینا وغیرہ شامل تھیں۔ بعض تخریب پسند کتاب دُشمن پڑھائی کے زمانے

میں ہوسٹل کا 'فیوز' اُڑا کر ہی لُطف لیا کرتے۔ بڑی ایکٹوِیٹی کی ایک شریفانہ قسم یہ تھی کہ خوابِ غفلت میں پڑے ہوئے حریف پر آدھی رات کو شبخون مارا جاتا یعنی محوِ خواب پر ٹھنڈے پانی کا مٹکا پھوڑا جاتا۔ جن میں مٹکا برداری کی ہمّت و صلاحیّت نہ ہوتی وہ صُراحیاں پھوڑ کر ہی یہ فریضہ ادا کر بھاگتے۔ بعض عاشق مزاج پانی میں چنبیلی یا گلاب کی پتیاں بھی شامل کر لیتے مگر بدترین دشمنوں کو سزا دینے کے لئے سادہ یا مُعطّر پانی کی جگہ غلیظ، بدرنگ اور بدبُودار آمیزہ استعمال کیا جاتا! لیکن حقیقی معنی میں ایکٹوِیٹی وہ ہوتی جو سب سے سینئر اور جُنادری لڑکوں پر کی جاتی جس کا مقصد ان کی شُہرت کو زک لگانا ہوتا چُنانچہ اس ذیل کی ایکٹوِیٹیاں پُرخطر بھی ہوتیں اور ان میں فنّی کمال کی بھی بہت ضرورت ہوتی۔ رات کی تاریکی میں دشمن کے کمرے پر جا کر عقبی کمرے کے دروازے کو باہر سڑک سے کھٹکھٹایا جاتا اور جُوں ہی عالمِ نیم خوابی یا لاپروائی میں صاحبِ کمرہ دروازہ کھولتا اس پر غلیظ پانی اور کیچڑ سے بھری ہوئی بالٹی یا برتن لوٹ دیا جاتا۔ یہاں یہ بیان کر دیا جائے کہ اس کارروائی کے لئے غلاظتوں کا خاص مکسچر بکوشش تیار کیا جاتا جس کی بدبُو کمروں میں ہفتوں باقی رہتی اب چونکہ اس دروازہ میں پیچھے سلاخیں ہوتیں یعنی آمدورفت اس سے ممکن نہ تھی اس لئے غلاظت کا شکار بننے والا کمرے میں ہی محصور رہ جاتا کیونکہ اگر وہ ہوسٹل کے بڑے دروازے سے باہر جاتا بھی تو حملہ آوروں کو پھر کہاں پا سکتا تھا۔

بعض کم ہمّت صرف کمرہ میں ہی کیچڑ پھینکنے پر اکتفا کرتے جس سے تعفّن پھیلتا اور ان کے مخالف کی ساری یونیورسٹی میں بدنامی ہو جاتی جو ان کا مقصد تھا۔ تاہم اس شبخون میں انتہائی مہارت اور عجلت درکار ہوتی کیونکہ پکڑے جانے کی شکل میں اتنی درگت بنا دی جاتی جس کی کوئی اپیل نہ تھی اور پھر یونیورسٹی سے اخراج کے

امکانات بھی تو تھے۔ ہر دور میں عام طور سے ایکٹویٹی کے دو ایک ماہرین ہُوا کرتے تھے جو فی سبیل دوستی یا اظہارِ فنکاری کی خاطر یہ کارنامہ انجام دیا کرتے تھے۔ ویسے تو جائے واردات سے ملزم کے فرار کے بعد کسی کو حتمی طور سے مجرم نہیں کہا جا سکتا تھا، لیکن بوجھ بجھکڑ قسم کے لوگ فوراً بتلا دیا کرتے تھے کہ اس طرح کی ایکٹویٹی کرنے کی فلاں فلاں سے ہی توقع کی جا سکتی ہے۔ ایسی ہی ایک نہایت کامیاب ایکٹویٹی کا کارنامہ مجاہد دکن قاسم رضوی صاحب نے بھی انجام دیا تھا۔ بہرحال ایک ایکٹویٹی کے ساری یونیورسٹی میں مہینوں چرچے رہا کرتے اور اس کا نشانہ بننے والے اپنی جگہ محجوب محجوب سے نظر آتے۔ چنانچہ اس ایکٹویٹی کے نسخے کے ذریعے حد سے زیادہ سینئر بننے والوں یا جھوٹی شان بنانے والوں کا علاج کیا جاتا جو اصلاح حال کے لئے اکسیر ثابت ہوتا۔

علیگڑھ میں طرح طرح کی شرارتوں کا ایک طویل سلسلہ ہے جو قرونِ اوّل سے تا امروز جاری و ساری ہے۔ عنوان اور کردار البتہ بدلتے رہتے ہیں جن سے دلچسپیوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ وہاں پر اس قسم کی شرارتیں بربنائے مخاصمت ہی نہیں کی جاتیں کیونکہ اس معاملے میں دوستوں کی بھی رعایت نہیں کی جاتی بلکہ بعض شریر لڑکے اُستادوں کو بھی معاف نہیں کرتے تھے اور سب سے مزے کی بات یہ کہ اُستاد بھی اُستاد پر چوٹ کر گزرتے۔ علیگڑھ میں یہ ایک قدیم رواج تھا کہ 'اذان' کی آواز سنتے ہی تقریر یا شعر گوئی کا سلسلہ فوراً بند کر دیا جاتا تھا۔ چنانچہ تقریر کے دوران اگر کسی لڑکے نے آواز لگا دی 'اذان' تو مقرر صاحب کو معاً رک جانا پڑتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک بڑے جیّد اولڈ بوائے تشریف لائے ہوئے تھے ان کی تقریر کی باری آئی تو رات کے دس بج چکے تھے۔ وہ خطابت کے کمالات دکھا رہے تھے اور سامعین ہمہ تن گوش تھے کہ اچانک کسی سمت سے آواز

آئی' اذان' یہ سُن کر موصوف احتراماً ٹھہر گئے لیکن دو منٹ گزرنے کے بعد اُنھیں شاید خیال آیا کہ یہ وقت اذان کا کہاں اور اس بارے میں انھوں نے اسٹیج سکریٹری سے وضاحت چاہی تو ایک دم ہال سے "ہوگئی ہوگئی" کی صدائیں بلند ہوئیں تو یہ بھی ایکٹیویٹی کا ایک انداز تھا جس سے اس کے محرک اور ہدف یکساں لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ کیا خوب یاد آیا، لیجئے اب ایک نمونہ بڑوں کی شوخیوں کا بھی ملاحظہ کیجئے۔ دوسری جنگِ عظیم شباب پر تھی۔ دیگر محکموں کی طرح بے چارے ہندوستانی بھی گوروں کی اس لڑائی کا ایندھن بن رہے تھے اور صبح و شام اسپیشل ٹرینوں اور پانی کے جہازوں کے ذریعے جوان نسل کو بارود کی شعلوں کی نذر کیا جا رہا تھا یہی نہیں ہندوستان سے اجناس اور اشیائے صرف کی بہت بڑی مقدار فوجوں کے استعمال میں آجانے کی وجہ سے ملک کو غذائی قلت کا سامنا تھا گورے صاحب نے اس نازک وقت میں اپنی مخصوص حکمتِ عملی سے کام لیتے ہوئے "فوجیوں کے لئے گیہوں اور شہریوں کے لئے گھوڑوں کی خوراک" یعنی چنوں کو راشن میں شامل کر دیا۔ اس لئے گیہوں چنی کے آٹے پر سب گزارا کرنے پر مجبور ہو گئے، ان دنوں علیگڑھ میں ڈاکٹر سر ضیاء الدین صاحب وائس چانسلر تھے جن کو سفر ہو یا حضر ہمیشہ اپنی یونیورسٹی کی ہی فکر لگی رہتی تھی۔ یہاں تک کہ یونیورسٹی کے معاملات میں آسانیاں پیدا کرنے اور مراعات کے حصول کی نیت سے انھوں نے اعزازی لیفٹننٹ کرنل بننا بھی منظور کر لیا تھا۔ وہ جس شہر میں جاتے کوئی میٹنگ ہو یا سیمینار اپنی محبوبہ یونیورسٹی کے لئے طرح طرح کے تحائف لئے لوٹتے۔ ان کے اس 'جگاڑ' سے کال کے ایام میں بھی یونیورسٹی کے گودام گیہوں شکر وغیرہ سے بھرے رہتے اور ایک غلّے پر کیا انھیں جہاں سے کاغذ ملتا لے لیتے، جہاں کپڑا سلا یا بغیر سلا ارزاں ملتا وہ بھی حاصل

کر لیتے حتیٰ کہ پرانے ہوائی جہاز تک نہیں چھوڑتے۔ یہی وجہ ہے کہ علیگڑھ میڈیکل کالج کے قیام کے دوران ڈاکٹر صاحب کا لایا ہوا سارا سامان کام آیا بلکہ اب بھی آرہا ہے۔ لامحالہ ڈاکٹر صاحب کے ہوتے یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد کو اپنی روزمرہ کی ضروریات حاصل کرنے کیلئے دشواریوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا کیونکہ یہ سارا بوجھ ڈاکٹر صاحب اپنے کاندھوں پر لئے رہتے۔ اتنا کچھ انتظام کرنے کے باوجود جب ۱۹۴۴ء میں گیہوں کی شدید کمی واقع ہوئی اور چنے کی آمیزش ناگزیر ہوگئی تو علیگڑھ میں بھی بہت مختصر عرصے "گیہوں چنی" کی روٹی پکنے لگی جسے لڑکوں نے تزکیۂ معدہ کا مشن سمجھ کر کھانا شروع کر دیا۔ یونیورسٹی میں انہی دنوں ایک نیا ہوسٹل تعمیر ہوا تھا جس میں لڑکے بھی سب نئے نئے تھے اور اتفاق یا بدقسمتی سے وہاں وارڈن صاحب نہ صرف شریف الطبع و ہمدرد بلکہ انتہائی شرمیلے تعینات کئے گئے۔ اب لڑکوں کو ان سے بہتر ہدف 'تنگ' کرنے کے لئے کہاں ملتا' جبکہ ان کے درمیان کوئی 'گھاگ' یعنی سینئر تک موجود نہ تھا' ایک دن روٹی معمول سے کچھ زیادہ کلوئی پک گئی' بس کیا تھا لڑکوں نے بہانہ بنا کر ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا اور کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔ اب ڈاکٹر صاحب یا تو ادھر سے گزر رہے تھے یا کسی مخبر نے انھیں یہ اطلاع پہنچا دی لہٰذا وہ اچانک اپنی کار سے اُدھر آدھمکے۔ لڑکوں نے انہیں بہت ادب سے اپنی شکایات سنائیں۔ جلی سے جلی روٹی کی رونمائی کرائی گئی۔ ڈاکٹر صاحب انکی ہاں میں ہاں ملاتے اور افسوس کا اظہار کرتے رہے' پھر باورچی خانہ کے ملازمین کو سخت سست کہا۔ نوجوان وارڈن صاحب یہ سارا ڈرامہ ششدر دیکھتے رہے آخر میں ڈاکٹر صاحب نے لڑکوں کو رام کرنے کے لئے داؤں چلانے کے لئے کہا "آئندہ سے ایسی روٹی انھیں نہیں دی جائے۔ لیکن اس وقت صبر کر کے کھا لیجئے"۔

لڑکوں نے یہ سُنتے ہی ڈاکٹر صاحب زندہ باد کے نعرے لگا دیئے۔ اوّل تو وائس چانسلر کا وہاں پہنچنا ہی اہل ہوسٹل کی بہت بڑی کامیابی تھی چہ جائیکہ ڈاکٹر صاحب کا مثبت اعلان۔ ڈاکٹر صاحب کو رُخصت کرنے کے لئے وارڈن صاحب کار تک ان کے ساتھ ساتھ گئے اور وہاں موقع پر علیٰحدگی میں اپنی پریشانی کا اس طرح اظہار کیا "جناب یہ گیہوں چنی کا آٹا تو جناب کے حُکم سے ساری یونیورسٹی میں پکایا اور کھلایا جا رہا ہے۔ اَب میں کس طرح کل سے انھیں صرف گیہوں کی روٹی دے سکوں گا" یہ سُن کر ڈاکٹر صاحب نہایت اطمینان سے وارڈن صاحب سے مخاطب ہو کر بولے "لیکن میں نے اس متعلق آپ سے تو کچھ نہیں کہا؟" اور اتنا کہہ کر رُخصت ہو گئے۔ اب وارڈن صاحب بیچارے یہ جواب سُن کر مزید حیرانی و پریشانی میں مُبتلا کھڑے تھے کہ اتنے میں ان کے ہی کسی ساتھی نے بشارت دی "بھائی خواہ مخواہ کس سوچ میں پڑ گئے پتہ بھی ہے ڈاکٹر صاحب تم پر ایکٹویٹی کر گئے"

یہ ذکر تو وائس چانسلر صاحب کی شوخ مزاجی کا پڑھا لیکن علیگڑھ کے لڑکے موقع و محل سے اپنے محترم و شفیق بزرگوں پر ایکٹویٹی کرنے سے نہیں چُوکتے تھے چنانچہ ۱۹۵۲ء کا ذکر ہے جب پہلی مرتبہ یونین کے منتخب وائس پریسیڈنٹ کا رُتبہ پریسیڈنٹ کر دیا گیا تھا کیونکہ اس سے قبل یہ مقام احترام صرف پرو وائس چانسلر یا وائس چانسلر کیلئے وقف تھا۔ ان دنوں ڈاکٹر ذاکر حُسین خاں مرحوم (صدر بھارت) یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور احمد سعید المعروف بہ سعید انڈا یونین کے صدر تھے۔ اسٹریچی ہال میں بڑا جلسہ ہو رہا تھا، ہال لڑکوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے حسبِ معمول نہایت شگفتہ پیرائے میں خطاب کیا جو بہت پسند کیا گیا۔ ان کے خطاب کے فوراً بعد صدر یونین بھائی احمد سعید (مرحوم) نے حاضرین

سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "ابھی ڈاکٹر صاحب آپ سے عَرض کر رہے تھے"۔ عرض کا لفظ سُننا تھا کہ ہال 'عَرض'، 'عَرض' کی آواز سے گونج اُٹھا، کسی نے صَدا لگائی صدارت کے آداب سیکھ کر آیئے۔ کسی دِل جلے نے کہا' انڈا گندا نکلا اِسے پھوڑ دو'۔ اس نازک موقع پر سعید نے نہایت ذہانت و استقامت سے کام لیا اور حاضرین سے استدعا کی "مجھے صرف ایک بات کرنے کا موقع دیجیے"۔ بڑی مشکل سے مجمع خاموش ہُوا تو سعید نے مائک پر ہی وائس چانسلر صاحب کو مخاطب کرتے ہُوئے دَریافت کیا' ڈاکٹر صاحب ابھی آپ نے جو کچھ کہا وہ فرمایا تھا یا عرض کیا تھا' ڈاکٹر صاحب نے لامحالہ متانت سے جواب دیا "جی مَیں نے عرض کیا تھا"۔ بس پھر کیا تھا ہال قہقہوں سے گونج اُٹھا۔ سُنا ہے اختتام جلسہ کے بعد ڈاکٹر صاحب نے حلقۂ احباب میں کہا "لیجیے آج صاحبزادہ نے ہم پر ہی ایکٹوٹی کر دی' مگر خُوب کی' ذہانت کی داد دینا پڑے گی"۔

اَب ایک ایسی شرارت کا ذکر بھی سُن لیجیے جس کا شمار آج بھی بطور "یادگار ایکٹیوٹی" کیا جاتا ہے جیسا کہ بیان کیا گیا علیگڑھ ٹیم کے کھلاڑیوں کا چُناؤ شدید مشقوں اور جانچ پڑتال کے بعد کیا جاتا تھا اور معیار پر پُورا اُترنے والے لڑکوں کو ہی یونیورسٹی ٹیم میں شمولیت کا اعزاز نصیب ہوتا تھا لیکن ہاکی کلب کی تاریخ میں ایک 'بن کھیلے' کپتان بھی گزرے ہیں جو اپنی نظیر آپ ہیں اور رہیں گے کیونکہ وَہاں نہ تو کوئی ایسا کپتان ان سے پہلے ہوا نہ بعد میں ہونے کا اِمکان ہے۔ ہُوا یُوں کہ اناڑی کپتان صاحب کو تعینات بھی مورچہ پر کیا گیا تھا یعنی محافظ گول بنایا گیا تھا دراصل اس زمانے کی ٹیم ایسے غیر معمولی کھلاڑیوں پر مشتمل تھی کہ اکثر مقابلوں میں گول کیپر صاحب کے پیڈوں پر گیند لگنے کی باری تک نہیں آتی تھی' چُنانچہ چند میچوں کے دَوران ان حضرت کی کارگزاری کی آزمائش کا موقع ہی نہیں آیا اور

اس طرح یہ بزرگ گیند کو اپنی قدمبوسی کا شرف دیئے بغیر ہی ناقابلِ تسخیر (UNBEATEN) مشہور کر دیئے گئے بلکہ یار لوگوں نے انھیں یہ اعلیٰ مرتبہ دے دیا۔
اس طرح کچھ دنوں تک جب ہر طرف سے ان کے کھیل کی واہ واہ سنائی دینے لگی تو انھوں نے بھی پر پرزے نکالے اور سمجھنے لگے کہ میں بھی کچھ ہوں، ان کا یہ رنگ بدلتے دیکھ کر احباب کو سوجھی کہ کیوں نہ ان سے مزہ لیا جائے اور ان کو ان کی اوقات بتلادی جائے۔ چنانچہ ہاکی کے بوجھ بجھکڑوں نے اپنے گرو کپتان گرو استاد مسعود زیدی کی زیرِ نگرانی خفیہ منصوبہ بندی کی جس کی ہدایت کاری کے فرائض بھی استاد نے خود ہی سنبھالے۔ اس منصوبے کی تفصیلات نہایت دلچسپ ہیں جو مسعود صاحب نے اپنی کتاب 'علیگڑھ کی یادیں علیگڑھ کی باتیں' میں انتہائی پُرلطف انداز سے رقم کی ہیں۔ اس کا اجمال یہ ہے کہ اپنے ان دوست، شاگرد، کمرہ فیلو، بھائی وہاج کے نام پرووائس چانسلر اے بی اے حلیم صاحب کے لیٹر پیڈ پر خط ٹائپ کروا کر ان کے دفتر کے چپراسی کے ہاتھ بھجوایا گیا جس میں تحریر تھا کہ آل انڈیا ہاکی ایسوسی ایشن نے وہاج صاحب اور مسعود صاحب کو ٹرائلز کے لئے لکھنؤ بلایا ہے، جہاں آئندہ ہندوستان کی اولمپک کی ٹیم کا انتخاب عمل میں آنے والا ہے اور یہ کہ ان دونوں لڑکوں کو آج ہی رات روانہ ہونا ہے۔
حلیم صاحب کے اس خط کے ساتھ ڈاکٹر چٹرجی سکریٹری آل انڈیا ہاکی ایسوسی ایشن کے خط کی نقل بھی منسلک تھی جس کا متن بھی یہی تھا۔ مسعود صاحب انتہائی خفیہ طریقے سے یہ ساری کارگزاری انجام دینے کے بعد جب اپنے کمرے پر پہنچے تو دیکھا کہ بھائی وہاج پر جیسے مرگ مسرّت طاری ہو! انھوں نے خط دکھا کر مسعود صاحب کو لپٹ کر مبارکباد دی اور تیار ہونے کو کہا جس پر مسعود صاحب نے اپنی معذوری ظاہر کرتے ہوئے انھیں سمجھایا کہ "بھائی تمہارا چانس، تو

اس لئے یقینی ہے کہ دُنیا جانتی ہے کہ UNBEATEN ہو لیکن میں اگر گیا اور منتخب نہیں ہُوا تو کرکری ہو جائے گی"۔ الغرض اس طرح بھائی وہاج کو تنہا جانے پر آمادہ کر لیا۔ سفر خرچ کے لئے بتایا گیا کہ پچاس روپیہ منظور ہیں جو واپسی پر مل جائیں گے۔ چنانچہ لکھنؤ کی گاڑی کا وقت ہونے سے دو گھنٹے پہلے جشنِ وہاج منانے والوں کا تین بھرے تانگوں کا قافلہ اپنے ہیرو کو گھیرے میں لئے ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ تانگوں کا کرایہ رواج کے مطابق بھائی وہاج نے خوشی خوشی دیا پھر سامان ویٹنگ روم میں ڈال کر ٹی اسٹال پر چائے کیک پیسٹریاں اُڑائی گئیں، انڈے کھائے گئے۔ اس دوران تمام ساتھیوں کا مارے ہنسی کے بُرا حال تھا جسے بھائی وہاج یاروں کی خوشی سے تعبیر کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں گاڑی آئی رات کے دس بج چکے تھے سردی خاصی زور پر تھی سامان انٹر کلاس میں بہت احتیاط سے رکھوایا گیا، انٹر کلاس اس لئے کہ سبھوں نے مشورہ دیا کہ اولمپک کے انتخاب کے لئے تھرڈ کلاس میں جانا نامناسب ہوگا۔ چنانچہ باتیں کرتے کرتے بھائی لوگ وہاج صاحب کو گارڈ کے ڈبے کے پاس لے آئے وہاں سب نے باری باری ہار ڈالنا اور گلے ملنا شروع کر دیا۔ اب بھائی وہاج بہتیرا چیخیں پکاریں کہ گاڑی چھوٹنے والی ہے مگر وہاں کون سنتا تھا۔ الغرض گاڑی جب رینگنے لگی تو خان صاحب انوار اللہ خان نے کہا" بھائی وہاج ہمیں چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو" اور ایسے چمٹے کہ وہ تلملاتے رہ گئے اور گاڑی سچ مچ چلی گئی۔ اب بھائی وہاج کو سامان کی پریشانی لاحق ہوئی تو جب انھیں یقین دلا دیا گیا کہ سامان اُتروا لیا گیا ہے تو بولے" معلوم ہوتا ہے ایکٹوٹی ہو گئی"۔

ان چند تمثیلات سے یہ بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ علیگڑھ میں شرارتوں میں کس قدر جدّت انفرادیت اور ہنرمندی سے کام لیا جاتا تھا اور ایسی چوٹوں کا بیشتر مطلب سُدھارنا اور سدھانا ہی ہوتا تھا۔ وہاں کی یہ

بھی روایت تھی کہ جب ایکٹویٹی ہوجائے تو پھر اس کی داد فریاد کرنا مزید حماقت کا ثبوت دینا ہوتا تھا اس لئے چوٹ کھانے والا مسلکِ خاموشی اور احباب کی دلجوئی پر ہی اکتفا کرتا تھا۔

www.taemeernews.com

محافلِ مشاعرہ

علیگڑھ کی زندگی میں مشاعروں کی جاندار اور شاندار روایات خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں یوں تو علیگڑھ کی فضا شعر گوئی کے لئے اس قدر سازگار تھی کہ وہاں چھوٹی چھوٹی محافل سال کے بارہ مہینے منعقد ہوا کرتی تھیں لیکن سال میں ایک آل انڈیا مشاعرہ بہت تزک و احتشام سے یونین کے زیرِ اہتمام ہوتا تھا۔ ہم نے ایسے سالانہ مشاعروں میں اپنے دور کے تمام ہی بڑے شعراء کو نغمہ سرائی کرتے سنا اور ان کو چاہا بھی ہے۔ چالیس کے عشرہ کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ وہ حضرت جگر مرادآبادی کا دور تھا تو بجا ہوگا اس لئے علیگڑھ میں ان کی جس طرح پذیرائی ہوتی اور وہ بھی جس طرح لہک لہک کر کلام سناتے کسی شاعر کو یہ قدر و منزلت نصیب نہ ہوئی۔ جگر صاحب جب مشاعرہ پڑھ جاتے تو پھر مہینوں کمروں سے کلاس رُوم سے حتیٰ کہ غسلخانوں سے جگر صاحب کے ترنّم پر ستم ڈھائے جاتے۔ اگر شعرائے ہند کا مختصر جائزہ لیا جائے تو ان میں علیگڑھ کے بہت سے شعراء کے نام سرِفہرست نظر آئیں گے لیکن قرونِ اولیٰ میں سرسیّد کے کڑے عاشق خوشی محمّد ناظر تھے ان کی ولولہ انگیز نظموں نے علیگڑھ اسپرٹ کو پروان چڑھایا اور اس دور کے مسلمانوں سے علیگڑھ کا صحیح تعارف کروایا جس سے مخالفین کے منہ بند ہو گئے۔ بعد کے ادوار میں مولانا حسرت موہانی آبروئے غزل، اور مولانا ظفر علی خاں

مولینا جوہر اور فانی کے اسمائے گرامی ہیں۔ پھر سب سے ذہین اور پُرمغز شاعر اقبال احمد سہیل گزرے ہیں لیکن ہندوستان میں ان کو وہ رُتبہ نہیں ملا جس کے وہ اہل تھے۔ عاشقِ صادق علیگڑھ اسرارالحق مجاز جن کی نظم نذرانۂ چمن نے ترانہ بن کر انہیں لافانی شہرت و عظمت بخشی۔ شکیل بدایونی۔ اختر انصاری۔ آزر مرادآبادی۔ صبا اکبرآبادی۔ علی سردار جعفری۔ اختر الایمان۔ ماہر القادری۔ سخنورانِ علیگڑھ کے اس قافلہ میں جاں نثار اختر۔ معصوم رضا راہی۔ معین احسن جذبی جیسے مشاہیر کے نام آج بھی برِصغیر کے بامِ شعر و ادب پر جگمگا رہے ہیں جس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ برِصغیر میں کہکشانِ شعر و ادب کو تابندگی بخشنے میں علیگڑھ کے شعراء کا نمایاں حصّہ ہے۔

لیکن علیگڑھ کے مشاعرے محض شعراء کے کلام کی وجہ سے مقبول نہ تھے کیونکہ انھیں رنگین بنانے اور محافل میں زندگی پیدا کرنے میں وہاں کے طلباء کے برجستہ مُہذّب اور چبھتے ہوئے فقروں کا بہت دخل تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ ایک برمحل جملہ اچھے سے اچھے شعر سے زیادہ مؤثر ثابت ہوتا ہے۔ ایسے فقروں کی لطافتیں ہمیشہ زندہ رہتی ہیں، جنہیں آج بھی سُن کر علیگڑھ والوں کی سخن فہمی کے معیار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے پھر اس برملا داد کا ایک پہلو یہ تھا کہ ایسے جملوں سے گھائل ہونے والے شعراء سب سے زیادہ خود ان سے محظوظ ہو کر دل کھول کر داد دیا کرتے۔ داد کے ایسے لین دین کی مثال ملاحظہ فرمائیے معروف شاعر جناب سلام مچھلی شہری علیگڑھ کے مشاعروں میں بہت جذبہ و جوش کے ساتھ اکثر شرکت فرماتے لیکن کلام پیش کرنے سے قبل علیگڑھ سے اپنے پُرخلوص تعلّق کا اظہار بھی ضرور کیا کرتے چنانچہ ایک ایسے ہی مشاعرے میں جب ان کی باری آئی تو انھوں نے جذبات سے معمور الفاظ میں حاضرین سے خطاب شروع کر دیا۔ سامعین ان کے محبّت بھرے الفاظ ہمہ تن گوش سُن رہے تھے کہ انھوں نے فرمایا "جب بھی میں علیگڑھ آتا ہوں

اپنی رُوح میں جانے کیا شے تیرتی محسوس کرتا ہُوں" اس وقت فضا میں یکبارگی 'مچھلی' کی آواز بلند ہُوئی۔ اس کے بعد سلام صاحبؔ نے بہت اچھی غزل سُنائی، لیکن 'مچھلی' کے وار کے بعد اس کا وہ اثر نہیں ہُوا جو متوقع تھا۔

اسی طرح ایک زوردار محفل مشاعرہ جمی ہوئی تھی جس کی صدارت مشہور تاریخ داں پروفیسر محمّد حبیب کی اہلیہ کر رہی تھیں! ایک سنجیدہ نیم بُزرگ شاعر جب اپنا کلام پیش کر رہے تھے تو اس کے دوران ایک نہایت بے ہنگم قہقہہ کی آواز فضا میں ایسی گونجی کہ اس نے شاعر صاحب کی غزل تک کو ہلا کر رکھ دیا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر بیگم حبیب نے بہت نرم لہجے میں دریافت کیا کہ یہ کون حضرت تھے۔ مجمع میں سے کوئی نہیں بولا دوسری مرتبہ جب پھر انھوں نے یہی سوال کیا تو اچانک ایک بھاری بھرکم انسان اپنی جگہ کھڑا ہو گیا اور قبل اس کے کہ بیگم صاحب اس سے کچھ کہیں اس نے نہایت لجاجت سے کہا 'جی بیگم صاحبہ یہ میں مُسکرایا تھا' یہ جملہ سُن کر محترمہ صدر سمیت سارا ہال بڑے زور سے ہنس پڑا۔ شاعر صاحب کی غزل تو بے چاری اس مُسکراہٹ کی نذر ہونا ہی تھی لیکن اس کے بعد مشاعرہ خوب چلا۔

یہاں ان تبسم ریز ہونے والے سے بھی برائے ریکارڈ تعارف کرا دیا جائے جن کا ابوسعید زیدی نام ہے علیگڑھ سے ایم اے ایل ایل بی کی سند کا حصّہ پا لینے کے بعد سُنا ہے کہ بریلی کی عدالتوں میں مُسکراہٹیں بکھیرا کرتے ہیں اور حال فی الحال جنتی بننے کا ارادہ بھی نہیں رکھتے جو ایک نیک شگون اور اچھی مثال ہے۔

www.taemeernews.com

دینیات

علیگڑھ کے لیل ونہار کا احوال آپ نے ملاحظہ فرمایا، ہوسکتا ہے بعض حقیقت ناآشنا، ہمارے مضامین سے یہ نتیجہ اخذ کرلیں کہ علیگڑھ میں پڑھائی کے علاوہ محض کھیل کود سیر تماشے الیکشن اور مشاعروں پر ہی توجہ مرکوز کی جاتی تھی اور مذہبی تعلیم، اور دینداری کی طرف سے اغماض برتا جاتا تھا، تو اس غلط فہمی کے ازالے کی غرض سے یہ تحریر کرنا ضروری ہے کہ علیگڑھ یونیورسٹی کوئی مذہبی و دینی درسگاہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک اسلامی اور علمی ادارہ ہے جہاں عصرِ حاضر کے علوم کے ساتھ دینیات کا نصاب بھی رائج ہے۔ علیگڑھ میں ایف اے، اور بی اے میں دینیات کا مضمون لازمی ہوتا ہے جو سائنس کے طلبا کو بھی پڑھنا پڑتا ہے یہی نہیں دینیات کی کلاسوں میں حاضریاں بھی کم سے کم ساٹھ فیصد ہونا ضروری ہیں اور جب تک طالبِ علم دینیات میں کامیابی حاصل نہ کرلے، وہ ایف اے یا بی اے فائنل میں شریک ہونے کا اہل نہیں ہوتا۔ ان پابندیوں کی وجہ سے غافل سے غافل اور شریر سے شریر طالب علم دینیات کی طرف سے لاپروائی نہیں برت سکتا، یہی وجہ تھی کہ کبھی کسی طالب علم کو دینیات کے مضمون میں فیل ہوتے نہیں سُنا، اَب کوئی حاضریوں کی کمی کے باعث شرکت امتحان سے محروم رہ جائے تو ایسا فعل خودکشی کے مترادف ہے۔ علاوہ ازیں مذہبی رُجحان رکھنے والوں کے لئے بی ٹی ایچ اور ماسٹر آف تھیالوجی

کی کلاسوں کا بندوبست بھی تھا، اس طرح دینی مضامین کے شائقین دینیات میں گریجویشن اور ماسٹر کرتے چلے آرہے ہیں اور اب تو سُنا ہے پی ایچ ڈی کا بھی اہتمام کر دیا گیا ہے۔

دینیات کا معاملہ محض دَرس و تدریس پر ہی ختم نہیں ہو جاتا کیونکہ علیگڑھ کے سائے ہوسٹلوں میں صوم و صلوٰۃ کا نظام روزِ اوّل سے بڑے زور و شور سے رائج تھا اور اب بھی ہے۔ وہاں ہر 'ہال' میں نماز کے لئے علیحدہ بڑا کمرہ مختص ہوتا تھا جسمیں صَفوں کا اہتمام تھا اور مؤذن و پیش امام حضرات بھی مامور تھے، جس ہال میں تمام ہوسٹل ایک احاطے میں نہ تھے جیسے آفتاب ہال' وہاں ہر ہوسٹل میں نماز کے لئے سب انتظام موجود تھا۔ ان مساجد میں پانچوں وقت اذان ہوتی اور نماز باجماعت ادا کی جاتی۔ لڑکوں کو پابندِ صلوٰۃ بنانے کے لئے مانیٹر حضرات مُقرّر ہوتے تھے۔ جن کے پاس حاضری کا باقاعدہ رجسٹر ہوتا جس کی خانہ پُری غالباً ملائکہ کرتے ہوں' کیونکہ نماز کے اوقات میں نمازی تو صفوں میں چند ہی نظر آتے جبکہ رجسٹر میں سَب حاضر ہوتے' گویا اسے بھی علیگڑھ کی روایت کا جُزو ہی تصوّر کر لیجئے کہ اس طرح نمازی اور بے نمازی ایک ہی صَف میں کھڑے کر دیئے جاتے۔ دَراصل نام تو مانیٹر بہت سُہانا اور کسی قدر بارعب بھی ہے لیکن بااعتبار کام پریئر مانیٹر (PRAYER MONITOR) کو سخت دُشواریوں سے واسطہ پڑتا تھا کیونکہ اگر غیر حاضروں کی حاضری ڈالے تو مشکل اور نہ ڈالے تو اس سے بھی زیادہ مشکل' اس لئے اس غریب کو چار و ناچار پاسِ مُروّت کرنا پڑتا تھا ؎

سچ کہوں تو جگ نہ مانے جھوٹ کہوں تو رام
کہت کبیر کیا کرے دونوں بھاری کام

ہمارے ساتھیوں میں مولینا حمید صاحب ہیں جو اَب ڈاکٹر حمید صاحب بَن چکے ہیں اور اچھے سائنسداں

مانے جاتے ہیں، حد سے زیادہ بامروّت انسان ہیں خود نہایت پکّے نمازی تھے اور دل و جان سے یہی چاہتے تھے کہ اپنے دوستوں کو بھی دوزخ کی آنچ سے محفوظ رکھ سکیں۔ ہمارے ہم جماعت بھی تھے اس لئے کالج آتے جاتے فضائل نماز بیان کرتے اور بہت پیار سے نماز کی تلقین بھی کرتے رہتے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم جیسے گنہگاروں کو شرمساری کا موقع نہیں دیتے اور اپنے سے بھی زیادہ ہماری نمازوں کا ریکارڈ چوکس رکھتے۔ بسا اوقات وارڈن صاحبان پر بھی نفاذ دین کا غلبہ طاری ہوتا تو وہ فجر کی نماز کے لئے لڑکوں کو اٹھانا شروع کر دیتے۔ اوّل تو فجر کی نیند ہی اتنی غفلت کی ہوتی ہے کہ خفتگانِ سحر اسے ساری رات کی نیند کا ماحصل سمجھتے ہیں پھر عنفوان شباب میں تو لذّتِ خوابِ سحر میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایک مرتبہ عثمانیہ ہوسٹل کے ایک وارڈن صاحب نے یہ ذمّہ داری سنبھال لی کہ لڑکوں کو جگا کر فجر کی جماعت میں شامل کیا جائے چنانچہ انھوں نے اذان ہوتے ہی سب کو بستروں پر سے ہاتھ پکڑ پکڑ اٹھانا شروع کر دیا' چند روز تو مستانِ خوابِ سحر اس دخل اندازی کو جیسے تیسے جھیلتے رہے بالآخر تنگ آمد بجنگ آمد کی نوبت آگئی تو چند شریر و کم حیا دار لڑکے مچھر دانی کے اندر سوئمنگ کاسٹیوم پہن کر سونے لگے اب ایک روز صبح صبح جب وارڈن صاحب نے مچھر دانی ہٹا کر ایک نوجوان کو جھنجھوڑنا چاہا تو وہ نیم عُریاں نکلے۔ وارڈن صاحب اسے اتفاق سمجھ کر آگے بڑھے اور دوسرے پلنگ پر دست اندازی فرمائی تو وہاں بھی ایسی ہی صورتِ حال درپیش تھی' اَب وارڈن صاحب بھی علیگ ٹھہرے وہ تاڑ گئے کہ آگے کیا ہونے والا ہے اس لئے استغفار پڑھتے ہوئے مسجد کو چلے گئے اس کے بعد وہ سحر خیزی کے پُرمحبت تقاضے تو کرتے رہے لیکن اپنی خواہش پر عملدرآمد سے گریز کرنے لگے۔

یہ مناظر ہم نے اپنے دور کے ہوسٹلوں کی مساجد کے پیش کئے لیکن

فروری سنہ ۱۹۹۰ء میں خوش نصیبی سے ایک جدید چار منزلہ اقبال ہوسٹل مسجد یا کمرہ مسجد میں نمازِ مغرب ادا کرنے کی سعادت نصیب ہوئی اس جماعت میں ہمارے شریک وہاں کے پرووسٹ ڈاکٹر ابصار مصطفےٰ خان اور وارڈن بھی تھے، مسجد گرچہ چوتھی منزل پر واقع تھی لیکن اس کے باوجود جماعت میں نمازیوں کی کثیر تعداد موجود تھی ان نوجوانوں کے ذوقِ عبادت میں پچاس ساٹھ سیڑھیوں کی چڑھائی حائل نہیں ہو سکی. نماز کے بعد نوجوانوں سے مل کر بہت خوشی اس لئے ہوئی کہ وہ محض ROUTINE کے نمازی نہ تھے بلکہ ان پر دینی جذبہ کا غلبہ بھی نمایاں تھا، ہماری ان سے مختصر سی گفتگو بھی ہوئی اور اس صحبت کا لطف ہنوز تازہ ہے۔ بعد میں ہمیں بتلایا گیا کہ لڑکوں میں مذہبی جوش و خروش اور پابندی صوم و صلوٰۃ میں تبلیغی جماعت اور جماعتِ اسلامی کی کوششوں کو خاصا دخل ہے۔ ہوسٹلوں میں ادائیگی صلوٰۃ خمسہ کی صورتِ حال پیش کی گئی! اب جمعۃ المبارک کا حال بھی سُنئے جو علیگڑھ یونیورسٹی کی حسین جامع مسجد میں بصد اہتمام حرمت ساتھ پڑھی جاتی ہے۔ اب چونکہ سارے یونیورسٹی ایریا میں کہیں اور جمعہ کی نماز نہیں ہوتی اس لئے لامحالہ جملہ طلباء اور حدود یونیورسٹی میں اقامت پذیر اساتذہ، ممبرانِ اسٹاف وغیرہ سب ہی اسی جامع مسجد میں نماز جمعہ ادا کرتے ہیں۔ یہ مسجد سرسید ہال کے مغرب وسطی میں واقع ہے، اور چھوٹے پیمانے پر دہلی کی جامع مسجد کا انتہائی خوبصورت نمونہ ہے۔ اسی مسجد کے احاطے میں داہنی طرف بانی درسگاہ عالیہ سرسید رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے فرزند، رفقاء اور پیروکار جناب جسٹس سید محمود، جناب سید زین العابدین، نواب محسن الملک اور ڈاکٹر سر ضیاء الدین آسودۂ خواب ہیں اور نمازی بڑی پابندی اور خلوصِ نیت سے اپنے ان محسنین کو فاتحہ کی سوغات بھیجا کرتے ہیں۔

علیگڑھ کی اس جامع مسجد کو ایک ایسی انفرادیت و افضلیت حاصل ہے جو ہمارے علم کی حد تک برِصغیر ہندوپاک میں کسی دوسری مسجد کو نہیں، یعنی اللہ

نے اس سجدہ گاہِ عام کو ایسا مقبول بنایا ہے کہ شیعہ و سُنّی دونوں عقائد کے ماننے والے اسی ایک مسجد میں پہلے دن سے نمازِ جمعہ ادا کرتے چلے آرہے ہیں جس میں کبھی کوئی تنازعہ کھڑا نہیں ہُوا۔ پہلے اہلِ سُنّت والجماعت نماز ادا کرتے ہیں اور اس کے فوراً بعد ہی شیعہ حضرات اپنے مجتہد کی اقامت میں یہ فریضہ انجام دیتے ہیں۔ لڑکے نماز کے ان دونوں سیشنوں کو "فرسٹ اور سیکنڈ شو" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ چُنانچہ فرسٹ شو والے جب مسجد سے نکلتے ہوتے ہیں تو "سیکنڈ شو والے آگئے" کہہ کر انھیں خوش آمدید کہتے ہیں اور سیکنڈ شو والے فرسٹ شو والوں سے پوچھتے ہیں شو کیسا رہا۔

یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ جب اللہ ایک، رسولؐ ایک، قرآن ایک تو پھر مساجد میں دوئی کیسی، کاش دوسرے تمام وابستگانِ اُمّتِ مُسلمہ بھی اس نمونہ یکجہتی کو اختیار اور نافذ کرنے کی کوشش کریں تو تمام تعصّبات ختم ہو کر مسلمان ایک دوسرے سے قریب تر آسکتے ہیں۔ توقع تھی کہ پاکستان حاصل کرنے میں اسلامیانِ ہند نے جس یگانگت اتحاد و اتفاق کا مظاہرہ کیا تھا اہلِ پاکستان وہی جذبۂ اخوت و مساوات اسے مستحکم کرنے میں بھی برقرار رکھیں گے لیکن افسوس جیسے دن گزرتے جارہے ہیں فرقوں کی گنتی بڑھتی جارہی ہے اور پیشہ ور ملّاؤں کی حکمتِ عملی کی بدولت، نوبت اَب یہاں تک جا پہنچی ہے کہ دیوبندی بریلویوں کی مسجد میں نہیں قدم رکھ سکتے اور قادریہ مساجد کے دروازے اہلِ حدیث کے لئے بند ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خانۂ خدا استغفراللہ بیت الملّا بن گیا ہے جہاں اللہ کا ہر بندہ نماز بھی ادا نہیں کرسکتا! یہی نہیں آئے دن حصولِ قبضۂ مسجد کے لئے مسلّح وارداتوں کی خبریں اخباروں کی زینت بن کر غیر مسلموں کو ہمارا مذاق اڑانے کے مواقع فراہم کرتی ہیں۔ ایسے فتنہ ساماں نیم مولویوں کو راہِ راست پر لانے کے لئے آج پھر سرسیّد جیسے مصلح کی ضرورت ہے ہوسکتا ہے یہ حضرات ایسی ہستی کو اپنے درمیان پاکر پھر برائے اختلاف و کُفر سازی ہی اکٹھے ہو جائیں۔

رمضان المبارک کا مہینہ اپنی تمام تر برکات کے ساتھ یونیورسٹی میں آتا۔ اس ماہِ صیام میں زیادہ تر لوگ پابندی سے روزہ رکھتے بقیہ فاقہ کشی سے بچنے کے لئے روزہ اختیار کرنے پر مجبور تھے۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ ساری یونیورسٹی میں کھانے پینے کی ہر طرح کی خرید و فروخت بند رہتی کوئی ہوٹل یا ریسٹورنٹ نہیں کھلتا تھا، وہاں رمضان میں ہوٹلوں میں ایسا پردہ سسٹم نافذ نہ تھا جس کا مظاہرہ کراچی میں بلکہ پاکستان کے ہر بڑے شہر میں ہوتا ہے، جہاں سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر تو رمضانی حضرات نظر آتے ہیں لیکن پسِ پردہ روزے خور جمگھٹے کئے رہتے ہیں، بلکہ حقیقت ہے کہ رمضانوں میں ہوٹل والوں کی روزانہ ہی عید ہوتی ہے۔ رمضان کی برکتوں سے علیگڑھ کے کھانوں میں کسی قدر تنوّع پیدا ہو جاتا تھا، سحری میں علاوہ دوامی نسخے دور روٹی اور دو بوٹی کے۔ دودھ ڈبل روٹی، دودھ جلیبی، پراٹھے، کباب بھی فراہم کئے جاتے تھے اور لڑکوں کو اپنی مرضی کا کوئی مینو پسند کرنے کا اختیار تھا، اس وجہ سے منھ کا ذائقہ بدلنے کے لئے طلباء روزانہ نئے 'مینو' کا آرڈر دیتے۔ شام کو افطاری کا کوئی رواج نہ تھا جو لڑکے اپنی حیثیت کے مطابق خود خرید کر لے آتے، کھانا البتہ کسی قدر روغنی شکل میں ملنے لگتا تھا اور مقدار میں بھی کچھ اضافہ ہو جاتا تھا، اس برکت کی غالباً وجہ یہ تھی کہ رمضان میں باورچی و منشی حضرات ڈنڈی مارنا عارضی طور سے ترک کر دیتے ہوں گے۔ شام کے کھانے کے ساتھ 'سویٹ ڈش' کا بھی روزمرّہ انتظام ہوا کرتا تھا۔ اب ہم آج تک یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ محض پندرہ بیس روپئے ماہانہ میں یہ دسترخوانی مدارات کو کیونکر ممکن بنایا جاتا تھا، جبکہ ظاہر ہے لڑکوں کے لئے نہ تو ثواب کمانے والوں سے کسی قسم کا کھانا باہر سے منگوایا جاتا نہ ہی روزہ داروں کے پیٹ بھرنے کے لئے کسی زکوٰۃ لینے کی اجازت تھی۔ اس بارے میں اپنا تو عقیدہ یہی ہے کہ یہ سب فیضانِ علیگڑھ کے سب سے اونچے اور پہنچے

ہوئے پیر مرد کے خلوص نیت، دعاؤں اور کوششوں کا تھا، یہی وجہ ہے کہ آج بھی گرانی کے آسمان چھونے کے بعد علیگڑھ میں جتنی کم قیمت میں جس مہذب و پاکیزہ طریقے سے لڑکوں کو خوراک فراہم کی جاتی ہے دنیا کے کسی تعلیمی ادارہ میں اس کی مثال نہیں ملتی سحر و افطار کے اوقات میں یونیورسٹی میں زور دار سائرن بجا کرتا تھا جس کا رواج اب بھی ہے بلکہ اس کی آواز میں کچھ زور زیادہ پیدا ہو گیا ہے۔ رمضان کے دوران پڑھنے لکھنے اور کھیل کود کے پروگرام ہرگز متاثر نہیں ہوتے معمول کے مطابق کلاسیں ہوتیں البتہ چند جانے پہچانے اساتذہ کا موڈ ناگوار اور لہجہ کرخت سا محسوس ہوتا یعنی آمد رمضان ایسوں کے لئے نزول رحمت کے بجائے باعث زحمت ہوتی لیکن کیا مجال جو کبھی کسی نے لب پر بھوک پیاس کا نام لیا ہو، یا روزہ داروں کا مذاق اڑانے کی کوشش کی ہو۔ پڑھائی کی طرح کھیل کا نصاب بھی رمضان بھر جاری و ساری رہتا ہمیں یاد ہے کہ کبھی کبھی ہاکی کھیلنے میں سائرن سے بے نیاز ہو کر اس قدر محو ہو جاتے کہ اپنے کمروں تک پہنچنا مشکل ہو جاتا اور راستے میں ہی پانی سے روزہ کشائی کرنا پڑ جاتی۔ مقصد یہ کہ روزہ کی نیت اگر صحیح ہو تو مشقت کا کام کرنے میں بھی انسان کو جسمانی کمزوری محسوس نہیں ہوتی، نہ کھانے پینے کی خواہش ستاتی ہے اس لئے بہانہ سازوں کا یہ کہنا کہ روزے میں بربنائے کمزوری معمولات زندگی کی ادائیگی ممکن نہیں تو یہ سراسر نیت کا فتور اور حیلہ ہے۔

اسی ماہ مبارک میں نماز تراویح کا بھی ہر ہوسٹل میں انتظام ہوتا جہاں ابتدائی چند روز تو بڑی رونق رہتی اور صفیں بھری رہتیں لیکن رمضان کے دن گزرنے کے ساتھ ساتھ ان نمازیوں میں کمی ہوتی جاتی اور آخر دنوں میں تو بمشکل ایک آدھ صف ہو پاتی۔ یہاں ہم تسلیم کریں گے کہ اس صف میں شامل ہونے والے خوش نصیبوں میں ہم کبھی نہ رہے، البتہ ختم قرآن کے روز مسجد کی گہما گہمی واپس آ جاتی

اور ہم جب مٹھائی لئے کمروں کو لوٹتے تو ایسے خوشیاں مناتے ہوئے جیسے رمضان بھر تراویح پابندی سے پڑھی ہوں۔

عیدین کی نماز بھی صرف یونیورسٹی کی جامع مسجد میں ہوتی اور یوم عید پر مسجد کے گرد و نواح میں بہت چہل پہل ہوتی گرچہ 'نماز چور' قسم کے لڑکے جن کی تعداد اتنی کم نہ تھی اس موقع پر کمروں پر سو کر ہی عید مناتے۔ عید کے دن تمام ہوسٹلوں میں کھانا بھی اچھے قسم کا ملتا اور اگر پروفیسر صاحبان یا وارڈن صاحب سے عید ملنے جایا جاتا تو سویّاں اور مٹھایاں بھی ہاتھ آجاتیں لیکن ہمارا ذاتی تجربہ اور رائے اس معاملے میں یہ ہے کہ عید اپنے شہر اور اپنے اہل خاندان کے ساتھ ہی عید معلوم ہوتی ہے۔ اور لاکھ سہولتوں اور آسائشوں کے باوجود پردیس کی ہر عید میں تشنگی اور تنہائی کا احساس رہتا ہے اور یہ ایسی کمی ہے جسے صرف اپنے قریبی اعزہ و احباب ہی پورا کر سکتے ہیں۔

عیدوں کے علاوہ عید میلاد النبیؐ کے موقع پر بھی یونیورسٹی میں جشن کا سماں رہتا۔ آجکل کی جلوس بازیوں کے برعکس ان دنوں جلوس نکالنے کا قطعاً رواج نہ تھا اس لئے جلوس نکالنے پر کسی تنازع کا بھی امکان نہ تھا، البتہ میلاد شریف اسٹریچی ہال میں بہت دھوم دھام سے منایا جاتا آخر میں سارے حاضرین مل کر سلام بھی پڑھتے اس پُروقار تقریب کے آخر میں مٹھائی بھی تقسیم کی جاتی لیکن کبھی چھین جھپٹ ہوتے نہیں دیکھی گئی۔ سُنا ہے حالاتِ حاضرہ کے تناظر میں عید میلاد النبیؐ اب بطورِ جشن منائی جانے لگی ہے اور ایک علیگڑھ کیا اب تو ہندوستان میں جہاں بھی مسلمان آباد ہیں یوم میلاد النبیؐ نہایت تزک و احتشام سے منایا جاتا ہے اور اسی عشقِ رسولؐ کی فراوانی اور لگن کی بدولت ہندوستان میں بھی آقائے دوجہاںؐ کے یومِ ولادت پر چھٹی دی جانے لگی ہے اس طرح

بھارت کے مسلمان بھی سرکارِ دوعالمؐ کا جشنِ ولادت منانے میں کسی اور مُلک کے مسلمانوں سے پیچھے نہیں۔

اَب دَورِ حاضر میں جہاں تک روزہ نماز کا تعلق ہے اس میں تو خیر و برکت نمایاں ہیں لیکن سحری و افطاری، ہوٹلوں اور خوانچہ فروشوں پر پابندیوں کا نظام جاری ہے یا نہیں، روزہ داروں کی خوراک کا نسخہ بھی وہی رائج ہے یا اس میں تبدیلی واقع ہوئی، اس سے متعلق ہمارے پاس کوئی اِطّلاع نہیں۔

دینیات کا موضوع پڑھ لینے کے بعد قارئین کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی صرف نام کی ہی مُسلم نہیں بلکہ عقائد اور جُملہ فرائض دینی کی بجاآوری غرض ہر لحاظ اور زاویئے سے مُسلّم مُسلم یونیورسٹی ہے۔ اور اِنشاءاللہ رہے گی۔ رہا لڑکوں کے لباس اور حُلیے کا معاملہ، تو وَہاں کے طلبا، مذہبی خول کے اندر تو البتّہ نہیں رہتے لیکن ان کا باطن اِسلام کی محبت سے معمور ہوتا ہے اور وہ اندر سے کسی بھی راسخ العقیدہ مومن سے کم نہیں۔ اس بارے میں برِّصغیر کی تاریخ گواہ ہے کہ مِلّتِ اسلامیہ پر جب کبھی آزمائش کی گھڑی آئی ہے، جہاں مَعرکۂ حق و باطل درپیش ہُوا ہے، علیگڑھ کے طلبا ہمیشہ صَفِ اوّل میں سینہ سپر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اکثر انہیں کامرانی سے سرفراز فرمایا ہے، جس کی وجہ وہ حقیقی جذبۂ اسلامی ہے جو دَورانِ تعلیم ان کی گھُٹّی میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اِس لئے کل ہو یا آج، یا آنیوالا کل وہ ہر دَاعیٔ الخیر کی آواز پر لبّیک کہتے چلے آئے ہیں اور کہتے رہیں گے۔

جو اَبر یہاں سے اُٹھا ہے، وہ سارے جہاں پر برسے گا
ہر جوئے رَواں پر برسے گا ہر کوہ گراں پر برسے گا
یہ اَبر ہمیشہ برسا ہے یہ اَبر ہمیشہ برسے گا

مجاز

www.taemeernews.com

سینیارٹی کا چسکا

سَردی خشک اور کڑی۔ گرمی سڑی، لُوں بڑی، گرد آسمان چڑھی۔ شجر و حجر کا رنگ زرد، لاتعداد حشراۃ الارض۔ رنگ و نمو سے مُبرّا، ذائقے سے محروم کھانا اس پر مستزاد۔ کمروں میں برقی پنکھوں کا گزر نہیں، مچھّر دانی بغیر جینا محال، مکھیوں کی بیڈھنگی چال۔ واٹر کولر جیسے نام سے ناآشنائی، ٹھنڈا کھانا کھاؤ اور گرم پانی پی کر صحّت بناؤ۔ یہ تھا علیگڑھ کا موسمی پس منظر، لیکن وہاں ایک مقناطیسی کشش تھی، ایک گیرائی تھی جس نے سارے ماحول کو رشکِ آفریں بنا کر چھوٹی موٹی ناگواریاں نظر انداز کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان معلوم دشواریوں کے باوجود ہر سال ہزاروں نئے نئے نونہال داخلِ گلستاں ہوتے کیونکہ وہاں شفقتوں کا ابر ہمہ وقت سایہ فگن رہتا۔ چاہت کی پھوار سے زمین سے پیار کی سوندھی خوشبو پھوٹتی، محبّت کے چشمے اُبلتے، اُخوّت و موانست کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا رہتا۔ یہ تھیں وہ خصوصیات جنھوں نے جملہ مذکورہ و غیر مذکورہ تکالیف کو راحت و آرام میں بدل کر یونیورسٹی کو خوشیوں کا گہوارہ بنا دیا تھا۔

وہاں نواب زادے بھی آتے اور غریب زادے بھی، لیکن علیگڑھ کے سائبان تلے ایک دفعہ آجانے کے بعد سب سیّد زادے بن جاتے اور پھر عُمر بھر اسی حوالے سے جانے اور پہچانے جاتے اور اسی پر فخر کرتے۔ وہاں دولتِ علم کے متلاشیوں کے لئے علوم کے خزانے بکھرے رہتے، کھیلنے والوں کے لئے کھیلوں کی جملہ

آسانیاں تھیں، کم آمیزوں میں ملنے جُلنے کی خواہش پروان چڑھتی، شرارت کرنے والوں کے شوخیوں کے مظاہرے دیکھنے اور سیکھنے کے وافر مواقع موجود تھے۔ وہاں مستحق لڑکوں کی نہ صرف کالج کی فیس معاف ہوتی بلکہ بعض حالات میں ان سے کھانے کے اخراجات بھی نہیں لئے جاتے یہاں تک کہ کچھ ہونہار اور محنتی لڑکے ٹیوشن کرکے اپنے ماں باپ کی امداد بھی کیا کرتے۔ لیکن ناداری کے باوجود ایسے لڑکوں کا سوسائٹی میں وہی مقام اور احترام تھا جو امیرزادوں کا تھا اور کسی کی مجال نہ تھی کہ ایسے خوددار غیوروں کو بنظرِ حقارت دیکھے۔ خود اساتذہ بھی سب پر یکساں متوجّہ رہتے اور بھرپور محبّت کا اظہار کرتے۔ علیگڑھ پر یہ خداداد نعمتیں ہیں جو جھٹلائی نہیں جاسکتیں، اور کون ہے جو ان رحمتوں کا انکار کرسکے؟

علیگڑھ دیارالملائکہ نہیں تھا یہ تو خدا کی ایسی بستی تھی جہاں اللہ میاں کے ہر طرح کے بندے بقدرِ شوق آسودۂ علم ہُوا کرتے تھے۔ وہاں جہاں مرغانِ سحر سے زیادہ اچھّی اذان دینے والے پابند صوم وصلوٰۃ نوجوان بھی ہوتے تھے تو مے پرستی کے رضاکار بھی دستیاب تھے جو چھُپ چھُپا کر طلبِ میگساری مٹاتے مگر ان کا یہ مشغلہ خوش اسلوبی سے نیم حجابانہ انداز میں ہُوا کرتا۔ وہاں ایسے شرمیلے بھی تھے جن کے خسارِ نامحرم کا نام سُن کر لالہ حیا بَن جاتے۔ اور کبھی کسی بُرقع پوش سے آمنا سامنا ہوجاتا تو شرم سے زمین میں گڑھ جاتے وہاں ایسے 'بام دیدہ' پائل کی جھنکار شنیدہ بھی تھے جو یونیورسٹی کی تمام پابندیوں کے باوجود اپنے پسندیدہ ٹھکانوں تک رسائی حاصل کرلیتے۔ وہاں سگریٹ کی بُو سے دُور بھاگنے والے سکھ طبع بھی تھے اور ایک آدھ پرلے درجے کا چرسی بھی، وہاں ایسے بھی تھے جو تاش کے پتّوں کی تصویروں کو دیکھنا گناہِ کاغذی تصوّر کرتے تو ایسے پیدائشی بھی تھے جنھیں جوا کھیلے بغیر کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ پھر بھی بعدالذکر جملہ اقسام کے لوگ برائے نمونہ ہی دستیاب تھے۔

تاہم ایسے مبتلائے خرابات میں اتنا ہوش ضرور تھا کہ وہ یہ حرکات بڑائی سمجھ کر نہیں بلکہ بُرائی سمجھ کر ہی کیا کرتے۔ وہاں کتب بینی سے گریزاں انتہائی ذہین طلباً بھی بکثرت پائے جاتے اور ایسے غبی بھی جو ہمہ وقت کتابیں چاٹا کرتے لیکن ان سب سے مختلف لڑکوں کی ایک ایسی نوع بھی ہوتی جو نہ تو اچھے طالب علم ہوتے نہ اچھے کھلاڑی نہ ملّا کہلائے جاتے نہ دارو گیر، دراصل ان حضرات کا سارا وقت 'سینئر بننے' کی آرزو کی نذر ہوتا یہ اپنے کمروں میں پلنگ پر نیم دراز اسٹائل سے پڑے پڑے حقّے اور سگریٹ میں کش لگاتے' اپنے جونیئرز سے چائے بنواتے' تاش کھیلتے پان کھاتے، چوپال جما کر گپّیں لگاتے اس طرح سال بھر کلاسوں سے اغماض برت کر امتحان کے موقع پر 'پوٹ ٹیک' کوشش میں مبتلا ہو جاتے۔ ان ایّام میں ان حضرات کی صورتیں دیکھنے کے قابل نہ رہتیں، کئی کئی روز شیو کی چھٹّی، سر پر بالوں کی بغیر زائی فصل، دانتوں میں پان کی ریخیں' آنکھیں خوف امتحان سے پتھرائی ہوئی، کپڑے میلے چکٹ' زمین پر بستر کے اطراف سگریٹوں اور بیڑیوں کے ٹوٹے' الغرض ہر طرح سے پھٹکار زدہ نمونۂ عبرت بن جاتے تھے لیکن اپنی کرنی سے باز نہیں آتے تھے۔

یہ حقیقت ہے کہ علیگڑھ کی زندگی میں اس قدر تنوّع تھا کہ جہاں اچھے سے اچھے اور بُرے سے بُرے کی گزرتی اور خوب گزرتی وہاں فرصت کے اوقات میں کمروں سے طبلوں کی تھاپ پر ستار کی دھنیں سنائی دیتیں کبھی برکھا رُت کا نُطف اُٹھانے پر ملہار گائی جاتی کہیں مینی مشاعرہ بپا ہوتا اور داد کے شور میں کوئی خوش گلو غزل سرا ہوتا۔ کسی کمرے میں پلیٹوں کے باجے پر سہگل اور خورشید کے نغمے گونجتے، کبھی یونین میں تقریروں کے مقابلوں کی باری آتی تو کبھی کھیل کے میدانوں میں گھمسان کا ایسا رن پڑتا کہ ساری یونیورسٹی ادھر ٹوٹ پڑتی۔

بعض موسم میں ڈراموں کے ذریعے راتوں کو گولڈن بنایا جاتا۔ اَلغرض سال کے بارہ مہینے کچھ نہ کچھ ہنگامہ آرائی بپا رہتی۔ یہی وہ مشاغل تھے وہ دلچسپیاں تھیں جو لڑکوں کو اپنے قیام کو طول دینے کے لئے اُکساتیں۔ چُنانچہ عام طور سے وہاں یار لوگ سَال کے سال کسی نہ کسی بہانے یونیورسٹی میں آموجود ہوتے۔ ایم اے کر چُکے تو ایل ایل بی میں نام لکھوالیا جُغرافیہ میں ایم اے کر لیا، تو آئندہ سال ہسٹری میں داخلہ لے لیا اس طرح ٹرپل ایم اے ایل ایل بی بن کر فارغ ہوئے تو بی ٹی کالج پہنچ گئے۔ یہ وَتیرہ تو ان حضرات کا تھا جو پڑھنے لکھنے میں بھی دلچسپی لیا کرتے تھے لیکن ان کے علاوہ ایک چھٹی ہُوئی مخلوق ایسے کڑے مگر نکمّے عاشقوں کی تھی جو ایک ہی کلاس میں کئی کئی سال قیام فرما کر آگے سرکتے یا زبردستی سرکائے جاتے۔ ان کا طریقہ کار کچھ ایسا ہوتا کہ بیچارے والدین بھی یا تو اپنے سیدھے پن سے یا پھر ان سے پیچھا چھُڑائے رکھنے کی خاطر ان سے تعاوُن کرتے۔ ایسے لڑکوں کا آزمودہ حربہ یہ ہوتا کہ سال میں اتنی غیر حاضریاں کر لیتے کہ امتحان میں بیٹھنے کی اجازت ہی نہ مل سکے اور اگر یہ عُذر ناکام ہوتا تو فیل ہونے میں بھی اُنھیں خاص ڈھب ہوتا تھا۔ ہم نے اپنے ایک جفا دیدہ اولڈ بوائے انوار اللہ خان سے جو ہم سے پندرہ سَال پیشتر یونیورسٹی کے مشہور طالب علم اور ہاکی کپتان رہ چُکے تھے، جب ان کی مُدّتِ قیام کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے سُوکھا مُنھ بنا کر جواب دیا جس میں افسوس کا تاثّر بھی تھا "بھائی بس والدین کی غفلت سے پیدا شاہجہانپور میں ہو گیا ورنہ تو ساری عُمر علیگڑھ شریف میں گزُری اور اب یہ چند سال یہاں کراچی میں مُقدّر کا لکھا پُورا کر رہا ہُوں"۔ اور مادرِ درس گاہ سے اس طرح ٹُوٹ کر عشق کرنے والے ایک دو نہیں ہزاروں انوار اللہ خان پائے جاتے ہیں، اور یہ وہ مرتبہ ہے جو دُنیا کی کسی دوسری دَرسگاہ کو حاصل نہیں۔

اب جہاں تک کھیلنے والے یا تین تین ڈگریاں حاصل کرنے کے لئے مقیم رہنے والوں کا تعلق ہے تو بات سمجھ میں آتی ہے لیکن آخر بلا عذر جو حضرات وہاں قیام پذیر رہتے تو اس کے محرکات کیا تھے، تو جناب اس کا جواب مختصر اور مکمل یہ ہے کہ اسے سینیارٹی کا چسکا کہتے ہیں، جو علیگڑھ کے علاوہ کہیں اور میسّر نہیں آتا۔ کیونکہ اس مقامی آزار کے مُبتلا محض علیگڑھ میں ہی پیدا ہوتے اور وہیں پائے جاتے ہیں، وہاں پہ سینئروں کا واجب الاحترام نہ ہوتے ہوئے بھی احترام کیا جاتا تھا جو گزرتا وہ سلام کرتا جاتا جو کچھ گھر سے لے کر آتا اس میں سینئر صاحب کا نذرانہ ضرور ہوتا، ان کا ہر کام آنکھ کے اشارے سے بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے ہو جاتا یہاں تک کہ وہ کلاس میں جانے کی زحمت بھی نہ فرماتے، جہاں کوئی نہ کوئی پراکسی بولنے کا فریضہ انجام دیتا۔ اگر خوش قسمتی سے کسی دن خود نمودار ہو جاتے تو واہ واہ ہو جاتی کہ آج تو فلاں سینئر بھی کلاس میں تشریف لائے تھے۔ اسٹیشن یا نمائش میں چہل قدمی کرتے تو دائیں بائیں جونیئروں کا گروہ ہوتا ہر تقریب میں پذیرائی ہوتی لیکن کمروں پر مسلسل سُلائی ہوتی۔ ان حضرات کا تفصیلی تعارف اور علیگڑھ میں ان کی مشغولیات کا ذکر آپ پہلے ہی پڑھ چکے۔ غرض عارضی بڑائی اور جھوٹی انا کے ان غلاموں کو وہاں کی زندگی میں ایسا مقام حاصل ہو جاتا جو انھیں اپنے گھر پر مل سکتا تھا اور نہ کسی بازار یا دفتر میں۔ وہ دن بھی سُست روی کے تھے گھروں کی معقول جائداد میں سے ورثہ میں ملنے کی ہر ایک کو توقع ہوتی۔ اس لئے ایسے افراد جدوجہد سے ناآشنا رہ کر ہی زندگی گزارنے کے عادی ہو جاتے اور پھر بقیہ تمام عمر اپنے خاندان پر بوجھ بنے رہتے۔ کُل یونیورسٹی میں عددی لحاظ سے گرچہ ایسے مدہوشانِ سینیارٹی دو تین فیصد بھی نہیں ہوتے تھے لیکن بہرحال پائے جاتے تھے جن کی بے راہ روی دیکھ کر یونیورسٹی کے ماحول کے متعلق غیر سنجیدہ رائے قائم کی جا سکتی تھی اور کی جاتی

رہی ہے۔ دَرحقیقت اس ناقابلِ قبول غلط رَویّے کو سینیارٹی کا چسکا ہی کہا جا سکتا ہے۔
زمانے بیت گئے دُنیا ریڑھو سے ترقی کر کے چند اماموں کے کندھوں پر سوار ہو چکی۔ بڑی بڑی ریاستیں گئیں اور اپنے نوابوں اور راجاؤں کے نام و نشان بھی ساتھ لے گئیں۔ برّصغیر میں نئی مملکتوں کے قیام سے ایسا انقلاب رُونما ہوا جس سے بے شمار اقدار کا خاتمہ ہوا۔ مردانِ حشم کو رُسوائی نصیب ہُوئی، کوچہ نورد لفنگے صاحبانِ سیم و زر بن گئے۔ حالات کی ایسی گردش میں سینیارٹی کے گدّی نشین بھلا کہاں پنپ سکتے تھے۔ اس لئے علیگڑھ کی فضا بھی اس وَبا کی آلودگیوں سے متاثّر ہو چکی ہے۔ تاہم چند سال قبل ہمیں علیگڑھ میں ہی دو ایسے سینئروں کی زیارت کا اتّفاق ہُوا جنھوں نے فخریہ بتلایا کہ آٹھ آٹھ سال سے یونیورسٹی کو اپنی موجودگی سے نواز رہے ہیں، اور یونیورسٹی میں قیام کی توسیع کے لئے ہر سال نیا حیلہ تراش لیتے ہیں لیکن یہ دونوں چہرے بشرے اور بات چیت سے اس نیستی زدہ نسل کے افراد نہیں معلوم ہوئے اس لئے اس میں کوئی بُرائی نہیں کیونکہ بہ اقتضائے وضعداری دُنیا کو دِکھانے کے لئے کچھ نمونے تو سینئرز کے باقی رہنا چاہئیں۔
سینیارٹی کی جُستجو میں مُستغرق رہنے والے اوباش فکروں سے قطع نظر یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ علیگڑھ کے ہر اولڈ بوائے کے دل میں خواہ وہ کتنا ہی مُعمّر کیوں نہ ہو جائے، کتنا ہی عظیم المرتبت کیوں نہ بن جائے، یہ خواہش ہمیشہ جوان رہتی ہے کہ کسی طرح اُسے ایک مرتبہ پھر یونیورسٹی ہوسٹل لائف نصیب ہو جائے یہ وہ تمنّا ہے جو محسوس کی جا سکتی ہے بیان نہیں ہو سکتی۔ دُنیا والے شاید اسے بھی ایک قسم کا چسکا ہی سمجھتے ہوں تو سمجھا کریں۔
ہم نے ان صفحات میں روایاتِ علیگڑھ پر بالاختصار روشنی ڈالی تاکہ ناظرین وہاں کی غیر نصابی سرگرمیوں سے بھی کسی قدر واقفیت حاصل کریں، وہاں سالہا

سال کا آزمودہ روایات کا ایسا دلچسپ مستحکم نصاب تھا جس پر قیام کالج کے روزِ اوّل سے ۱۹۶۰ء تک سال بسال نہایت عقیدت و احترام سے عمل کیا جاتا رہا اور اس کی افادیت غالب رہی لیکن ۱۹۶۰ء کے بعد گردشِ ایّام نے شرارتوں کے اس پروگرام کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اَب ہمارے لئے حتمی طور سے یہ فیصلہ کرنا کہ آیا یہ روایات دَورِ حاضر کے تقاضوں پر پُوری نہ اُتریں یا پھر اِنسانی زندگی کے اس رنگین باب کو ذاتیات، تشدّد و تعدّی یا منتقمانہ کارروائیوں کی وجہ سے بند ہونا پڑا یا پھر صبر و تحمّل نے ساتھ چھوڑ دیا بہت دُشوار ہے۔ موجودہ صُورتِ حال یہ معلوم ہوتی ہے کہ ساوَن بھادوں میں بَدلیاں تو اَب بھی خُوب خُوب برستی ہیں، اُمڈ گھمڈ کر بادل بھی چھا جاتے ہیں لیکن اِس شوخ موسم کا پُورا پُورا لُطف اُٹھانے کے لئے رندی و مستی کی اجازت نہیں یعنی مشغلۂ کیچڑ بازی (MUD RIOTS) قطعاً بَند ہو چکے ہیں اور اَب تو وَہاں اِس نام سے بھی کوئی واقف نہیں اسی طرح تعارفی رات (INTRODUCTION NIGHT) کا سِلسلہ بھی منقطع کر دیا گیا جس کا موجودہ معاشرے میں کوئی مقام ہے نہ نام لیوا۔ جَب شبِ شرارت، شبِ خرافات بنا دی گئی تو بھیّا پارٹی کا گزر کیونکر ممکن ہوتا اور سر سیّد کی فاتحہ کا چندہ کیسے وصول ہو سکتا ہے۔ لہٰذا یہ روایات بھی کبھی کی طاقِ نسیاں ہو گئیں۔ اَلبتّہ نوید علیک بھائیوں کی زَبانی سُنا ہے کہ یونیورسٹی میں بھرتی کے موقع پر کچھ ہلّہ گلّہ مچا لیا جاتا ہے تو اس میں نہ انفرادیت ہے نہ جدّت کو دخل، چونکہ اس قسم کے شور شرابے ہر چھوٹے بڑے ادارے میں ہوتے ہی چلے آئے ہیں۔ معلوم ہُوا کہ اب نو واردوں کو کسی شام یکجا کر کے اسٹیج پر لایا جاتا ہے اور دورانِ تعارف کچھ جُملوں سے ان کا استقبال کیا جاتا ہے اور اس خوشی میں چائے وائے اُڑائی جاتی ہے۔

اسی طرح الیکشن کی روایات میں بھی تبدیلیاں رُونما ہو چکی ہیں۔ کوئی ہارے

کوئی جیتے نہ جنازے اُٹھتے ہیں نہ مرثیے سُنائے جاتے ہیں' البتہ برفی نمک پارے کی توانائی سے الیکشن زور شور سے لڑائے جاتے ہیں جو بڑی حد تک مُرَوّجہ دھاندلیوں سے مُنزّہ ہوتے ہیں اور عام طور سے عُہدے کے اہل اُمیدوار کو ہی نامزد کیا جاتا ہے جو بہت غنیمت ہے۔ ڈائننگ ہال وغیرہ میں یونیفارم کا عمل دخل نہیں بلکہ ہوسٹل کا کھانا بھی ضروری نہیں ہے چنانچہ بعض لڑکے ہوسٹل کی روایتی لذّتِ طعام سے محروم رہ کر 'ڈھابوں' کی سَرپرستی کرتے ہیں۔ یہ ڈھابے اپنی شکل وصُورت اور غذائی معیار کے اعتبار سے کیفے ڈی پھُوس کی گئی گزری قسم معلوم ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے ان کو سَرپرست بھی ایسے ہی میسّر آجاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ڈائننگ ہالوں کے کھانوں کا ذائقہ تو اپنی جگہ برقرار ہے لیکن رونق میں نمایاں کمی محسوس ہوتی ہے۔

خطابات سے نوازنے کے لئے آنرز لسٹ اَب بھی نکلتی ہے لیکن چند اضافوں کے ساتھ جس کا نام نمکدان رکھ دیا گیا ہے اس میں وضاحتی کارٹون بھی ہوتے ہیں اور چٹکتے ہوئے اشعار بھی۔ نمائش کی موسمی اور اسٹیشن کی بلاموسمی سیر وتفریح کا رواج ہنوز برقرار ہے' لیکن ہر جگہ سیاہ شیروانی کے نہ ہونے کی وجہ سے روایتی شان وشوکت معدوم ہے' کیونکہ دیگر کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبا سے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے لڑکوں کو ممتاز کرنے اور ان کا تشخّص بنانے میں کالی شیروانی بہت بڑا عُنصر ہُوا کرتی تھی' غالباً آجکل کے لباس آزاد ذہنوں میں اس زیان یہ لوشاک کا احساس نہیں جو ان کی فضیلت اور برتری کی علامت تھی۔

اقوام ہوں یا ممالک روایات ہوں یا اقدار' ان میں ترقّی وزوال امرِ فطرت ہے اور گردشِ ایّام کا حق ہے جس سے کسی کو مفر نہیں اس لئے بعض قدیم روایتیں اَب اگر ختم ہوگئیں یا کردی گئیں تو ان کا ملال تو ضرور کیا جاسکتا ہے لیکن اس کے لئے نئی نسل کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ ہوسکتا ہے بدلے ہوئے ماحول عادات وخصائل

کی بدولت پرانی خوشگوار شرارتیں اور روایات اب ناگوار بن گئی ہوں اور بجائے فروغِ موانست و یگانگت عصبیتوں اور منتقمانہ کارروائیوں کو جنم دینے لگی ہوں اسلئے ان کا ترک کرنا ہی بہتر ہو۔

ہم نے ۱۹۱۰ء سے ۱۹۸۰ء یعنی جغادریوں سے لے کر نوبالغ اولڈ بوائز سے گفتگو کرنے کے بعد مقبول روایات کا گھیرا ڈالنے کی کوشش کی ہے جو مختصر ہوتے ہوتے بھی طول پکڑ گئی لیکن اس باب میں تو جتنا بھی لکھا جائے احساسِ تشنگی پھر بھی محسوس ہوتا ہے اس لئے محدود وقت اور صفحات میں اتنے اہم موضوعات کی مکمل شرح بیان نہیں کیجا سکتی اسلئے زیرِ نظر مضمون ایک ابتدائی کاوش ہے، کوئی تحقیقی مقالہ نہیں جس پر ناقدین توجہ مبذول فرمائیں۔ البتہ اپنی تمام کوتاہیوں کے باوجود ہم نے اس باب کی پہل ضرور کر دی ہے اور اب یہ سارے عالم میں پھیلی ہوئی علیگ برادری کا علیگانہ فریضہ ہے کہ وہ اپنی اپنی معلومات اور مشاہدات سے وقتاً فوقتاً اس میں اضافہ کرتے رہیں حتیٰ کہ رہتی دنیا تک بیاں کی جانے والی جملہ روایات اور شرارتوں کا مکمل حساب مرتب ہو سکے تاآنکہ فرزندانِ علیگڑھ روزِ محشر بابائے دانشگاہ کے حضور ان کے ادارے میں حاصل کی ہوئی تربیت کا ریکارڈ پیش کر سکیں، ایسا ریکارڈ جو دنیا کی کسی یونیورسٹی یا کالج کے طلبا پیش کرنے سے قاصر ہیں۔

—·)·>·(※)·<·(·—

www.taemeernews.com

۱۹۹۰ء کی نُمائش علیگڑھ کی سیر

اپنی بے مقصد زندگی کو کارآمد یا پُرکیف بنانے کے ہم نے رٹھونڈے کے مقامی میلے سے لے کر گڑھ مکنیشر تک کے میلے ٹھیلے دیکھ مارے عُرسوں اور عُرسیہ میلوں میں بھی شرکت کی سعادت حاصل کی جس کے ابتدائی مواقع اللہ جنّت نصیب کرے ہمارے پڑوسی بُزرگ حضرت اَمیر شاہ صاحبؒ نے فراہم کئے۔ امیر شاہ صاحبؒ تو دَرویش منش ہی رہے ہوں گے لیکن ان کی ناخلف ذرّیات نے انہیں امیر دوجہاں کا لقب دے دیا تاکہ وہ خُود نواب زادوں کی طرح کم از کم امیر زادے بن کر ہی مال زادوں کے زمرے میں شامل ہو جائیں، محلّے کے عُرسوں میں فیض یابی کی کامیاب مشقوں کے بعد ہم نے چند بڑے آستانوں کی طرف بھی رُخ کرنے کی ہمّت کر ڈالی اور کلیر شریف کے عُرس کا میلہ بھی دیکھا جہاں کا ماحول انتہائی سوقیانہ نظر آیا بلکہ بسا اوقات تو سرف نظر سے کام لینا پڑا۔ مزار پر رسومات اور قوالیوں سے زیادہ پیر بچّوں کو سنگھاسن پر زور آوری کرتے بھی دیکھا جو مُریدین کی خدمت بالمعاوضہ کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے بلکہ 'نذر' کے ساتھ سجدے بھی وصُول فرماتے ہیں۔ احاطۂ مقبرے سے باہر مذہبی رندوں کا اژدھام دیکھا جو ہر طرح کی رنگ رلیاں کھُلے بندوں مناتے ہیں جہاں ناؤنوش کے ساتھ مجروں کا بھی اہتمام ہوتا ہے اور خیمہ زنوں کو تو حجرے کی آسانیاں بھی بہم ہوتی ہیں۔ دین کے نام پر ایسے دلسوز مناظر ہمارے پاکستان خصوصاً سندھ میں کچھ زیادہ ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ آج برِّ صغیر میں

بنام عُرس ایسے پُرتعیش ناچ رنگ سے معمور میلے بہت زیادہ مقبولیت پا رہے ہیں چونکہ کاروباری منفعت دیکھ کر پیرانِ متقدمین کی صفوں میں سینکڑوں نو بیرے بھی شامل ہو گئے ہیں۔

اَلغرض دین کے نام پر سیر سپاٹا اور عیش پرستی آج بھی زوروں پر ہے۔ اپنے نرالے میاں شمس شادانی نے ایسے اجتماعات کی کیا خوب منظر کشی کی ہے! انکی نظم کا ایک بند مُلاحظہ فرمائیے ؎

یہاں رقصِ طوائف نٹ کا کرتب عام ہوتا ہے — یہاں اسراف جتنا کیجئے اِک نام ہوتا ہے
شریعت پر یہاں چلنا خیالِ خام ہوتا ہے — یہاں پر چھپ چھپا کے خیر سے ہر کام ہوتا ہے

یہاں افیونی و چرسی شرابی سب ہی آتے ہیں
یہاں ہر قسم کے انسان مُرادیں دل کی پاتے ہیں

چونکہ مُعاشرہ ہی نمائشی بن چکا ہے اور زمانے کا سارا کاروبار دکھاوے پر چل رہا ہے اس لیے دُنیا بھر میں نمائشوں کا بڑا چرچا ہے۔ کہیں فروغِ تجارت و زراعت کے لئے تو کہیں گھوڑوں اور مویشیوں کی نمائش کے نام پر متنوع ہنگامہ آرائیاں منعقد کی جاتی ہیں جو مُبتلائے آلام عوام کے لیے تفریح کا ایک مؤثر ذریعہ ہیں۔ اپنے دادا کی معیت سے لے کر پوتوں کے ساتھ تک ہم نے بھی نہ جانے کتنی آل انڈیا اور بین الاقوامی نامور کی نمائشیں دیکھ ڈالیں رام پور کی نمائش تو چالیس کے عشرے کی پیدائش ہے۔ ہم نے مشہورِ زمانہ میرٹھ کی نوچندی بھی دیکھی اور کراچی میں پُرانی نمائش سے لے کر نئی تک کتنی ہی بین الاقوامی نمائشوں کی سیریں کیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ دِلی لگاؤ جو نمائش علیگڑھ سے ہے وہ نہ تو کسی اور میلے کو حاصل ہُوا نہ نمائش کو جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ بیک وقت یہ نمائش میلہ بھی ہے اور ایک طرح کا عُرس بھی جس کا سارا علیگڑھ بلکہ قرب و جوار کے شہروں میں بسنے والی علیگ برادری سال بھر بے چینی سے انتظار کرتی

ہے اور جب یہ شُبھ گھڑی آجاتی ہے تو ہر طرف سے عقیدت کیش بزبانِ علیگڑھ "ارّا" کر ٹُوٹ پڑتے ہیں۔ یہاں دُور دراز کے دیہاتی اور شہری عوام ہی نہیں آتے بلکہ علیگڑھ کے مستند مشتاقانِ نمائش بھی گروہ در گروہ، بلکہ اپنے اپنے جتھے (GROUPS) لئے ڈٹے رہتے ہیں۔ سچ پوچھیے تو اپنی عقیدت سے علیگڑھ والوں نے اس نمائش کو عُرس جیسا دَرجہ دے رکھا ہے چونکہ اس کی بُنیادی وَجہِ شہرت و مقبولیت علیگڑھ یونیورسٹی ہی ہے جس کے طلباء و اساتذہ کی والہانہ شرکت نے اس میں چار چاند لگا دیئے۔ چُنانچہ گھاگ قسم کے علیگ بھی تازگیٔ ایمان کے لیے اپنا علیگڑھ کا دَورہ ایّامِ نمائش ہی میں رکھتے ہیں، لہٰذا حُسنِ اتّفاق سے جب ہم ۶ فروری ۱۹۹۰ء کو علیگڑھ نصیب ہوئے تو وہاں ہر چہرے کو نورِ نمائش سے مُنوّر اور اس کے ذِکر سے مُتبسّم پایا اور وہاں پہنچ کر اپنے اَعِزّہ اور نوخیز علیگیوں سے ملے تو کچھ دیر کے لئے ہمیں یہ خوش فہمی ہوئی کہ یہ مُسکراہٹیں، یہ رونقیں ہماری مُلاقات کا نتیجہ ہیں لیکن جب ہر طرف سے کانوں میں نُمائش کی صدائیں گونجنے لگیں اور حلوے پراٹھے کی خُوشبوئیں اُڑنے لگیں تب جاکر پتہ چلا کہ علیگڑھ پر تو نُمائش سوار ہے اور ہر چھوٹا بڑا، امیر غریب پروفیسر، طالبِ علم صاحبِ غُلام سبھی دامِ نمائش میں گرفتار ہیں۔ مائیں بچّوں کو نُمائش کی لوریاں سُنا رہی تھیں، شوہر بیویوں کو پھُسلا رہے تھے، ڈائننگ ہال زدہ ایک دُوسرے سے کباب پراٹھا کھانے کے چکّر میں تھے، رہے خُرّانٹ یعنی سینئرز تو وہ اس مُرغن بہانے اَیّامِ جوانی کی یادیں تازہ کر رہے تھے پھر ایسے میں ہم کیوں اپنی قسمت کی یاوری پر ناز نہ کرتے چُنانچہ ہمارے میزبان بھائی بہنوں نے پہلی فُرصت میں ہمارے لئے نُمائش شریف کی زیارت کا اِنتظام کر ڈالا۔ اَب جواں سال اُن علیگ بھائیوں نے جو ہمارے خلیرے بھائی ہیں اپنے بال بچّوں کے ہمراہ اپنی مارُوتیوں[1] کا رُخ سُوئے نمائش

---

[1] سوزوکی کا ہندوستانی نام

کر دیا، آپ کو کس طرح بتائیں اِس وقت ہمیں مرحوم یکے کی یاد نے کتنا ستایا اور اس کا فراق ہمیں کتنا کھلا وہ تو خدا بھلا کرے علیگڑھ کی سڑکیں بنانے والوں اور وہاں پر نالیاں کھودنے والوں کا کہ راستے میں جا بجا ہمیں لُطف یکہ نشینی حاصل ہوتا رہا لیکن عجب دلچسپ صورت حال یہ تھی کہ راستے میں جو لوگ بھی ملے وہ کسی سواری میں ہوں یا پیدل یا تو وہ عازمینِ نمائش تھے یا وہاں سے لوٹ رہے تھے چونکہ ان کے چہروں پر "غازۂ نمائش" ملا ہوا تھا، ٹریفک کا یہ عالم تھا کہ جو راستہ ہم پا پیادہ آدھے گھنٹے میں طے کر لیا کرتے تھے 'ماروتیوں' نے بابِ مزمل تک رسائی میں اس سے زیادہ وقت لے لیا۔ ہمیں چونکہ نمائش کے درشن کئے ۴۲ سال گزر چکے تھے اس لیے ہر واقعہ اور ہر موڑ اجنبی سا معلوم ہو رہا تھا حتیٰ کہ ہر نمائش پہنچ کر بھی گمان ہوا کہ کہیں دریا کی جگہ کوچۂ اغیار میں نہ آ پھنسے ہوں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نمائش کے اطراف میں نئی کالونیوں نے جنم لے لیا ہے اور اچھے اچھے جدید الطرز مکانات نے تمام میدانوں کو آباد کر دیا ہے۔ اب یہ علیحدہ بات ہے کہ اس کے منصوبہ سازوں نے گندے پانی کی نکاسی کا کوئی انتظام ہی نہیں کیا اور کچھ کیا بھی ہوگا تو وہ مفلوج ہو چکا ہے۔ نتیجتاً نہ صرف مکانات کے اردگرد بلکہ سڑکوں پر گندِ آب کے مستقل جوہڑ بن گئے ہیں اس لئے نمائش آنے جانے والوں کو اس گندی آزمائش سے گزرنا ہی ہوتا ہے، گندِ آب کے اس منظر سے کم از کم ہماری ایک دیرینہ غلط فہمی تو دور ہوئی چونکہ ہم تو سمجھے بیٹھے تھے کہ گندے پانی کے تالاب بنانے کا حق شاید کراچی کے منصوبہ سازوں ہی کی خصوصیت ہے مگر اب یہ دیکھ کر گونہ تسلی ہوئی کہ اس فن کی مہارت اور فیض رسانی عام ہو چکی ہے اور برِصغیر میں کتنی نئی کراچیاں، لب گندِ آب بسی ہوئی ہیں۔

گاڑیوں سے اُترنے کے بعد ہم جب سوئے منزل رَوانہ ہُوئے تو اپنی پیش قدمی کے لئے مُزمّل گیٹ سے پہلے ایک اور جواں سال گیٹ موجود پایا جس کی زینت کے لئے کھجلے اور نان خطائی کی دُکانیں، بیکریاں اور ہوٹل موجود تھے جن کی خالی کرسیاں گاہکوں کی مُنتظر تھیں۔ یہ وہ کم نصیب دُکاندار تھے جو قلب نمائش میں رسائی سے محروم رہ گئے تھے اس لئے انھوں نے غم غلط کرنے کیلئے درِ محبوب پر ہی پڑاؤ ڈال دیا تھا وہ جس دَرد مَندی سے گاہکوں کو اپنی طرف مُتوجّہ کر رہے تھے اس سے محسوس ہوتا تھا جیسے 'پرگتی یاتریوں' کی سیوا کے لئے ہی متعیّن کئے گئے ہوں وہ گاہک نواز خوش خلقی کے مظاہرے کے ساتھ خصوصی مُراعات کا اعلان بھی کرتے جاتے تھے اس لئے نمائش سے تھکے ماندے واپس جانے والے اگر ضرورتاً نہیں تو بطورِ ہمدردی ان سے رجوع کرنے پر مجبور تھے۔

'بابِ مُزمّل' میں داخل ہوتے ہی محسوس ہُوا جیسے اِنسانوں کے سیلاب میں پھنس گئے ہوں ہر طرف سے زائرین کی موجوں نے ہمیں اپنے گھیرے میں لے لیا لہٰذا ہم نے بِلا پس و پیش اپنے کو ان امواج الرّجال کے سُپرد کر دیا۔

نمائش کی آرائش کا کہنا لیکن تماشائیوں کے چہروں پر دکانوں سے بھی زیادہ چمک دمک پائی جاتی تھی اور وہ بغیر دکانوں کی جانب رُخ کئے طوافِ عقیدت و محبّت میں مست و مگن تھے۔ لیکن کافی دیر متلاشی نگاہیں اِدھر اُدھر دوڑانے کے باوجود ہمیں اپنی گمشدہ کالی شیروانی کا سُراغ نہیں ملا۔ وہ شیروانی جو علیگڑھ نمائش کا طرۂ امتیاز ہُوا کرتی تھی، جس پر نظمیں کہی جاتی تھیں جسے دیکھ کر پیکرانِ حُسن کے چہروں سے نقابیں سرک جاتی تھیں وہ جو شائستگی کی علامت اور علیگ ہونے کا ٹریڈ مارک تھی، وہ شیروانی جس کے آگے سفاری سوٹ اور کوٹ پتلون شرمائے شرمائے لگتے تھے اور لڑکے انہیں پہننے سے گریزاں رہتے تھے، جس کی جھلک دیکھتے ہی ریلوے

کے عمال اور پولیس والے کترا کر سرک جاتے تھے، وہ شیروانی جو عالمی اُخوّت و موانست کا نشان، صاحب علم و فضل کی پہچان اور زندہ دلی کا اعلان تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ ساری سجاوٹیں اور گہما گہمی ہوتے ساتے کالی شیروانیوں میں ملبوس لڑکوں کی گشت کناں ٹولیاں نہ پاکر نمائش کی ساری رونق ماند سی محسوس ہونے لگی، اِس لئے اسے ضلعی میلہ یا نمائش کا ہی درجہ دیا جا سکتا ہے چونکہ سیاہ شیروانی پوشوں کے جتھوں کے بغیر علیگڑھ کی نمائش کی شان و شوکت معدوم ہو جاتی ہے، ہو سکتا ہے کہ پچھلے ۴۲ سال میں علیگڑھ کے نوجوانوں نے حالات زمانہ سے ساز کرنے یا پاپ کلچر (POP CULTURE) اپنانے کے لئے روایات دیرینہ کے ساتھ شیروانیوں کو بھی نظر انداز کر دیا ہو اور ہم غالباً اپنی سوچ کے اس انداز کی وجہ سے بُنیاد پسند (FUNDAMENTALIST) قرار پائیں۔ بہر حال ہمارے دل پر اُس منظر سے جو چوٹ لگی وہ دکھائے بنا چین نہیں لے سکتا۔ سُنا ہے کہ یونیفارم کی حد تک تو سیاہ شیروانی ہر طالب علم کو داخلے کے وقت ہی مُہیّا کر دی جاتی ہے، لیکن اس کے بعد یہ ہمیشہ کے لئے سوٹ کیسوں میں بصد احتیاط رکھ دی جاتی ہے اور طلباء اپنی مرضی یا حیثیت کے مُطابق رنگ برنگی بلکہ بدرنگی پوشاکیں استعمال کرتے ہیں۔

ہاں اس بھیڑ بھڑکے میں کافی دیر گھومنے کے بعد دو منحنی سے نوجوان کالی شیروانیاں پہنے نظر پڑے جو کچھ اس طرح بچتے بچاتے چل رہے تھے جیسے ہنگاموں کے دوران پولیس والے کونوں بچالوں میں سمٹ آتے ہیں ہمیں ان شیروانی پوش بچوں کا معذرت خواہانہ انداز دیکھ کر قدرتاً اِن سے ہمدردی پیدا ہوئی اس لئے بڑھ کر مزاج پُرسی کی تو پتہ چلا کہ وہ تو نظم و ضبط کے ٹھیکیدار یعنی پراکٹوریل مانیٹر واقع ہوئے ہیں۔ یہ جان کر ان کے خائف رہنے کی وجہ بھی معلوم ہو گئی۔ لیکن سمجھ میں نہیں آیا کہ پچھلے زمانہ میں تو یہ حضرات یونیفارم چیک کرتے تھے اور یونیفارم

کی پہچان کے ذریعہ سے لڑکوں کی حرکات وسکنات پر نظر رکھتے تھے اب جہاں طالب علم وغیر طالب علم سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں یہ اپنے فرائض کیسے انجام دے سکتے ہیں جبکہ یہ خود ہی اسٹوڈنٹس سے اتنے خوف زدہ معلوم ہوتے ہیں بغیر کچھ خریداری کئے اِدھر اُدھر فضول چکّر لگاتے رہنا علیگڑھ کی نمائش کے گویا مناسک میں ہے، اس لئے ہم بھی دُکانوں کی رونق دیکھتے رہے، تماشائیوں میں اپنائیت تلاش کرتے رہے۔ اب چونکہ نرم ونازک قسم کے خریداروں کی جلوہ سامانیاں ہمارے لئے بڑی حد تک بے اثر ہوچکی ہیں اس لئے دُکانداروں کے طور طریق اور ان کی درجہ بندی پر ہی توجّہ مرکوز رہی۔ ماہ وسال گزرنے کے بعد اسٹالوں کے رنگ روپ کے ساتھ دُکانوں کی اقسام اور تعداد میں بہت اضافہ ہوچکا ہے۔ لیکن سُرمہ فروشوں کے اتنے اسٹال تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ مرحوم ہاشم سُرمہ والے اپنی ذرّیات کو سُرمہ سازی کی وصیّت کر مرے ہیں یا شاید سُرمہ رگڑنا بھی ایصالِ ثواب کا کوئی ذریعہ ہو۔ مزید بار بات یہ تھی کہ ہر دُکان پر چچا ہاشم کی بڑی بڑی تصویریں آویزاں تھیں، اور ہر تصویر میں مرحوم اپنی سُرمہ بھری آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گاہکوں کو اپنی طرف متوجّہ کر رہے تھے۔ اس اعتبار سے اہلِ کراچی خوش نصیب ہیں کہ سُرمۂ فیضان کے لئے صرف عُمر بھائی نے پاکستان آنا پسند کیا ورنہ اگر ہاشمی سُرمہ بنانے کے سارے دعویدار یہاں اکٹھے ہوجاتے تو کم از کم کراچی میں تو آنکھوں کے جدید ہسپتال کبھی پروان نہ چڑھتے۔ سُرمہ محرومیٔ بصارت کا باعث ہے یا بینائی بحال کرتا ہے، اس پر تو آنکھوں کے ڈاکٹر یا ہاشم زادگان ہی روشنی ڈال سکتے ہیں۔ بہرحال یہ امر طے شدہ ہے کہ سُرمہ سے آنکھوں کا جو بھی حال ہو، اس سے معیشت ضرور بحال ہوجاتی ہے۔

سُرمے کے بعد نمائش میں جن اسٹالوں کی کثرت تھی وہ انواع واقسام کے چُورنوں کی تھی، یہ دُکانیں چونکہ متھرا کی تھیں اس لئے وہاں کے چوبوں کے حوالے

سے مُجرّب سمجھی جا سکتی ہیں لیکن ان پر گاہک کم اور چکھنے والے زیادہ جمع تھے، ہم نے اپنے ساتھیوں سے جب چورن کی دُکانوں کی افزائش کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے بتلایا کہ اب جس طرح کے لوگوں کی نمائش میں کثرت پائی جاتی ہے ان کا بغیر چورن گزارا نہیں پھر یہ حضرات چورن چکھتے ہی سرِ بازار اس کی افادیت کی گواہی دینے کی صلاحیّت و حوصلہ رکھتے ہیں اس لئے دُکانداروں کو اپنی پبلسٹی کی زیادہ ضرورت نہیں! اس کے باوجود ایک دُکاندار گھوشنا، دے رہے تھے کہ چاند پر جب پہلا راکٹ پھینکا گیا تو اس کا مسالہ انہوں نے ہی تیّار کیا تھا۔

نمائش تو نام ہی انواع و اقسام کے اسٹالوں کے شاندار اجتماع کا ہے اس لئے وہاں چوڑیاں پہنانے والوں کے اسٹالوں پر ہاتھوں میں ہاتھ دینے والے نرم کلائی حسینوں کی خاصی تعداد موجود تھی، کشمیر اور راجستھان کی صنعتوں کے نمائندہ اسٹال اور دُکانیں بھی تھیں۔ البتہ کشمیری شالوں کے ہر اسٹال پر لوگ ٹوٹے پڑ رہے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سیل لگی ہو۔ اس غیر معمولی گرمیٔ بازار کا بعد میں یہ سبب پتہ چلا کہ تاجرانِ کشمیر نے یہ افواہ پھیلادی تھی کہ ہندوستان میں کشمیری اسٹالوں کی شمولیت کا یہ آخری موقع ہے اور آئندہ وہ ادھر نہ آئیں گے۔ اس خبر کی کچھ بھی اصلیّت ہو مگر اس تاجرانہ مکر نے گاہکوں پر ایسا جادو کیا کہ انہوں نے کشمیری مال کی آخری خریداری سمجھ کر دل کھول کر شاپنگ کر ڈالی بعض دکانوں پر مقامی ٹی وی پر نہایت خرافات دکھائی جا رہی تھیں اور من چلے لڑکے و لڑکیاں ان مناظر سے خوب لُطف اندوز ہو رہے تھے۔ مائک پر وقفے وقفے سے کبھی فلمی گانے اور کبھی اعلانِ گمشدگی نشر کیے جا رہے تھے، کبھی درمیان میں سماچار کا سمے آجاتا تو وہ بھی سُنا دیئے جاتے اس کے علاوہ نمائش گاہ پر خاصی تعداد آئس کریم، کافی اور بھیل پوری کے اسٹالوں کی تھی جہاں چٹورے بے تکلفانہ شان سے چاٹ خوری میں مبتلا تھے!

بالآخر جب قلبِ نمائش میں ہر طرح کے دلفریب و دلخراش نظارے کرتے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بغیر محسوس ہوئے گزر گیا اور آنتوں کی فریاد سنائی دینے لگی، تو طے پایا کہ نمائش کی سب سے بڑی وجہِ کشش کو بھی آزمایا جائے یعنی کباب پراٹھے کے کوچے کا رُخ کیا جائے لیکن بابِ کباب وا ہونے کے باوجود وہاں تک رسائی کے لئے تو کئی مرحلے درکار تھے، اس لئے ٹھہرتے ٹھہرتے قدم قدم چل دیئے دفعتاً ایک بدایونی پیڑا ساز کی دکان پر نگاہ پڑی تو وہاں رام پور کے آخری نواب سر رضا علی خان چانسلر علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی پُرشکوہ شبیہ آویزاں تھی ہم اس کی زیارت میں محو تھے کہ صاحبِ دکان نے جو بدایونی پیڑوں کے موجد ممن خان کی نسل سے ہونے کے دعویدار تھے ہماری ناریل اور سونف سے تواضع کر ڈالی۔ ہم نے ان سے اس "تصویر" کی موجودگی کا سبب دریافت کیا تو انھوں نے بلا جھجک بلکہ فخریہ بتلایا کہ "والد صاحب کے دوستوں میں تھے یہ برکت کے لئے ٹانگی ہے" یہ سن کر نواب صاحب کی روح پر کیا گزری ہوگی وہ تو اللہ جانے لیکن ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں کہ مرحوم کا اگر بس چلتا تو مرقد سے اٹھ کے آتے اور آلِ ممن کو ٹکٹکی سے بندھوا کر اتنی سُنتائی کروالتے کہ بقیہ عمر پیڑے بنانے کا نام نہ لیتے۔ اور یہ برکت کا عقیدہ بھی خوب ہے جن بیچارے کی اولاد جوتیوں میں دال بانٹ رہی ہے جن کی مجرمانہ غفلت اور لڑائی جھگڑوں کی وجہ سے ان کے اسلاف کے آثارِ قدیمہ، قلعہ، خاص باغ بے نظیر کوٹھی شاہ آباد بین کرتے کرتے زمیں بوس ہو چکے، جہاں کے دربار ہالوں میں مہیب سناٹا، جن کے باغوں میں ویرانی ہے، جن کی عمارات بھوت پریت کا مسکن معلوم ہوتی ہیں وہ والی مجبور پیڑے والے کی اولاد کو کیا برکتیں دے سکتا ہے۔ تاہم قابلِ قدر ہیں وہ نادان جو نیست و نابود ہونے والی مورتیوں کو مقامِ احترام دے کر ان کی تصاویر کی پوجا کرتے ہیں۔ ہم آلِ ممن کی دکان پہ ششدر کھڑے تصویر بینی

میں مصروف تھے کہ ایک ریلا آیا جس نے ہمیں نمائش کی اصل نمائش گاہ میں پہنچا دیا یعنی ہم پراٹھا اسٹریٹ پر قدم رنجہ ہو گئے۔ یہاں گاہک گیری کا جو معیار دیکھا اس نے فرطِ حیرت میں ڈال دیا چونکہ ہر دکان کے کارندے بحالتِ رکوع مہمانوں کو اپنے ہوٹلوں میں مدعو کر رہے تھے، یہی نہیں بلکہ مالک صاحبان نقلی خان بنے اپنے نقلی مال یعنی شیرمال کے نمونے دکھا کر دلدادگانِ پراٹھا کو اپنی طرف مائل کر رہے تھے اور اس کے ساتھ ہی قیمت میں بھی واضح رعایت کا اعلان کرتے جا رہے تھے مگر ان گاہک گیر کوششوں کے باوجود شائقین کی یلغار اُن کی استدعاؤں پر کان دھرے بغیر آگے بڑھ رہی تھی، دل تو ہمارا بہت چاہا کہ ان مصنوعی خانصاحبان یعنی اصلی بھٹیارگان کی حوصلہ افزائی کے لئے ہم ادھر ٹرائی ماریں مگر ہمارے پیش رو بھائی خوشنود خان اور خوبرو گائڈ راشد خان بے مروتی کا مسلسل مظاہرہ کرتے ہوئے آگے بڑھتے گئے جس کے بعد ہمارا یہ قافلہ مزید اشتہا انگیز امتحانوں سے دوچار ہوتا دو ہوٹلوں کے درمیان جا پہنچا، وہاں انتظاری قطاروں میں کھڑے ہوئے پراٹھا دیوانے، پراٹھوں کی تلائی اور کبابوں کی سینکائی سے آنکھیں سینک رہے تھے مگر ان کی اس حالت سے زیادہ ہمیں خود اپنی بے بسی پر رحم آ رہا تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ اس نظارے سے ہمارے منہ میں پانی تو قطعاً نہیں آ رہا تھا البتہ آنکھوں سے اشک جاری تھے اور دماغ کبابوں کی خوشبو سے معطر ہو رہا تھا۔ ایسے دھنگرے ہوئے ماحول میں ہمارے بھائیوں نے ان ہوٹلوں سے متعارف کروایا جس میں ایک طرف نذیر ہوٹل اور اس کے بالمقابل جھنڈا ہوٹل تھا، بتایا گیا کہ گزشتہ کم از کم دس بارہ سال سے یہی دونوں ہوٹل نمائش لوٹ رہے ہیں۔ چنانچہ اگر کوئی نمائش میں ان دو ٹھکانوں سے 'پراٹھا یاب' ہونے سے رہ جاتا ہے تو سمجھا جاتا ہے کہ وہ بھوکا ہی لوٹ آیا۔ ہم ان بھٹیارے میزبانوں کی "بایوڈیٹا" بڑی دلچسپی سے سنتے رہے کہ

اللہ اللہ کر کے ہوٹل میں داخلہ کی گنجائش نکل آئی جس پر ہم نے کھانا کھانے سے پیشتر ہی شکر الحمد للہ پڑھا مگر یہ قبل از وقت ثابت ہوا اس لئے کہ ہوٹل کے اندر کم و بیش ہر کیبن کے سامنے بہت سے ثقہ اور فیشن دار عالم بے چارگی میں پڑ اٹھوں کے طلبگار بنے کھڑے تھے لہٰذا جب کہیں جگہ خالی ہوتی تو منتظرین کو چانس ملتا، ہمیں بھی یہ دلچسپ مرحلے کرنا پڑا جسے باعثِ ثواب سمجھ کر جھیل گئے۔ یوں تو ہم زندگی میں بارہا مختلف قطاروں میں یعنی ریلوے اور سنیما ٹکٹ سے لے کر اسٹیڈیم تک جانے والے کیو، میں کھڑے ہونے کا وسیع تجربہ رکھتے ہیں لیکن بسلسلۂ شکم سیری یہ ہمارا پہلا امتحان تھا، جو خدا نہ کرے کہ آخری ہو۔ یہ معدہ گداز منزل سر کرنے کے بعد جب ہم ایک فاتح کی طرح کیبن میں داخل ہوئے تو میزوں کی صفائی اور برتنوں کی اٹھائی کے لئے بیرے صاحب کا مرہون منت ہونا پڑا جو اپنی مصروفیات کی وجہ سے ترجیحات پر عمل پیرا تھے۔ پھر انھیں آرڈر پکڑایا گیا تو ہم حیرت زدہ رہ گئے چونکہ اس میں حفظِ مراتب کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا تھا، یعنی کباب حلوہ اور پراٹھے کو کوئی فضیلت نہیں دی گئی تھی، بلکہ سارا زور قورمہ اسٹونان و شیرمال پر تھا۔ ہم نے جب اس کی وضاحت چاہی تو پتہ چلا کہ رائج الوقت مینو یہی ہے اور حلوہ پراٹھے کی شمولیت نام و نمود کی حد تک ہے لیکن ہم نے روایات سابقہ کا پاس کرتے ہوئے کباب اور خورجوی اچار بھی خاص طور سے منگوایا۔ سنا گیا تھا کہ آرڈر اور سپلائی میں خاصا وقت لگ جاتا ہے لیکن بیرے صاحب 'گرائیں' نکل آئے یعنی رامپوری واقع ہوئے تھے لہٰذا انھوں نے یہ حق اچھی طور سے نبھایا البتہ یہ نصیحت ابتدا میں ہی فرمادی تھی کہ جو کچھ آرڈر دینا ہے ایک دفعہ دے دیا جائے ورنہ بعد میں بہت انتظار کرنا پڑے گا اور شاید سیٹ بھی خالی کرنا پڑ جائے۔ اب جب کھانا کھانے بیٹھے تو ہمیں بھی 'مینو' کی صداقت پر ایمان لانا پڑا چونکہ نہ تو پراٹھا وہ پراٹھا تھا

اور نہ کباب ویسے کباب بلکہ خورجہ کا اچار بھی اپنا شلغمی رنگ وذائقہ کھو چکا تھا، بہرحال سب نے کھانا کھایا اور خوب کھایا لیکن تعجب کی بات یہ کہ ہوٹل میں گندگی کے تمام خصوصی انتظامات ہونے کے باوجود کسی کو 'ڈائریا' نہ ہوا۔ ہم جب شکم کے گڑھے پاٹ کر باہر نکلے تو سینکڑوں پس ماندہ چٹورے نمائش کا یہ اہم ترین مورچہ سر کرنے کے لئے بڑی عقیدت سے لائنوں میں لگے ہوئے تھے جن میں سے زیادہ تر جھنڈا ہوٹل یا نذیر ہوٹل میں جانے کے آرزومند تھے، جبکہ بقیہ ہوٹل کے مالکان ہاتھ پر ہاتھ دھرے انا ڑی کھوؤں کے منتظر بیٹھے تھے۔ ہم جب پان سے سُرخ رو ہو کر اس دُھواں دھار طعامستان سے باہر نکل رہے تھے تب بھی وہاں براہِ شکم ثواب دارین حاصل کرنے کے بہت سے آرزومند چاق و چوبند کھڑے آنکھوں کو کبابوں کی دُھونی دے رہے تھے، جبکہ ان کی آنتیں قل ھُواللہ کی تلاوت میں مصروف تھیں۔ ہمیں خود اپنے اور ایسے تمام 'بائوٹ' منتظرین کی 'خوار نیتوں' پر رحم مگر جھنڈا اور نذیر ہوٹل کے مالکان کے مقدر پر رشک آرہا تھا جن پر عقیدتمند رنگ برنگے نوٹوں کی بارش کر رہے تھے حالانکہ یہی دھندا کرنے والے دیگر "ہوٹل دار" آہیں بھر رہے تھے اور مُنہ تک رہے تھے۔

اس منظر سے ہمیں یاد آیا کہ ان ہر دو بھٹیاروں کا مقدر بھی شاید کراچی کے کبابی بندو خان کے کارخانے کا ہی ساختہ ہے جس کا فن سے دُور کا تعلق نہ ہوتے ہوئے بھی محض کراچی کے چٹوروں کی نظر کے بل پر کروڑپتی بن گیا اور اب کاروبار کو وسعت دے کر یونیورسل کرنے کے لئے دوسرے جہان میں ڈیرے ڈالے ہوئے ہے۔ یوں تو مرحوم کے لئے یہی کہا جائے گا کہ خدا انہیں جنت میں جگہ دے لیکن اس بارے میں مشکل یہ درپیش ہے کہ وہاں نہ آگ ہوگی نہ سیخیں جس وجہ سے شاید موصوف کا دل وہاں نہ لگا ہو اور انہوں نے بھی بے کار رہنا

پسند نہ فرمایا ہو اس لئے کسی زیادہ مناسب ٹھکانے پر پہنچا دیئے گئے ہوں۔

معدہ پرستی کے بھرپور مشن سے فراغت کے بعد ہم نے مزید جائزیاتی دورہ کیا اور اسٹالوں اور ان کا طواف کرنے والوں پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں اولڈ بوائز کے جدید ماڈلوں یعنی ہمارے میزبان بھائیوں نے ہم سے تاثرات وصول کرنے کا پروگرام شروع کر دیا اس لئے ہم نے بھی بے کم و کاست جب اور اب کے حالات بیان کر دیئے، اب ہم اپنے مخلص قارئین کی کباب پراٹھے سے تواضع کرنے سے تو معذور ہیں اس لئے کم از کم قلمی دسترخوان کو دراز کرنے کی کوشش کی ہے کہ شاید اس طرح انھیں بھی نمائش کی سیر کا کیف و لطف میسّر آجائے۔

جیسا کہ سابقون الاوّلون قسم کے اولڈ بوائز سے سنتے چلے آئے تھے اور پھر ہم نے خود بھی سالہا سال دیکھا کہ نمائش میں کباب پراٹھے کو رواج دینے کا سہرا ایک افغانی پٹھان کے سر ہے جو سہارنپور کے رہنے والے تھے ان کا ہوٹل خان کباب پراٹھا کے نام سے مشہور ہوا، ۱۹۴۸ء کے بعد یہ کراچی منتقل ہو گئے۔ جہاں بولٹن مارکیٹ پر کیفے ڈی خان کا آغاز کیا اس مطبخ میں کباب پراٹھوں کو محض ضمنی درجہ دیا گیا تھا لیکن دیگر تمام کھانے نہایت اعلیٰ معیار کے تیار ہوتے تھے۔ خان صاحب کراچی میں علیگ بھائیوں کو دیکھ کر خصوصی محبت کا اظہار کیا کرتے تھے، گرچہ بل میں تو پیسہ دھیلا کم کرنے کے قائل نہ تھے لیکن اخلاق تواضع میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے تھے، ہاں کبھی کبھی پلیٹوں میں سالن کی مقدار میں اضافہ کر دیتے تھے۔ کراچی میں جہاں سارے ہندوستان کے خوش ذوق طعام شناس موجود تھے خان صاحب کی خوب خوب پذیرائی ہوئی اور بہت جلد کیفے ڈی خان بہترین کھانوں کا مقبول ترین مرکز بن گیا۔ لیکن افسوس کہ اسحاق خان اپنی شہرت سے

فائدہ اُٹھانے سے پیشتر ہی دُنیا سے اُٹھ گئے، البتہ ان کے نام پر بٹہ لگانے کے لئے اسی نام سے ایک ہوٹل کراچی میں طارق روڈ کے قرب وجوار میں خالص پیشہ ورانہ لُوٹ مار میں آج بھی مصروف ہے لیکن ایسے مہذب جیب تراشوں کو موردِ الزام یوں نہیں ٹھہرایا جاسکتا کہ اس معاملے میں کراچی میں ہوٹلوں کے کاروباری "بہترین پیسوں میں بدترین غذا" کو مسلک بنائے ہوئے ہیں جن کی سرپرستی کے لئے بہت سے 'نوزرے' بدمذاق پائے جاتے ہیں۔ ہم نے اسحاق خان کو جب دیکھا تو وہ نہایت تندرست وتوانا خوبرو جوان تھے وہ بڑے ٹھاٹ سے کلاہ باندھے نمائش کی دکان پر بیٹھ کر اصلی گھی میں حلوہ پراٹھا و کباب تیار کرواتے۔ ان کے سرپان کے والد کا بڑا سا فوٹو سایہ فگن رہتا دراصل یہ بزرگ ہی برِصغیر میں کباب پراٹھے کے ممن خان سمجھے جاتے تھے، اس زمانے کا ایک پراٹھا ایک کلو سے زیادہ وزن کا ہوتا تھا اور جب وہ کڑکڑاتے گرما گرم گھی میں شرابور کڑھاؤ سے نکالا جاتا تو خانصاحب بڑی مستعدی سے اسے اپنے ہاتھوں سے ران پر رکھ کر توڑتے جاتے اور پھر تولتے جاتے یہ ایسا سین تھا جو دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس منظر سے ہر نووارد بہت محظوظ ہوتا اور تعجب یہ ہوتا تھا کہ خان صاحب اس آتشیں پراٹھے سے کس پھرتی اور برداشت سے دست آزمائی کرتے ہیں تو اس دور کے اور آج کے پراٹھوں میں فرق صرف اصلی ونقلی گھی ہی کا نہ تھا بلکہ اصلی ونقلی خان کا بھی تھا۔ چونکہ اب تو اس کاروبار میں محض بھٹیارے رہ گئے ہیں جن کی حیثیت نقالوں سے زیادہ نہیں۔ پھر گھی کا بھی ایسا ہی معاملہ ہے چونکہ دیسی گھی کی خوشبو ہی معدہ کُشا ہوتی ہے جبکہ بناسپتی کا نام سُن کر بھوک بن باس لے لیتی ہے۔ بالخصوص حلوے پراٹھے میں تو یہ فرق شدّت سے محسوس ہوتا ہے لیکن ایک گھی کا کیا رونا یہاں تو معاشرہ ہی نقلی گھی اور نقلی خانوں سے بھرا پڑا ہے، اَب تو کم اصل انسان ہی اصیل اور نقلی گھی اصلی سے زیادہ مُعتبر

مؤثّر و مُفید مانا جاتا ہے۔ جلوے پراٹھے کے بعد کباب کے معاملہ میں بھی خوب "کہبیل" ہوگئی ہے۔ چونکہ آزادی کے بعد کی پابندیوں نے لوازمات خصوصی سے بھی محروم کر دیا لیکن یہ تفاوتِ لذّت صرف وہی محسوس کرتے ہیں جنھیں اصلی کباب کھانے کا اتفاق ہوا ہے ورنہ دورِ حاضر کے ہر شائق میں گوشت میں خوردی بزرگی میں امتیاز کرنے کی صلاحیّت کہاں!

نمائش کے طعامستان کا ذکر اس وقت تک مکمل نہ ہوگا جب تک اس میں خورجہ کا اچار بھی شامل نہ کیا جائے۔ اَب خدا معلوم کہ اہل خورجہ نے شلجم سے رنگ اڑایا ہے یا شلجموں نے خورجیوں کا رنگ چُرایا ہے جس کی وجہ سے اس نے ایسا رُوپ پایا ہے کہ یہ لالہ رُخ اَچار، اچاروں کا پٹھان کہلانے کا مستحق ہے۔ پچھلے دَور میں تو کباب پراٹھا اور یہ اچار لازم و ملزوم سمجھے جاتے تھے، لیکن اب اس کے بھی پُرسانِ حال چند وضعدار قسم کے کھاؤ ہی رہ گئے ہیں جس کی غالباً یہی وجہ ہے کہ جب کباب پراٹھے کے رُتبے میں کمی واقع ہوگئی ہے تو پھر اچارِ بے چارے کو کون پوچھے؟ یہی سبب ہے جو خورجوی اچار کا نہ تو وہ معیار تھا نہ اس کی پُکار اور دُکانیں ہی واجبی تھیں۔ کراچی میں ہمارے بُزرگ دوست سلیم خان خورجوی ہر سال اچاری میں یہ خوشنما سوغات بھیج کر برسوں وضعداری نباہتے رہے لیکن جب سے وہ صاحب فراش ہوئے ہم اس خوش رنگ و خوش ذائقہ تحفے سے بھی محروم ہوگئے۔ خورجوی یار اب بھی دستیاب ہیں جو مخلص بھی ہیں مگر افسوس یہ کہ ان میں ماہرِ اچار ایک بھی نہیں اس لئے اس محرومی کا ازالہ ان کی دید سے کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ملاقات سے ہی کچھ لذّتِ اچار اخذ کر لیتے ہیں۔

یہاں یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ جب کھانے والے ہوٹلوں پر کنبھ کے میلے کے یاتریوں کی طرح ٹوٹ پڑیں گے تو وہاں صفائی و نفاست کا انتظام کیونکر ممکن ہے، یا پھر یوں سمجھئے کہ جب گاہکوں کو گندگی گوارہ ہے تو دکانداروں کو کیا پڑی

کہ وہ صفائی ستھرائی پر غیر ضروری خرچہ و توجہ کریں۔ لہٰذا ہم جیسے بعد مدت پلٹنے والے گاہکوں کے لئے برتنوں اور گھی میں تر بہ تر میزوں اور کرسیوں پر بیٹھ کر کھانا خاصا کراہیت خیز ہو جاتا ہے اس لئے دل کڑا کر کے نظریں بچا کر ہی کچھ ذائقہ اندوز ہوا جا سکتا ہے۔ گزرے ہوئے زمانوں میں ایسے ٹھکانوں پر پہنچ کر انسان کچھ سلیقہ مند ہونے کی کوشش کیا کرتے تھے، اِس لئے حفظانِ صحت کے اُصولوں کی کچھ چلتی تھی اب تو بیروں کے لباس اور مالکانِ ہوٹل کی پوشاک سے میل ٹپکتا نظر آتا ہے۔

اپنے اس تجرباتی دورے میں ایک اور بڑی تبدیلی جو ہم نے محسوس کی وہ یہ کہ پہلے ساری ضیافتیں، ہوسٹلوں کے ڈنر اور نجی دعوتیں سب رات کو ہی ہوا کرتی تھیں لیکن غالباً بارش سے بچ کر اطمینان خوری کیلئے اب پرانھا لنچ بھی ہونے لگے ہیں. عین ممکن ہے مقبولیت کی رفتار بڑھنے کے بعد صبح کے ناشتوں میں بھی نمائش کا مینو رائج کر دیا جائے ہم نے اس علاقہ خورد و نوش میں ممنوعہ ذات و برادری کے لوگوں کو جس بے تکلفی سے مصروفِ مشقِ تناول دیکھا اس سے ہندوستان کے سیکولر ہونے پر ایمان لانا پڑا. واقعی شراب و کباب جب کسی کے مُنہ کو لگ جائیں تو دین دھرم کوئی رکاوٹ نہیں بنتے۔ جب مسلمانوں کی علی الاعلان مے نوشی پر تعجب نہیں کیا جاتا تو ہندوؤں کی کباب خوری پر اعتراض کیونکر وارد ہو سکتا ہے۔

اب نسلِ نو کے نمائندگان شاید ہمارے اس رویہ تاثر سے ہم کو رجعت پسند کا نام دیں تو اس میں ان پر کوئی دوش نہیں اس لئے کہ ذوق جدید کے تقاضے یہی ہیں اب جس دور میں روشن آرا بیگم کی راگنیوں اور بیگم اختر کی غزل سرائیوں کی جگہ دُنیا نازیہ حسن کے 'ڈسکو' کی دیوانی ہو وہاں جھنڈا ہوٹل کے مقابلے میں اصلی خان کے پرانھوں کو کون پوچھ سکتا ہے؟ بہرحال تعجب انگیز بات یہ ہے کہ نمائش بینوں کی اکثریت نمائش جا کر قورمہ نان وغیرہ ہی کھانا پسند کرتی ہے لیکن

نمائش میں کھانے کا مطلب و معنی آج بھی کباب پراٹھا ہی سمجھے جاتے ہیں، اور اس طرح اس کے موجد کی رُوح کو ایصالِ ثواب ہوتا رہتا ہے۔

نمائش کے نام کے ساتھ کباب پراٹھے کا لاحقہ کس حد تک مُروّج اور مقبول ہو چکا ہے اس کا اندازہ آپ کو یہ واقعہ سُن کر ہو جائے گا۔

علیگڑھ میں ہم اپنی خالہ فہمیدہ بیگم کے یہاں قیام پذیر تھے دوپہر کا وقت تھا سب لوگ صحن کی دُھوپ میں بیٹھے گنّا خوری کر رہے تھے کہ ایک مَریل سی بُڑھیا بمشکل کراہتی رینگتی گھر میں نمودار ہوئی جسے دیکھتے ہی خالہ نے کہا "اے بڑی بی تم کہاں رہ گئی تھیں جو آج دو مہینے بعد پلٹی ہو"۔ بُڑھیا نے بیٹھ کر پہلے تو دو تین لمبی لمبی سانسیں لیں پھر لرزتی کانپتی آواز میں حالتِ زار بیان کرتے ہوئے بولی "بی بی میں تو ایسی بیمار پڑ رہی کہ مروں تھی نہ جیوں تھی اور کہوں تھی کہ اللہ میاں موت ہی دے دیتا تو اچھا تھا سردی الگ مارے دے ہے اَب بھی نہ جانے کس طرح ہمّت کر کے یہاں تک پہنچی ہوں کہ چلو مرنے سے پہلے ایک مرتبہ تم سب کو دیکھ لوں"۔ بُڑھیا کا یہ حال سُن کر ظاہر ہے کہ ہر ایک کو ہمدردی ہوئی، خالہ نے پہلے تو اس کا پیٹ گرم کرنے کے لئے گرم گرم پلاؤ کھلایا پھر شریر گرمانے کو ایک کمبل دیا اور کلیجے کی ٹیک کے لئے اتنی نقدی بھی دے ڈالی کہ بڑی بی کچھ آواز نکال سکیں۔ کھانا حلق سے تیر ہونا تھا کہ نیم مُردہ بُڑھیا نے آنکھیں بھی کھول دیں اور آواز کا 'والیوم' بھی بڑھ گیا۔ پھر مالکانہ حقوق جتانے کے لئے کمبل تہ کر کے س پہ یا تی ۔ر کر بیٹھ گئیں اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگیں۔ خیال تھا کہ اس پذیرائی سے بڑی بی مطمئن ہو کر واپسی کا اعلان کریں گی لیکن ابھی تک انہوں نے دلی خواہش کا اظہار تو کیا نہیں تھا تو رُخصت کیسے ہوتیں۔ چُنانچہ کچھ روہانسہ لہجہ بناتے ہوئے بڑی ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں "بیگم صاحب اب ہماری زندگی بھی کیا زندگی ہے۔

دس پندرہ روز سے سُن رہی ہوں کہ نمائش لگی ہے پر قسم لو جو حلوے کی صُورت دیکھی ہو یا پراٹھے کا کوئی نوالہ حلق سے تیر ہُوا ہو۔ اس سے تو موت ہی بھلی "۔

اَب اس سے بڑھ کر نمائش کی ہر دلعزیزی اور عوامی ہونے کا کوئی اور ثبوت نہ تو پیش ہی کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کی حاجت ہے۔ بلاشبہ اللہ میاں نے علیگڑھ کی نمائش کو جو مقبولیت عطا فرمائی ہے وہ دُنیا کی کسی اور نمائش یا میلے کو میسّر نہیں۔ آپ ساری دُنیا میں نمائشیں اور "فیئر" دیکھ لیں پر علیگڑھ کی نمائش دیکھے بنا کچھ کمی سی محسوس ہُوا کرتی ہے۔ اس کا لُطف ہی کچھ اور ہے، کیا عجب یہی خُفیہ خلش بیدار ہو کر نصف صدی کے بعد ہمیں وہاں لے گئی ہو۔

—·>·(※)·<·—

علیگڑھ اور اسمِ مسعود

یوں کہنے کو تو نام میں کیا رکھا ہے لیکن بعض برگزیدہ نام ایسے بھی دیکھنے میں آئے جو جائے قیام ہونے کے باعث موجب خیر و برکت ہوئے، جیسے اجمیر، بھٹ شاہ، کلیر وغیرہ۔ اسکے برعکس چند بستیاں اور شہر ایسے ہیں جن میں خاص ناموں کو عروج و شہرت حاصل ہوئی۔ کچھ ایسا ہی گہرا تعلق علیگڑھ اور اسم مسعود کے مابین پایا جاتا ہے۔ اگر آپ گزشتہ اسّی پچاسی سال کے نامور علیگڑھ اولڈ بوائز کے اسمائے گرامی کی فہرست پر نظر ڈالیں تو ہر دور میں کوئی نہ کوئی 'مسعود' اپنی صلاحیتوں اور خدمات کی بنا پر سرِ فہرست پائیں گے۔

ویسے تو نہ جانے کتنے 'مسعود' ہوں گے جنہیں علیگڑھ نے نوازا لیکن گزشتہ آٹھ دہائیوں میں کم از کم چھ سات نام ایسے نمایاں ہیں جن کی ہر دلعزیزی و شہرت ایام طالب علمی سے لے کر عمر کے آخری سن و سال بلکہ بعد از وصال بھی باقی ہے۔

'مسعودوں' کی قبیل کا سلسلہ جناب مسعود ٹامی کے نام نامی سے شروع ہوتا ہے جنہیں ان کی انوکھی شرارتوں نے ایسی شہرت دوام بخشی کہ آج تقریباً پون صدی گزرنے کے باوجود مسعود ٹامی کا نام ہر ذہن میں تازہ ہے اور ہر زمانے کے اولڈ بوائز ان کو اپنا ہی ساتھی اور "IDOL" سمجھتے چلے آئے ہیں۔ مسعود ٹامی صاحب، علی برادران کے ہم عصر تھے ان کی نت نئی ACTIVITIES کا احوال بیشتر تو سینہ بہ سینہ چلا

آیا ہے لیکن کبھی کبھار پرانے میگزینوں میں بھی یہ خاصے کی چیز میسّر آجاتی ہے۔ تاہم افسوس یہ ہے کہ علیگڑھ کے اس 'شریر جینیئس' کے کارناموں کو منضبط کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی اور اگر ہوئی ہو تو منظرِ عام پر نہ آسکی۔ ہمارا خیال تھا کہ 'نامورانِ علیگڑھ' کے مؤلفین مادرِ درسگاہ کے اس بے نظیر موتی کو ضرور رول کر لائیں گے، لیکن تعجّب کہ ان حضرات نے بھی اتنی "عظیم الشرارت" ہستی کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا یا پھر ان مرتّبین کے پرکھنے کا معیار و مذاق ہی ایسا ہو جسے بزبانِ علیگڑھ 'ڈے اسکالرانہ' ہی کہا جاسکتا ہے۔ خدا کرے اَب بھی کسی 'شوخی پسند' کے سَر میں یہ جستجو سما جائے اور وہ اپنا وقت 'مسعود نامی' پر تحقیق کرنے میں صرف کر سکے جو اُردو ادب کی خدمت ہو یا نہ ہو لیکن علیگڑھ یونیورسٹی اور اس کی شوخ و حسین روایتوں کے احیاء کا سبب بن سکتی ہے۔

مسعود نامی مرحوم کے دَور کے بعد علیگڑھ کے اُفق پر سرسیّد کے پوتے مسعود نمودار ہوئے ان کو تو علیگڑھ اس قدر 'راس' آیا کہ یہ 'راس مسعود' ہی بن گئے۔ راس مسعود صاحب مرحوم ایک غیر معمولی ذہین اور فعال اِنسان تھے جنھوں نے بحیثیت وائس چانسلر چند سال کوششوں میں ہی یونیورسٹی میں اِنقلابی ترقّی رونما کی سائنسی تجربہ گاہوں کا قیام ان کا ناقابلِ فراموش کارنامہ ہے۔ مختصر یُوں سمجھ لیجیے کہ حکیم الاُمّت علّامہ اقبال جن کی خدمات کا اعتراف کریں، انکی وفات پر مرثیہ لکھنے پر مجبور ہو گئے ہوں اور اس کو ملّت کا بھاری نقصان بیان کیا ہو اس کی بڑائی کا کیا ٹھکانہ ہو سکتا ہے اس نوحے کے دو اشعار ملاحظہ کیجیے ؎

زہی نہ آہ زمانے کے ہاتھ سے باقی — وہ یادگارِ کمالاتِ احمد و محمود
زوالِ علم و ہُنر مرگِ ناگہاں اس کی — وہ کارواں کا متاعِ گراں بہا مسعود

قوم کی شومئی قسمت سے ان کی زندگی بہت مختصر رہی اس لئے بلندیوں کی اس معراج پر نہ پہنچ سکے جس کے وہ اہل و مستحق تھے چنانچہ مسلمانانِ ہند ایسی جلیل القدر ہستی

کی خدمات سے جلد ہی محروم ہو گئے۔

راس مسعود صاحب کے وائس چانسلری کے دَور میں ہی ایک اور جوان سال مسعود علیگڑھ میں نمودار ہُوا لیکن اس نے کتابیں کاپیاں بالائے طاق رکھ کر کھیل کے میدان کا رُخ کیا اور کم عُمری سے ہی ہاکی کی دُنیا میں وہ نام پیدا کیا کہ شمالی ہند کے 'شیر' کا لقب پایا اور پھر ہاکی سے اسے ایسی کڑی اور دیرپا محبّت ہُوئی کہ سارے ہندوستان بلکہ افغانستان تک پہنچ کر ہاکی کی فتوحات سے علیگڑھ کا پرچم بُلند کرتا رَہا اور جب تک ہاتھوں میں دم رَہا 'ہاکی اسٹک' ہاتھ سے نہیں چھوٹی پھر جب 'اسٹک برداری' کی سکت نہ رہی تو کوئے یار کے چکّر کاٹنے اور کھیل کے میدانوں کا طواف کرنے میں ساری عُمر گزار دی یعنی مَرتے دم تک نشۂ ہاکی اس پر سوار رَہا۔ ہاکی کے ہر میچ کو عبادت جان کر دیکھنا، ٹیموں کی تشکیل پر اظہارِ خیال کرنا، اُبھرتے ہُوئے کھلاڑیوں کی حوصلہ افزائی کرنا اس کے محبوب مشاغل تھے۔

افسوس کہ ۱۵ اپریل ۱۹۹۱ء کی صبح رَمضان کے بابرکت ایّام میں ہاکی کا یہ عظیم کھلاڑی اور اَسّی سالہ عاشق فرشتوں کی سیٹی سُن کر اپنے 'آخری ٹور' پر روانہ ہو گیا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۔

سفرِ زیست حوادث کا سفر ہے یارو
کون کب تک ہے یہاں کس کو خبر ہے یارو

علیگڑھ کے اس مسعود ثالث کا نام سیّد مسعود الحسن زیدی تھا جس نے معمارانِ علیگڑھ کے گھرانے میں جنم لیا۔ آپ کے والد محترم میر ولایت حسین صاحب سرسیّد کے معتمدین میں تھے اور ساری زندگی تن من دھن سے کالج کے استحکام و ترقّی کے کوشاں رہے۔ مسعود صاحب اولادِ نرینہ میں سب سے چھوٹے تھے، اس لئے گھر بھر کے چہیتے تھے وہ سنہ ۱۹۱۰ء میں علیگڑھ میں پیدا ہوئے اس طرح وہ نہ محض

ایم اے یا بی اے علیگ تھے بلکہ پیدائشی علیگ تھے۔ آپ جوان العمری میں ہی یونیورسٹی اسکول کے طالب علم کی حیثیت سے اپنے کھیل کا لوہا منوا چکے تھے اس لئے ضرورتاً 'یونیورسٹی کی ٹیم' میں بھی شامل کر لئے جاتے تھے۔ ۱۹۳۲ء میں پہلی بار آپ یونیورسٹی کپتان ہوئے۔ آپ کی قیادت میں مشہور زمانہ یونیورسٹی ہاکی ٹیم نے بہت نمایاں کامیابیاں حاصل کیں اور ہندوستان کے بڑے بڑے ٹورنامنٹ جیت کر یونیورسٹی کی شہرت میں چار چاند لگائے۔ علیگڑھ میں آپ کا اپنا مکان حبیب اللہ منزل موجود تھا لیکن چونکہ ہوسٹل کی زندگی کے بغیر علیگڑھ کی تعلیم ادھوری رہ جاتی ہے، آپ بورڈنگ ہاؤس میں رہا کرتے تھے۔ ظاہر ہے گھر پر سیر و تفریح کھیل کود کے لئے بڑے میر صاحب کہاں اتنی چھوٹ دیتے۔ پھر ہوسٹل کی زندگی کا چسکا جس کو لگ جائے وہ وہاں رہائش کے ہزار جتن کرتا ہے چنانچہ بعض اکابر ایسے بھی تھے جنھوں نے ہوسٹل چھوٹنے کے ڈر سے امتحانات پاس کرنے سے عمداً گریز کیا چنانچہ ہمارے ممدوح کا بیشتر وقت ہوسٹل کے یاروں اور غُل غپاڑے میں گزرتا۔ ہاکی کے میدانوں میں جھنڈے گاڑنے کے بعد مسعود صاحب نے فٹ بال گراؤنڈ میں بھی قدم کاری شروع کر دی اور بالآخر ایک سال فٹ بال کی کپتانی بھی کر گزرے جس کے لئے انہیں خاصی تگ و دم بازی کرنا پڑی۔ زمینی کھیلوں سے ہٹ کر آپ کو تیراکی سے بھی خصوصی دلچسپی تھی اور علیگڑھ میں تو سوئمنگ پول ایسا شاندار تھا کہ تیرنا آتا ہو یا نہ آتا ہو کپڑوں جوتوں سمیت اس میں کود پڑنے کو جی چاہنے لگتا تھا۔ مسعود صاحب نے تیراکی میں بھی کچھ ہاکی و فٹ بال جیسے جوہر دکھائے اور اپنی اعلیٰ کارکردگی کی بنا پر سوئمنگ کلب کے بھی سکریٹری (کپتان) بنا دیئے گئے اس طرح انھوں نے کپتانی کی ایسی 'ہیٹ ٹرک' مکمل کی جو اپنی جگہ علیگڑھ میں ایک ناقابل شکست ریکارڈ ہے جہاں تک ہمارا علم ہے علیگڑھ میں دہرے کپتان تو گزرے ہیں جیسے بھائی اختر حسین صاحب جو کرکٹ اور اسپورٹس

کے مشہور کپتان تھے لیکن تین کپتانیوں کا سہرا مسعود صاحب کے علاوہ شاید ہی کسی اور سر کو نصیب نہ ہُوا۔

ویسے مسعود صاحب تو پیدائشی آل راؤنڈ اسپورٹس مین تھے اس لئے گلّی ڈنڈے سے لے کر کرکٹ تک تھوڑا بہت ہر کھیل میں ان کو دخل تھا وہ خاصی اچھی ٹینس کھیلا کرتے اور بڑے جمے ہُوئے ہاتھ لگایا کرتے تھے۔ کرکٹ کی ہال کی ٹیم میں بھی دُھنس جایا کرتے تھے اور کریز پر پہنچ کر کرکٹ بیٹ سے ہاکی کے اسٹروک لگا کر مدّاحوں سے داد وصُولتے تھے۔ افسوس کہ اس زمانے میں اسکواش کا کہیں دُور دُور تک اتہ پتہ نہ تھا ورنہ شاید ہاشم خان سے بھی پہلے وہ یہ کارنامہ انجام دے جاتے۔

کھیلوں کی دُنیا میں اتنا وسیع تجربہ رکھنے کی وجہ سے یونیورسٹی کے ساتھی اور متلدّین انھیں اُستاد مسعود کے نام سے پُکارنے لگے۔ مسعود صاحب نے بطور طالبعلم یونیورسٹی سے اپنا ناتا برقرار رکھنے کے لئے کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا درجہ بدرجہ منزلیں طے کرتے گئے کبھی بی ٹی میں داخلہ لیتے کبھی ایل ایل بی میں جُغرافیہ میں ایم اے کر لیا تو ہسٹری کی خبر لے ڈالی بڑی خیر یہ ہُوئی کہ ان ایّام میں علیگڑھ میں نہ تو انجینئرنگ کالج تھا اور نہ میڈیکل کالج ورنہ وہ یقیناً ان ہر دو اسناد کے حصول کے لئے کم از کم اُمیدواروں کے رجسٹر میں تو نام لکھوا ہی لیتے۔

اَلغرض جب کھیل کے تال سُر کچھ مدھم پڑے تو اُستاد نے کپتان گیری سے ترقّی کر کے کپتان گری کا شعبہ سنبھال لیا اور کپتان سازی کی خدمات انجام دینا شروع کر دیں۔ علیگڑھ میں دَور خواہ کسی بھی وائس چانسلر کا رہا ہو لیکن ہاکی کے میدان میں برسہا برس تک سکّہ مسعود زیدی کا ہی چلتا رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نہ صرف وہ سینئر کھلاڑیوں میں مقبول تھے بلکہ اساتذہ کرام بھی ان کا بے حد احترام کرتے تھے اور وہ ہر طبقے میں صائب الرّائے تسلیم کئے جاتے تھے مسعود صاحب نے ہندوستان کو جو چند

اچھے کھلاڑی دیئے ان میں میجر شکور اور ناصر علی جیسے شہرتِ لازوال کے مالک فارورڈ بھی تھے لیکن وہ جب نواز نے پر آتے تو بغیر کھیلے کپتان بھی بنا ڈالتے۔

اپنے زمانے میں مسعود صاحب کی علیگڑھ میں جس طرح تہ دِل سے عزّت کی جاتی تھی وہ مقام مقبولیت کسی اَور طالب علم یا کھلاڑی کو میسّر نہ آیا جس کی بڑی وجہ ان کی دَرد مندی تھی ان کے دل میں کھلاڑیوں کی مدد کا جذبہ موجزن رہتا تھا اور وہ اپنے ذاتی اثر و رسُوخ سے لڑکوں کے مُشکل سے مُشکل مسائل حل کروا دیا کرتے۔ یونیورسٹی میں لڑکوں کی پریشانیوں کی ابتدا داخلہ کے روز ہی سے ہو جاتی اور پھر یہ سلسلہ بورڈنگ ہاؤس میں جگہ، فیسوں کی معافی، حاضریوں کی کمی، امتحان کے اجازت نامے سے امتحان پاس کر لینے تک جاری رہتا۔ ایسے تمام سادہ و پیچیدہ امراض کے لئے مسعود صاحب کی حیثیت 'اَمرت دھارا' کی سی تھی اس لئے اس میں مُبتلا ان کا گھراؤ کئے رہتے۔ لیکن وہ زیادہ تر کھلاڑیوں کی خدمت پر اپنے کو معمور کئے رہتے۔ ایک مرتبہ ہم اپنے ایک ایسے دوست کو سفارش کے لئے لے گئے جن کو کھیل کے میدان کی کبھی ہَوا تک نہ لگی تھی ان کا احوال سُن کر مسعود صاحب نے نسخہ تو تجویز کر دیا لیکن کچھ بُرا سا مُنھ بنایا۔ خیر ان کا مسئلہ جب حل ہو گیا تو ہمارے پوچھنے پر بتلایا کہ "بھائی میں نے تو اپنے آپ کو کھلاڑیوں کی سروس کے لئے وقف کر دیا اس اناڑی کو تم کہاں سے پکڑ لائے تھے"۔

مسعود صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ جب وہ کسی کی سفارش کرتے تو بڑے دھڑلے سے سینہ سپر ہو کر کرتے۔ ٹرخانے والا معاملہ کبھی نہیں برتتے۔ ایک مرتبہ بی ایس سی فائنل امتحان میں ہماری حاضریاں حد درجہ کم ہو گئیں جس کی وجہ یہ تھی کہ علیگڑھ ہاکی ٹیم کے علاوہ رامپور، لکھنؤ، بدایوں وغیرہ کی ٹیموں کی طرف سے بھی ہم ٹورنامنٹ کھیلتے پھرے۔ اس سال امتحان کے بورڈ نے خصوصی رعایت برت کر ۵۵ فیصد حاضری والوں کو بھی امتحان میں شرکت کی اجازت دے دی تھی۔ بدقسمتی سے

ہماری حاضریاں کل ۴۴ فیصد تھیں مسعود صاحب کو ہمارے کیس کی نزاکت کا احساس تھا متعلقہ کمیٹی کی آخری میٹنگ ہونے والی تھی اس سے قبل انھوں نے کیپٹن حیدر خان صاحب مرحوم کو ساری داستان سنائی جو اس کے اہم رکن تھے۔ حیدر صاحب ہمیشہ سے طالب علموں کے جوشیلے طرفدار مانے جاتے تھے وہ آمادہ ہو گئے۔ پھر بھی میٹنگ شروع ہونے سے قبل مسعود صاحب ہمیں لے کر آفس پہنچ گئے تاکہ کمرے میں داخل ہونے سے پیشتر حیدر صاحب کو ایک بار یاد دہانی کرائی جا سکے میٹنگ شروع ہوئی۔ حیدر صاحب نے ہمارا مسئلہ اُٹھایا تو تمام دیگر ممبران نے سختی سے مخالفت کی۔ حیدر صاحب پھر حیدر صاحب تھے وہ کہاں شکست ماننے والے۔ معترضین نے جب کہا کہ ۴۴ فیصد والا تو کسی قانون کی رو سے اجازت کا مستحق نہیں۔ اس پر حیدر صاحب نے کہا کہ اگر بات قانون کی ہے تو ۵۵ والا بھی اتنا ہی غیر مستحق ہے لہٰذا وہ اجازت بھی منسوخ کی جائے۔ اس پر کافی گرما گرمی ہوئی تو حیدر خان نے کہا اگر چوالیس فیصد والا امتحان سے محروم رکھا جائے گا تو ۵۵ والے بھی امتحان نہ دیں گے۔ الغرض اجازت مل گئی اور حیدر خان جب کمرے سے باہر آئے تو معلوم یہ ہو رہا تھا کہ کوئی بڑا معرکہ سر کیے ہوئے ہیں اس لئے ہمیں نتیجہ دریافت کرنے کی ضرورت نہ ہوئی۔ مسعود صاحب نے البتہ حیدر صاحب کے سامنے ڈانٹ کر کہا "جاؤ اب پڑھنے پر ڈٹ جاؤ اب اگر فیل ہوئے تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔" اللہ کا شکر کہ اس نے مسعود صاحب کی سفارش کی لاج رکھی اور اس طرح ہم بی ایس سی علیگ بن گئے جو اس زمانے میں ایک بڑا کارنامہ مانا جاتا تھا۔ اس قسم کے نہ جانے کتنے واقعات مسعود صاحب کی تکیوں کے بہی کھاتے میں درج ہوں گے چونکہ اکثر ان کی بروقت امداد نے ہم جیسے کھلنڈرے نوجوانوں کے مستقبل کو تاریک ہونے سے بچا لیا۔

مسعود صاحب کے تعلقات کا پھیلاؤ تو سارے ہندوستان پر محیط تھا جہاں

جاؤ ان کے قدرداں پذیرائی کو موجود رہتے لہٰذا وہ اپنے ان یارانوں سے لڑکوں کی بے لاگ اعانت کرتے اور روزگار فراہم کرنے کی پوری کوشش کرتے ان کی فیض رسانی کی یہ ایسی ادا تھی جس پر وہ تاحیات عمل پیرا رہے۔ دوسروں کا بھلا کروانے کے لئے ہر جگہ پیش پیش ہو جاتے اور وہ اس شان سے کہ نہ صلہ کی تمنا نہ اجر کی آرزو۔ ایک زمانے میں پاکستان میں مسعود صاحب کے یارِ غار بہت بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے جہاں ان کے نام کی پرچی تعویذ کا کام کرتی تھی اور وہ ایسے تعویذ دینے میں کبھی تامّل نہیں کرتے بلکہ خوش ہوتے تھے۔

ہم جب علیگڑھ نصیب ہوئے تو مسعود صاحب نے کاروبار کا جھمیلا پال لیا تھا اور ان کا بیشتر وقت پانی پت میں کمبل سازی میں گزرتا اس لئے ہماری ٹیم کو ان کی معیّت حاصل نہ ہو سکی ورنہ بہت کچھ واقعات و حالات سے واقفیت ہو جاتی جو آج بڑے کام آتی۔ تاہم مسعود صاحب کے مزاج بلکہ افتادِ طبع کے تعارف کے لئے ان کی کتاب علیگڑھ کی یادیں علیگڑھ کی باتیں مشتے نمونہ از خروارے کا کام دیتی ہے جسے جب مسعود صاحب کی محفل میں شریک ہونا ہو اس کتاب کو پڑھنا شروع کر دے دم مطالعہ وہ یہ باور کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہاں مسعود صاحب خود موجود ہیں۔

دراصل مسعود صاحب کے پاس تو اتنی دلچسپ و دلگیر یادوں کا ایک ختم نہ ہونیوالا خزانہ تھا لیکن افسوس کہ ان کی زندگی میں وہ محفوظ نہ کیا جا سکا جس کی وجہ یہ تھی کہ اُن کے اہلِ خاندان اس مقام ارفع سے ناآشنا تھے جس پر مسعود صاحب فائز تھے اور جو واقف تھے وہ کوسوں پرے رہے۔ ہو سکتا ہے اہلِ لاہور کے حصّے میں کچھ مسعود پارے آئے ہوں چونکہ وہاں مرحوم اکثر علم و ادب کی محافل کی زینت بنتے رہے۔ امکان یہ بھی ہے انکے منقولات ضبط ٹیپ کر لئے گئے ہوں۔ طنز و مزاح سے بھرپور شگفتہ شگفتہ تحریروں کے علاوہ آخر عمر میں مسعود صاحب نے مزاحیہ شاعری سے

بھی چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تھی نمونہ ملاحظہ کرتے چلئے اور اس کبیر سنی میں طالبعلموں جیسی شوخیٔ طبع برقرار رکھنے کی داد دیتے جائیے۔ خدا کرے یہ منظوم شوخیاں بحفاظت ہوں تاکہ ان کے قدر شناسوں کی تواضع ہوتی رہے ؎

وعدہ کیا تھا آئیں گے بھیج دیا رقیب کو
ایسی اُٹھا پٹک ہوئی آنا پڑا طبیب کو

شیخ صاحب خدا کا خوف کرو خالی بوتل سے بھی نچوڑی ہے

۱۹۴۷ء میں پاکستان منتقل ہونے کے بعد علیگڑھ کے اس داتا نے جگت داتا کی نگری میں ایسا پڑاؤ ڈالا کہ پینتالیس سال وہیں گزار دیئے حتیٰ کہ اسی مٹی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ لاہور پہنچنے کے بعد بھی ان کی دیرینہ رفاقتوں اور شفقتوں کی روایتیں زور شور سے جاری رہیں اور اس آستانۂ قلندری سے اپنے پرائے برسہا برس اکتساب فیض کرتے رہے۔ پچاس اور ساٹھ کی دہائیوں کے دوران مسعود صاحب کے کتنے یار دوست اور 'جونیئرز' وفاقی، صوبائی وزیر اور گورنر رہے لیکن مسعود صاحب سے جب کبھی آمنا سامنا ہوتا تو وہ بحیثیت علیگ بھائی ہی ان کی پذیرائی کرتے اور بس۔ اب اگر کسی نے ذرا گردن ٹیڑھی کرنے کی کوشش کی اور انھیں تاؤ آیا پھر تو سرِ محفل وہ ایسی کھری کھری سنا دیتے کہ گورنر اور وزیر بغلیں جھانکنے لگتے۔ دراصل یہ علیگڑھ کی تعلیم کا ایک خاصہ تھا کہ آدمی خواہ کتنے ہی بڑے کے مدِ مقابل ہو لیکن اس کا رُعب قبول نہ کرے اور کسی طرح کی احساس کمتری کا اظہار نہ سرزد ہو۔ مسعود صاحب اس معاملے میں از حد حساس تھے اسلئے بڑائی کے چھوٹے دعویدار اُن سے ہشیار رہا کرتے۔

ہم جب پہلی مرتبہ مارچ ۱۹۴۹ء میں وارد پاکستان ہوئے اور علیگ داتا کے سلام کے لئے پہنچے تو اس زمانے میں وہ ایک بہت عالیشان کوٹھی واقع لارنس روڈ میں براجمان تھے۔ ہمیں دیکھ کر حسبِ عادت خوب زور سے ہنسے اور پھر کوٹھی سے بھی

زیادہ کُشادہ بغلیں ہماری پذیرائی کے لئے پھیلا دیں۔ ان کا پہلا سوال تُھا کب پہنچے؟ ہم نے عرض کیا کل۔ دُوسرا سوال تھا بستر بوریا کدھر ہے؟ ہم نے اپنے بھائی اشفاق خان کی طرف اشارہ کیا کہ ان کا مکان موجود ہے۔ بولے واہ یہ کیا بات ہُوئی، پھر ہمارا یہ اتنا بڑا مہمان خانہ کیا خالی رکھنے کے لئے ہے۔ حالانکہ جس مہمان خانہ کو وہ خالی فرما رہے تھے وہاں چھ سات نو وارد علیگ پہلے ہی سے موجود تھے۔ ہم تو بہر حال اپنے بھائی کے یہاں رہے لیکن نفسا نفسی کے اس عالم میں مسعود صاحب کی مخلصانہ پیش کش ہمارے دل میں گھر کر گئی۔ واقعی وہ علیگڑھ والوں کی ایسی ہی خبر گیری اور آؤ بھگت کیا کرتے تھے جتنی ایک سربراہ اپنے اہلِ خاندان کی کرتا ہے۔ دُوسرے دن ہمیں ہاکی میچ میں شرکت کی دعوت دے دی۔ یہی نہیں ہمیں مانگے تانگے کا جوتا اور ہاکی اسٹک بھی فراہم کروا دیا گیا جس کے بعد ہم تعمیلِ حکم بجا لائے گویا علیگڑھ چھوڑنے اور نئے دیس میں آنے کے بعد بھی وہ 'ہاکی' کی لگن سے غافل نہیں ہُوئے تھے بلکہ ان کا شوق ویسا ہی جوان تھا۔

پانی پت کے کمبل کے کارخانے کے عوض انارکلی میں مسعود صاحب کو کپڑے کی ایک بڑی دُکان الاٹ ہُوئی تھی۔ مسعود صاحب بیچارے دُکانداری کیا جانیں چنانچہ کچھ تو لالچی احباب نے مگر زیادہ تر ان کے اہلِ خاندان اور اعزائے نسبتی نے خوب خوب سلکیں پہن کر 'ریشم پوشی' کے ارمان پُورے کئے جسے دیکھو وہ شہ بالا بنا پھرتا تھا اس لئے سارا اسٹاک دو سال میں ختم ہو گیا۔ ظاہر ہے گھر والوں کو اس کا ضرور دُکھ ہُوا ہو گا مگر مسعود صاحب کی بھوں پر میل تک نہ آیا۔ ایک دن اُنھوں نے بڑے رازدارانہ لہجے میں ہم سے کہا 'ذاکر ہماری بیگم کہہ رہی تھیں کہ آپ کے لاڈلے دوستوں نے دُکان اُڑا دی تو میں نے ان سے کہا۔ اوّل تو ایسا ہے نہیں اور اگر ہے بھی تو تمہارے بُرا ماننے کا کیا موقع ہے۔ چونکہ دکان دی

بھی علیگڑھ کے دوست نے ہی تھی۔ اس جملے سے مسعود صاحب کی دوستی کے معیار اور استحکام کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے وہ دوستوں کا احسان بھی یاد رکھتے تھے اور ان کا حق بھی تسلیم کرتے تھے۔ فی زمانہ دوستی کے دعویدار یعنی حق جتانے والے تو بے شمار ملتے ہیں لیکن دوستی کا حق نبھانے والے اور دوست کا احسان یاد رکھنے والے ڈھونڈے سے نظر نہیں آتے۔

جب تک مسعود صاحب کی صحت نے ساتھ دیا وہ ہر سال کراچی آیا کرتے۔ وہ گھر سے پندرہ بیس روز کا 'ویزا' لے کر چلتے مگر قیام مہینوں رہتا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ مسعود صاحب کا کراچی میں ورود کچھ ایسی ہی شان و شوکت سے ہوتا جیسے بعض روحانی پیشواؤں کے نزول اجلال کے موقع پر کراچی میں دیکھنے میں آتی ہے جب ان کے مریدین پذیرائی کے لئے شعور کی حدوں کے پرلے پار پہنچ جاتے ہیں چنانچہ مسعود صاحب کے کراچی تشریف لاتے ہی ان کے معتقدین بلکہ نو مریدے اپنے اس 'پیر بے ریش' کا والہانہ استقبال کرتے اور ہمہ وقت ایسا گھیراؤ کئے رہتے کہ وقت کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ ان کی آمد سے مراجعت تک محفلوں، مشاعروں اور دعوتوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا پھر اس دوران 'ہاکی پیر' کی شان میں دو ایک میچ ضرور کھیلے جاتے تاش کی بازیاں گرم رہنا تو روز کا معمول رہتا۔ تاہم ان کا وقت خدمتِ خلق میں بھی گزرتا جس نے پکڑ لیا اس کے ساتھ سفارش کو چل دیئے جو انھیں لے جا نہ سکا اس نے پرچی لکھوالی جو تعویذ کا کام کرتی تھی۔ بہت سے مسائل ٹیلیفون کے ذریعے ہی طے کروا دیئے جاتے۔ الغرض مسعود صاحب جب بھی یہاں آتے مایوسوں کے لئے اُمید کی کرن، بیماروں کے طبیب حاذق اور احباب کے لئے روح افزا کی بوتل بن کر آتے۔ پھر ان کے لنگوٹیا یاروں میں سے بیشتر کراچی میں ہی رہائش پذیر تھے۔ جیسے خان صاحب انوار اللہ خان مرحوم۔ کلیم الرحمٰن خان شیروانی۔

نواب حسین علی خان۔ ناصر شاہ میر صاحبان جن کی موجودگی سے ان کی قیام گاہ ہوسٹل کا کمرہ بن جاتی ہم سے وہ علیگڑھ میں دس پندرہ سال سینیئر تھے اس کے باوجود جب بھی کراچی تشریف لاتے ہم پر خصوصی کرم فرمایا کرتے اور پھر کبھی کبھی مُسکرا کر مذاق میں کہتے 'بھائی میں اپنے جونیئرز کو زیادہ منہ نہیں لگاتا لیکن ذاکر نے کچھ ایسا پیڈھب پکڑ رکھا ہے کہ اس سے بغیر ملے طبیعت نہیں مانتی' واقعی ہم سے جس انداز مخلصانہ سے وہ اظہارِ شفقت فرماتے اس کے تصوّر سے آج بھی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔ ویسے تو بفضلِ خدا بہت سے مخلص ساتھی ابھی باقی ہیں اور بُزرگ علیگ بھائی بھی کرم فرمائی کو موجود ہیں لیکن ان سب میں دوسرا مسعود زیدی کوئی نہیں۔

پچھلے آٹھ دس سال سے مسعود صاحب ہوائی جہاز یا ریل کا سفر کرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ یُوں بلحاظ عُمر تو صحّت مند تھے لیکن کان کا کچھ ایسا مرض تھا کہ دَورانِ سفر سخت چکّر آنے لگتے تھے۔ الغرض اسی موذی مرض کی وَجہ سے احباب کراچی ان کی صحبتوں سے قطعاً محروم ہو گئے تھے اور ان کی کمی کو ہر ادنیٰ و اعلیٰ محسوس کرتا تھا۔ ہمارا بھی سال دو سال میں لاہور جانا ہوتا تو پہلے سلام حاضری ہوتی جو بہت تقویت اور ڈھارس کا سبب بنتی اس لئے کہ ان سے ہر ملاقات کے دوران کچھ نہ کچھ درس ملتا تھا اور کچھ یاد کرنے کی باتیں سُننے کو ملتیں اور کچھ حاصل کرنے کا موقع ہاتھ آتا تھا۔ ہماری آخری مُلاقاتیں ۱۹۸۶ء میں دو تین مرتبہ ہوئیں۔ شروع میں انہیں کافی کمزور دیکھ کر پریشانی سی لاحق ہوئی لیکن ان کی باتوں کی جولانی نے سب تفکّرات دُور کر دیئے۔ وُہی ہمیشہ کے سچ مچ کے مسعود صاحب کو اپنے سے مخاطب ہنستا بولتا دیکھ کر بڑا سکون ملا۔ اس صحبت کے بعد پیام و سلام کا سلسلہ تو بحال رہا لیکن مزید تفصیلی مُلاقات کا دِلی ارمان دل ہی میں رہ گیا۔ کئی بار سوچا کہ لاہور کا چکّر صرف اعزّہ احباب سے ملنے کے لئے لگائیں گے جس میں سب سے بڑی کشش مسعود صاحب کی ذات

تھی، نہ جانے کتنے سوالات دماغ میں اکٹھے کر لئے تھے کتنی معلومات اخذ کرنے کا ارادہ تھا لیکن خدا کو یہ منظور نہ تھا جس نے بغیر ایسا موقع فراہم کئے مسعود صاحب کو اپنے پاس بُلا لیا جہاں بہشتی سبزہ زاروں میں ان کے چاہنے والوں کا ہجوم پہلے استقبال پہلے ہی موجود ہے مثلاً ڈاکٹر طاہر رضوی صاحب، راجہ غلام محمد صاحب، انوار اللہ خان، طاہر شاہ خان، میجر شکور، ناصر علی، مختار صاحب گھوڑے، محمود بھائی، منن خان، جانڈی خان، کلیم الرحمٰن خان شیروانی جیسے جیّد علیگ اکٹھے ہیں اس لئے مسعود صاحب کی کپتانی، وہاں بھی پکّی ہے۔ البتہ پسماندگان میں یہاں کوئی اس قابل نہیں کہ 'مسعود الیون' کی قیادت کا بار اُٹھا سکے۔ مختصر یہ کہ مسعود صاحب کے رُخصت ہو جانے سے جو گدّی خالی ہو گئی اَب اس پر مسند نشیں دستیاب ہونے کا کوئی امکان نہیں چُونکہ اللہ میاں نے اولڈ بوائز کے بڑھیا بڑھیا نمونے تو چُن چُن کر جنّت میں پہلے ہی سجا کر رکھ لئے ہیں۔ چراغ راہ بیشک گُل ہوا لیکن نشان راہ باقی ہے جو نسلِ نو کے لئے بڑا عطیہ ہے ورثہ ہے۔ علیگڑھ کے ہاکی لان پر جب تک نونہالان ملّت کھیلتے رہیں گے مسعود صاحب کی یاد بھی تر و تازہ رہے گی محبّت کے ایسے سوتے کبھی خشک نہیں ہوتے۔

علیگڑھ میں تیس کی دہائی میں ایک اور کھلاڑی مسعود نامی بھی تھے لیکن ان کا نام مرکّب تھا یعنی مسعود صلاح الدّین، اپنے دَور میں وہ کرکٹ کے بہترین بلّے باز اور بولر تسلیم کئے جاتے تھے اور بلاشبہ ان کا شمار یونیورسٹی کے اعلیٰ کرکٹ کپتانوں میں کیا جاتا ہے اس لئے بحیثیت اولڈ بوائے بھی ان کی خاصی اچھی گریڈنگ ہے۔ پاکستان میں وہ قومی کرکٹ ٹیم کے 'سلیکٹر' بھی رہ چُکے ہیں اور کھیلوں کی دُنیا میں معروف مقام رکھتے ہیں۔ پیشے کے اعتبار سے پاکستان ریلویز چلاتے رہے جو واحد قومی محکمہ ہے جس نے ٹھیک سے چل کر ہی نہ دیا اور جس کا معیار قرونِ اولیٰ کی بیل گاڑیوں

سے کسی طرح بہتر نہیں کہا جا سکتا تاہم بھائی مسعود اپنی "چیتا جستی" کی وجہ سے محکمہ میں تیز گام گردانے جاتے تھے۔ فطری ریٹائرمنٹ کے بعد جو ہر پاکستانی افسر کے لئے سب سے بڑا اعزاز ہے لاہور ریلوے یارڈ میں ایستادہ ہیں۔ کبھی کبھی کراچی کا رُخ کرتے ہیں تو ابرار حسن خان، وہاب خان اور سلیمی صاحب جیسے اسٹیشنوں پر کچھ دیر کے لئے ضرور ٹھہرتے ہیں اور احباب کی محافل گرم کرتے ہیں۔ ان بزرگوں کے طفیل کبھی ہمیں بھی اظہارِ نیازمندی کا موقع مل جاتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ سن و سال سے بے نیاز ہنوز مرتبہ علیگیت پر اسی شان سے ڈٹے ہوئے ہیں۔

چالیس کی دہائی میں مسعود مرکب ناموں میں مختار مسعود کا درخشاں نام بھی آتا ہے جنھوں نے ڈگریاں تو ساری کی ساری علیگڑھ میں ہی حاصل کیں لیکن اپنی صفاتِ اعلیٰ کو پاکستان آکر بروئے کار لائے، وہ آج بھی پاکستان کے قابل و دیانت دار اور پڑھے لکھے بیوروکریٹس میں شمار کئے جاتے ہیں، انھوں نے جب قلم اُٹھایا اور دوست کو آواز دی تو ان کی اس صدا نے پاکستان کے علمی و ادبی حلقوں کو مسحور کر دیا۔ گویا پہلے ٹیسٹ میں نمودار ہو کر ہی سنچری بنا گئے۔ مختار مسعود نے جس دردمندی سے اپنی تحریر میں مادرِ درسگاہ کا ذکر کیا ہے وہ اس عشق لازوال کا آئینہ دار ہے جو انھیں علیگڑھ اور علیگڑھ والوں سے ہے۔ اپنی اہم سرکاری ملازمت کے دوران وہ جہاں بھی رہے شعر و ادب سے کبھی غافل نہ رہے گو کہ ان کا تعلق پاکستان کے طبقۂ کج کلاہان سے ہے اور وہ سکہ بند سی ایس پی بھی ہیں لیکن اکابر شعرا و ادبا کی خدمت گزاری کو وہ ہمیشہ اپنے لئے باعث سعادت مندی سمجھتے ہیں جو ان کی عقبیٰ اندیشی و مقبولیت کا راز ہے۔

"آواز دوست" کے بعد ان کا ایک اور قلمی شاہکار "سفر نصیب" نظر نواز ہوا۔ وہ سوچتے زیادہ سمجھتے اس سے بھی زیادہ لیکن اس کے مقابلے میں لکھتے بہت کم ہیں اور جب لکھتے ہیں تو اتنا ٹھوک بجا کر کہ ان کی تحریر شاہکار بن جاتی ہے۔ ابھی چند سال

پیشتر وہ حکومت پاکستان سے باعزت طریقے سے نجات پاکر داتا کی نگری میں علم افروز مساعی میں منہمک ہیں۔ کبھی کراچی آنا ہو تو اپنے بالے پن کے ساتھیوں کی صحبت میں لمحاتِ فرصت ضرور گزارتے ہیں۔ فی الوقت تو ہمیں یہ بتلانا مقصود ہے کہ علیگڑھ میں اسم مسعود سے برکات یافتہ ناموں میں مختار مسعود ایک درخشاں و تاباں نام ہے جو علیگڑھ کی نمائندگی کا حق ادا کرنے کا ہمیشہ خواہشمند نظر آتا ہے۔

آیئے اب پھر مفرد مسعودوں کی طرف پلٹتے ہیں، یوں تو ہمارے زمانے میں یعنی سنہ ۱۹۴۰ء کی دہائی میں بھی کئی نامدار مسعود تھے یعنی مسعود کالے، مسعود سینئر، مسعود چڑے، مسعود اندھے وغیرہ لیکن اس دور میں ہر دلعزیزی کے درجۂ اوّل پر فائز ہونے والی منّن خان کی ذات تھی، جن کا اصلی نام سیّد مسعود احمد تھا جیسا کہ آپ نے سُنا ہو مسعود زیدی صاحب مرحوم کھلاڑی ہی نہیں کھلاڑی گر بھی تھے جہاں کہیں بھی انھیں کوئی ہونہار نوجوان نظر پڑتا وہ اس پر جال ڈال کر علیگڑھ لے آتے۔ چنانچہ مسعود منن بھی آوردگانِ مسعود زیدی تھے۔ یوں تو منن خاں علیگڑھ میں ہاکی کے اچھے کھلاڑی ہونے کی وجہ سے بھرتی کیے گئے اور تین چار سال ٹیم میں بہترین کارکردگی کے بعد کپتانی کے منصبِ اعلیٰ تک پہنچے۔ لیکن علیگڑھ میں انھیں شہرت دوام اپنی ہاکی یا خدانخواستہ پڑھنے لکھنے کی وجہ سے حاصل نہیں ہوئی جس سے وہ سخت پرہیز کرتے تھے بلکہ اس کی دوسری وجوہات تھیں چونکہ مرحوم بڑے من موہن انسان تھے، دوست نواز، ہمدرد و مخلص اسی وجہ سے اپنے ساتھی طلبا کے علاوہ وہ اساتذہ میں بھی خاصے چاہے جاتے تھے۔ اس دور کے وائس چانسلر ڈاکٹر سر ضیاء الدین مرحوم تو انھیں اپنا معتمدِ خاص سمجھا کرتے تھے۔ یقیناً منن خان مستحق ہیں کہ ان کا خاکہ مرتب کیا جائے جو انہیں کی طرح مقبولِ عام ہوگا لیکن فی الوقت اتنا بتلانے پر اکتفا کرینگے کہ متاخرین کے اس مسعود نے جو غیر معمولی ہر دلعزیزی اور ناموری حاصل کی اس میں اس

کا کوئی ثانی نہیں اِس لئے آج منن خان کی رحلت کے پچیس تیس سال بعد بھی ان کے چاہنے والے ان کا ذکرِ خیر کرنے والے کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں جن میں بیشتر وہ ہیں جو محض شُنیدہ ہیں جنھوں نے منن خان کی جھلک تک نہیں دیکھی۔

سنہ ۱۹۴۰ء کی دہائی کے علیگڑھ کے ایک اور مسعود بھی بڑا ممتاز مقام رکھتے ہیں، لیکن کھیلوں کے نہیں علم و ادب کے میدان میں ڈاکٹر مسعود حسین خان بالیقین ایک وقیع اور نہایت معتبر نام ہے۔ ڈاکٹر صاحب ایسے اعلیٰ ادیب بلند پایہ محقق ماہر لسانیات سخن شناس و سخنور ہیں جو صحیح معنیٰ میں دانشور ہیں۔ ڈاکٹر صاحب یوں تو قائم گنجی پٹھان ہیں لیکن لب و لہجے اور چہرے مہرے پر دُور دُور پٹھنولی کی کوئی رمق محسوس نہیں ہوتی۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے جب وہ شعبۂ اردو میں نئے نئے لیکچرر مقرر ہو کر علیگڑھ آئے تو طالب علم ان کے لیکچر سے زیادہ ان کے حسن و جمال کے مداح نظر آتے تھے، وہ نہایت نرم خو اور شیریں گفتار کہے جاتے ہیں، سُرخ سپید رنگ اس پر مستزاد۔ انہوں نے علیگڑھ میں اُستاد اور طالبعلم دونوں حیثیتوں میں غیر معمولی شہرت و مقبولیت پائی اور جامعاتِ عالم میں علیگڑھ کا پرچم بلند کرتے رہے اور بالآخر امریکہ، کشمیر، دہلی وغیرہ کے چکر کاٹ کر یہ ثابت کرنے کہ زمین گول ہے مرکزِ آرزو واپس پہنچ گئے ہیں جہاں عمر کے آخری دور میں 'حُبِ علیگڑھ' کا حق ادا کر رہے ہیں، وہ ایک عالمی شہرت یافتہ شخصیت کے مالک ہیں اور نامورانِ علیگڑھ میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں، ہمیں اس محرومی پر افسوس ہے کہ اپنے دَور کے ایسے ذی علم علیگ اور عالی پٹھان سے شرفِ نیاز حاصل نہ ہو سکا اس لئے جتنی خوشبو ان کی تحریروں سے حاصل ہوئی اور ان کی ہمہ گیر شہرت سے جو نتیجہ اخذ کیا وہی قلمبند کر دیا جس میں بلاشبہ تشنگی پائی جاتی ہے۔ البتہ مسعود حسین خان صاحب کے معاملے میں جو کسر رہ گئی، کبھی مقدر کی یاوری سے باریابی ہو سکی تو اس کمی کا ازالہ کرنے کی کوشش کریں گے۔

سطورِ بالا میں ہم نے مجملاً 'مسعودانِ علیگڑھ' کا ذکر کیا ہے جس میں ظاہر ہے ہمارا موضوعِ سخن ہمارے گرد مسعود زیدی صاحب تھے لیکن ان کے ذکرِ خیر کے ساتھ ساتھ ہم نے اس تذکرے میں دیگر مسعودانِ سابق و حال کو بھی شامل کیا ہے جس سے کم از کم یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ مسعودوں کو سرزمینِ علیگڑھ کس قدر سازگار ہے۔ ہو سکتا ہے سہوِ حافظہ سے کسی مسعودِ موعود کا نام احاطۂ تحریر میں آنے سے رہ گیا ہو تو اس کے لئے ہم قابلِ معافی ہیں۔ اسی طرح مُرشدی مسعود زیدی صاحب کے علاوہ دیگر مسعودگان کے تذکرے میں جو کمی محسوس کی جائے وہ بھی لائقِ معذرت اس لئے ہے کہ سرِدست ان حضرات کے کارہائے نمایاں کا تذکرہ پیشِ نظر نہ تھا ورنہ ان میں سے سب ہی پر بہت کچھ لکھا جانا چاہیئے۔ اُمید کہ قارئین محترم ہماری اس 'مختصر قلمی' پر قناعت فرما کر اس کوشش کو فقدانِ احترام پر محمول نہ کریں گے۔

اَب جہاں تک سال ۱۹۵۰ء کے بعد سے تادمِ تحریر معاملہ ہے جو ۴۲ سال کی بات ہے، ہمیں اُمید ہے کہ ان برسوں میں بھی علیگڑھ 'مسعود خیز' رہا ہوگا، تاہم سرحدِ یار سے آنے والے ناموں میں کسی جُغادری مسعود کا نام ابھی تک کان میں نہیں پڑا۔ کیا اچھا ہو اگر ہمارے جوان العمر علیگ بھائی اس کام کو بڑھاتے ہوئے نئے مسعودوں کو دریافت اور متعارف کروائیں۔

خداوندا ہم میں موجود مسعودوں کی عُمریں دراز اور شہرت میں اضافہ کرے اور مرحومین کو جنّت کے 'فردوس ہال' کے 'بیک رُومز' الاٹ فرمائے۔ آمین

—·)·>·(※)·<·(·—

www.taemeernews.com

وفائے عزم

بسا اوقات زندگی میں ایسے واقعات بھی رونما ہوتے ہیں جن پر وقت کی گرد جمنے نہیں پاتی اور تازگی برقرار رہتی ہے۔ چنانچہ لگ بھگ نصف صدی گزرنے کے بعد بھی اس وقت ہمارے ایک محترم اُستاد ہماری نظروں میں سمائے ہوئے ہیں اور ہم گویا کلاس رُوم میں ان کا لیکچر سُننے میں محو ہیں۔ دراصل ان کا سراپا ہمارے ذہن پر ایسے انمٹ نقوش مرتسم کر گیا ہے جس کی وجہ سے ان کی شبیہ عند الطلب ہمارے رُوبرو موجود ہو جاتی ہے۔ یہ بزرگ ایک خاندانی عالم تھے، غالباً لکھنؤ سے بھی اُن کا کچھ تعلق تھا۔ افسوس کہ ہمیں اپنے شفیق اُستاد کا نام یاد نہیں اس لئے مولینا جمالی لکھے دیتے ہیں۔ ہم نے علیگڑھ میں دینیات کے کئی اُستادوں کے آگے زانوئے ادب طے کئے مثلاً مولینا راغب بدایونی جن پر ایک جذب کی کیفیت طاری رہتی، لیکن اپنے کام سے کبھی غفلت نہیں برتتے۔ مولوی وصی صاحب سے بھی واسطہ پڑا جنکا کانپور سے تعلق تھا جو خود ایک گرانڈیل انسان تھے لیکن ڈنڈا اپنے سے بھی زیادہ کڑیل اور قدآور رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے علیگڑھ والوں نے انھیں مولوی ڈنڈا کا خطاب دیا تھا۔ سُنا ہے اَب بھی یونیورسٹی کی جامع مسجد میں آل ڈنڈا ہی امامت پر فائز ہے۔ انکے علاوہ مولینا عابد شبّر صاحب تھے جو شیعہ مسلک کے طلباء کو دینیات کا درس دیتے تھے۔ مولینا خوبرو اور خوش خُلق تھے۔ بالعموم لڑکے ان کی بہت عزّت کرتے تھے لیکن

حق بات یہ ہے کہ حُسن وجمال اور سج دھج کے معاملہ میں مولٰینا جمالی کا کوئی ہمسر نہ تھا۔ مولٰینا بڑے پری پیکر واقع ہوئے تھے۔ روئے مُبارک میں مشرقی خدوخال کا بہترین امتزاج پایا جاتا تھا۔ ڈاڑھی کی اچھی طرح دیکھ بھال رکھتے تھے۔ تاہم مطلع رُخسار پہ سفید بال بھی طلوع ہونے کی گستاخی کر چکے تھے۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں وہ کوئی پینتالیس پچاس کے پیٹے میں ہوں گے لیکن چھب جوانوں جیسی تھی۔ لباس کے معاملے میں جمالی میاں اُجلے پوش بھی تھے اور جامہ زیب بھی۔ نفیس ململ کا انگرکھا پہنا کرتے تھے۔ سر پہ مکلّف ترچھی دوپلّی خوب بہار دکھاتی اور پاؤں میں سلیم شاہی پہن کر شوخ گامی فرماتے۔ اس حُلیۂ نگاراں میں جب جانِ مولویاں کلاس میں داخل ہوتے تو کوئی گمان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ایسے حسین پردے میں شعبۂ دینیات کا معلّم ہو سکتا ہے۔ مولٰینا کا یہ بانکپن دیکھ کر کوئی انھیں میرؔ و غالبؔ کا مطلوب کہتا تو کوئی عروس الاساتذہ پکارتا مگر لکھنؤ کے بانکے پر سب کا اتفاق تھا۔ پھر مولٰینا کا اندازِ تدریس اور لب ولہجہ عام اساتذہ سے مختلف تھا جس میں مولویت کی بُو دُور دُور تک نہ تھی بلکہ اس کے بجائے دورانِ تقریر شمامۃ العنبر کی مہک آتی تھی اور جب وہ گفتگو کرتے تو معلوم ہوتا لکھنؤ کی کہنیاں (ریوڑی) چبا رہے ہوں۔

مختصر یہ کہ اپنی وضع قطع سے مولٰینا بیک وقت ایک رُومانی شاعر اور محبوبِ دلرُبا معلوم ہوتے تھے ہم اُس زمانے یعنی سنہ ۱۹۴۰ء میں علیگڑھ کی نحیف ترین مخلوق کے زمرے میں سمجھے جاتے تھے۔ چونکہ فرسٹ ایئر کے اسٹوڈنٹ ہونے کے خطاوار تھے۔ دینیات کی کلاسوں میں علیگڑھ میں لڑکے بالعموم شرکتِ غائبانہ کا فریضہ انجام دیا کرتے تھے بلکہ ایسی کلاسوں سے غیر حاضری سینیارٹی کی کچھ شان سمجھی جاتی تھی۔ تاہم بوقت امتحان کسی "فارن ایڈ" یا اسلحے کی حاجت نہیں پڑتی تھی چونکہ دینیات کا بیشتر نصاب اُس دَور کی گھریلو تعلیم و تربیت کا ایک جزو تھا جو

اس اِمتحان کی کامیابی کے لئے کافی تھا۔ ویسے ایّام جوانی میں ایسے مضامین کچھ عُمر سے مُطابقت نہیں رکھتے اس لئے اساتذہ بھی فریضۂ اُستادی بجالانے سے زیادہ حق تنخواہ بنانے کے خواہاں رہتے تھے۔ لیکن جمالی صاحب کی شخصی دلآویزی کے ساتھ ان کا اندازِ تکلّم بھی اس قدر دلنشیں تھا کہ کھلنڈرے، بھی ان کے گھنٹے میں ضرور حاضر رہتے۔

ایک مرتبہ کلاس میں مولینا نے 'صِدق' پر جو پُر تاثیر خطبہ دیا اس پر مکمّل عمل پیرا تو ہم آج تک نہ ہوسکے نہ آئندہ اِمکان ہے البتہ ان کے بیان کردہ صِدق کی جملہ اقسام ابھی تک ویسی ہی ازبر ہیں۔ انھوں نے صِدق کی توضیح کرتے ہوئے فرمایا "صِدق چھ معنی ہوتا ہے اور ان سب معانی پر پُورا اُترنے والا شخص صِدّیق کہلایا جاسکتا ہے۔ وہ قسمیں یہ ہیں: "صِدقِ قول، صِدقِ عمل، صِدقِ نیّت، صِدقِ عزم، صِدقِ وفائے عزم اور صِدق جُملہ مقاماتِ دین"۔ مولینا نے یہ تنبیہ کیا کہ "یُوں تو صحیح کی نیّت کرنے سے لے کر عمل کرنے تک مراحل ہی مراحل دَر پیش ہوتے ہیں لیکن صِدقِ وفائے عزم کے لئے بڑے سخت اِمتحانوں سے گزرنا پڑتا ہے کیونکہ اس کا نبھانا ہر کس و ناکس کے بس میں نہیں۔

سچّی بات تو یہ ہے کہ اُس وقت ہماری بساط ہی کیا تھی جو صِدق کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کر کے گوہرِ مقصود نکالتے اس لئے محض اقسام کو یاد کرنے پر اکتفا کیا اور اسی دَرس سے ابھی تک جیسے تیسے کام چلا رہے ہیں کیونکہ ہر موقع و محل پر مولینا کا یہ سبق یاد آتا رہتا ہے۔

وہ اساتذۂ کرام جو حُسنِ ظاہر کے ساتھ طالب علموں کو اپنی طرف مُتوجّہ رکھنے کا ڈھنگ بھی جانتے ہوں جلد ہر دلعزیز ہوجاتے ہیں۔ لامحالہ جمالی صاحب دینداروں میں ہی نہیں دین بیزاروں میں بھی مقبول ہو گئے۔ چنانچہ اوائل ۱۹۴۱ء میں

مولینا کی کلاس میں عدم تشریف آوری ساری کلاس کے لئے باعث تشویش ہوگئی۔ ابتداً یہ کسی نے اُڑادی کہ مولینا کا انگر کھا علیگڑھ کی سردی کے ہاتھوں مات کھا گیا اس لئے مولینا گھر پر چت پڑے ہیں۔ پھر سننے میں آیا کہ گومتی کی مست ہوا کھانے لکھنؤ گئے ہیں۔ ابھی ہم لوگ ان کی روپوشی سے شش و پنج میں ہی مبتلا تھے کہ ایک دن کلاس میں مولینا راغب بدایونی صاحب تشریف لے آئے۔ اب مولینا جیسے درویش صفت عالم کی آمد تو سر آنکھوں پر لیکن ساری فکر تو اپنے پری وش مولینا کی پُراسرار گمشدگی کی تھی، جوں جوں دن گزرتے گئے مولینا کی فرقت زیادہ ستاتی رہی سب سے بڑی پریشانی یہ لاحق تھی کہ کسی ذریعے سے کوئی خبر ہی نہیں موصول ہو رہی تھی اِدھر راغب صاحب جس دلجمعی سے اپنے تدریسی فرائض انجام دے رہے تھے اس سے یہ اندیشہ ہو رہا تھا کہ جمالی صاحب کا فراق دائمی نہ بن جائے۔ خدا خدا کر کے لکھنؤ سے آنے والے ایک ہم جماعت نے یہ نوید سنائی کہ مولینا لکھنؤ میں ہی ہیں اور 'بینی گارڈ' کے سبزہ زار پر علی الصبح چہل قدمی کرتے دیکھے گئے ہیں۔ الغرض اسی عالم اُمید و بیم میں جب دو تین ماہ بیت گئے تو اُڑتی اُڑتی یہ خبر سنی کہ مولینا 'رومانِ عالمانہ' فرما رہے تھے۔ اس رنگین خبر کو تسلیم کرنے میں گنجائش اس لئے نہ تھی کہ مولینا جوانی کے ایام میں ہی اپنی اہلیہ سے محروم ہو چکے تھے اور چھوٹے چھوٹے بچوں پر سایہ فگن تھے۔ گویا درس و تدریس سے زیادہ اُمورِ خانہ داری اور کنبہ پروری کی ذمہ داریاں اُٹھائے ہوئے تھے، مگر جب مزید معلومات فراہم ہوئیں اور پتہ چلا کہ مولینا کی نظرِ انتخاب کسی ناکتخدا پر پڑنے کے بجائے انھوں نے حق شفع استعمال کرنا مناسب سمجھا اور ایک منکوحہ غیر پڑوسن پر ہی ڈورے ڈال دیئے۔ یہ سلسلہ اگر پینگوں تک ہی محدود رہتا تو کیا ہی اچھا تھا مگر مولینا نے لگے ہاتھ 'صدقِ وفائے عزم' کا بھی مظاہرہ کر ڈالا اور رہ عشق میں 'عبا و قبا' کی بھی پروا نہ کی۔ پھر جب یہ واردات ظالم سماج کے کانوں تک پہنچی

اور حفظِ اہلیہ تقدّم' میں پڑوسیوں نے اس دینی رُومان کی داستان یونیورسٹی کے اَرباب حَل و عَقد کو پُہنچا دی تو انھوں نے مولینا سے زیادہ شعبۂ دینیات کے تقدّس کو بَرقرار رکھنے اور یونیورسٹی کے ماحول کو مزید رُومان خیزیوں سے بچانے کے لئے کہانی کے ہیرو کو ہی' فارغ خطی' دے دی۔ چنانچہ اس خبر کے اَلَم نشرح ہونے سے پیشتر مولینا گومتی کے کنارے بَن باس لے چُکے تھے کیسے لکھیں کہ ہمیں اپنے ان محبُوب اُستاد کی جُدائی کس قدر شاق گزری اور ان کے شاگردوں نے داغِ مُفارقت کا صَدمہ کتنی مُشکل سے بَرداشت کیا اَلبتہ ہمیں جس اَدا پر ناز تھا وہ یہ کہ مولینا جیسا کہتے تھے ویسا ہی کر بھی گزرے۔

واقعی مولینا نے کس صاف پیشگوئی سے کام لیا تھا جب یہ فرمایا تھا "صدقِ وَفائے عزم کے لئے بڑے امتحانات سے گزرنا پڑتا ہے اس کا نبھانا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں"۔ افسوس کہ ہم جیسے کم ہمّت شاگرد محض سبق کی گردان پر عُمر گزار دیتے ہیں لیکن توفیقِ عمل کا حوصلہ نہیں پاتے! اس لئے اَپنے حال میں مست و مگن رہتے ہیں مگر اس بدتوفیقی کا مثبت پہلو یہ سامنے آیا کہ بسا اوقات پست حوصلگی بھی دافعِ رُسوائی ہو سکتی ہے۔

www.taemeernews.com

کپتان سبھا

ہم سب کے محبوبِ زمانے میں معروف ایک بزرگ کو بڑے دور کی سوجھی اور کیا خوب سوجھی جس سے انھوں نے یہ ثابت کر دکھایا کہ وہ محض نام ہی کے معروف نہیں کام کے بھی معروف ہیں۔ حسنِ صورت کا ہم پلّہ حسنِ سیرت، ملنساری میں وضعداری، مدارات میں انکساری اور کھیل سے عشق جاری، بڑوں کا احترام چھوٹوں کی ناز برداری، ان کی شہرت و مقبولیت کے اسباب ہیں۔ معروف صاحب شیخ بھی از قسم تیلی نہیں جن کی شیخی باران تیل کی مرہونِ منت ہے بلکہ موصوف پیدائشی شیخ بھی ہیں اور معروف بھی ہیں۔ اب یہ ان کی کسرِ نفسی بلکہ بڑائی ہے کہ چھچھوروں کی طرح شیخی بھگارنے کے بجائے وہ ہمیشہ سے ایس ایم معروف لکھتے اور کہلواتے چلے آئے ہیں۔ یوں تو ان کے وسیع خاندان میں انواع و اقسام کے شیوخ پائے جاتے ہیں لیکن علیگیانِ قدیم کا اس پر اجماع ہے کہ ان کے مقابلے کا شریف النفس علیگ بھائیوں سے ٹوٹ کر محبت کرنیوالا اور اپنے علیگ ہونے پر مستقل ناز کرنے والا ان کے سارے کنبے میں نہ دیکھا گیا نہ سنا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ معروف بھائی ملائشیا کے گھاٹ کا پانی پی رہے ہوں یا رہ گزرِ حرمین کے دروازے پر زائرین اور حجّاج کی خدمت میں مصروف ہوں، وہ کراچی میں اعزّا و احباب سے تجدیدِ ملاقات فرمانے آئے ہوں یا چاٹگام پر لنگر انداز ہو کر مشرقی پاکستان کی ہوا کھا رہے ہوں۔ وہ نہ تو کبھی علیگ بھائیوں کو بھولے اور نہ ہی

ٹینس کا خیال ان کے دل سے کبھی گیا۔

اللہ اللہ کر کے معروف بھائی طویل الخدمتی کا شاندار ریکارڈ بنا کر، مدّتوں جہاں گردی و جہاں بینی کے بعد سابق دارالقرار و حال دارالفساد کراچی آ چکے ہیں اور کے ڈی اے اسکیم ۱ میں جو نیجو اعظم کی ذاتی رہائش گاہ کے اُدرے دھورے ہی شیخ ڈم (SHAIKH'DOM) بنالی ہے۔ معروف بھائی محبّت کے معاملے میں مُساواتِ محمدیؐ کے قائل ہیں اس لئے اپنے دوستوں سے بہن بھائیوں کی طرح پیار کرتے ہیں اور ان کی دلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ آپس میں لوگ باگ کسی نہ کسی بہانے وقتاً فوقتاً ملتے رہیں۔ غُل غپاڑہ کرتے رہیں تاکہ پھیپھڑوں کو تازہ آکسیجن اور معدے کو مرغوب غذا ملتی رہے اور اس طرح چند ساعت کیلئے ہی گردشِ افلاک کے چکّروں سے پیچھا چھوٹا رہے۔ اپنی اس سوچ کو عملی رنگ دینے کے لئے انھوں نے "کپتان مین" کی ایک شاندار سبھا رچا ڈالی جسمیں کوشش یہ کی گئی تھی کہ علیگڑھ کے ہر دور اور ہر کھیل کے کپتانوں کو اکٹھا کیا جائے۔ یہی نہیں بلکہ ان حضرات کی حوصلہ افزائی کے لئے جو نے پُرانے چمچے اور زوردار تالیاں بجانے والے بھی ڈھونڈ نکالے۔ اپنی نوعیت کا یہ پہلا اجتماع پیر ۱۳ جولائی ۸۷ء کو ۸ تا ۱۱ بجے شب معروف خانہ پر بہت سلیقے سے منعقد ہوا جس میں تقریباً تمام کھیلوں کے سابق کپتانوں نے شریک ہو کر گھر کو اسپورٹس کمپلکس بنا دیا۔ رسمیات سے مُبرّا اس بزم میں کٹیلے فقرے سُننے کو ملے جو نانِ کہنہ دیکھنے کو اور ذائقہ دار کھانے کھانے کو ملے۔ ہر پُرتکلف ڈِش کے ساتھ زیادہ سے زیادہ بے تکلفی روا رکھی گئی۔ اپنی نشستوں پر براجمان بظاہر جو وہ نظر آ رہے تھے کھانے کی میز پر پہنچ کر سب بوائے ثابت ہوئے۔ حتیٰ کہ ذائقہ دار کھانا کھا کر گولڈ بوائے بن گئے۔ کرکٹ والے رَن بنا رہے تھے اور وکٹ لینے کے کوشاں تھے۔ شروع شروع میں میزبان کی اعلیٰ سروس کے سامنے ٹینس والے ناری

نظر آئے لیکن تھوڑی دیر بعد انھوں نے بھی شاندار 'اسٹروکس' اور 'والی' دکھا کر خوب 'گیمز' بنائے۔ رہے ہاکی والے تو وہ 'شارٹ' اور 'تھرو پاس' سے 'ٹیم ورک' کا مظاہرہ کر رہے تھے اور جب کبھی 'فارورڈ' دسترخوان کے 'رِنگ' میں پہنچتے تو ان کے درمیان گھرے ہوئے معروف بھائی 'گولی' کی طرح بے دست و پا نظر آتے اور لطف کی بات یہ کہ گولی صاحب گول کھا کھا کر اس طرح مسکراتے جاتے جیسے یہ گول ان پر نہیں کئے جا رہے ہیں بلکہ ان کی ٹیم گول بنا رہی ہے اور اس میں شک بھی کیا ہے ایک ہاکی کیا اس وقت تو ساری ٹیمیں اور سارے کپتان ان کے اپنے ہی تھے۔

کھلاڑیوں کے اس پہلے ملن میں محمود خان صاحب شریک تھے جو سب سے زیادہ سینئر تسلیم کر لئے گئے اس لئے صوفۂ صدارت ان سے سجا دیا گیا۔ محمود خاں صاحب جو تیسری پشت سے علیگ ہیں اور انھیں ایم اے او کالج کی طالب علمی کا شرف ۱۹۱۰ء میں حاصل ہوا انھوں نے اس کالج کو یونیورسٹی بنتے بھی دیکھا، اور ۲۵-۱۹۲۰ء میں ٹینس کے کپتان رہے۔ ہمیں یقین ہے کہ علیگڑھ ٹینس کلب کا اتنا پرانا ماڈل برصغیر میں اب کہیں دستیاب نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اہل محفل ایسی نعمت غیر مترقبہ کو دیکھ دیکھ کر ہی مزے لے رہے تھے۔ ڈی آئی جی پولیس کے اہم عہدہ سے ریٹائر ہو کر محمود خاں صاحب نینی تال کی چوٹیاں سر کرتے رہے اور اب ساحل کلفٹن کی پُرکیف لوری کا اثر رکھنے والی ہوا کھا رہے ہیں۔ اولڈ بوائز کی اس خصوصی بزم میں ان جیسی بزرگ اور مخدوم ہستی کی شرکت کا سہرا ان کی علیگ اسپرٹ اور ان کے بھائی اسلم خان کی محبت اور ہمت کے سر ہے۔ اسلم خان خود اپنے دور میں یو۔پی خصوصاً روہیلکھنڈ کے ہر دلعزیز سیاستداں اور نہایت ذہین و کامیاب وکیل رہے ہیں لیکن اب ہر اچھے برے کام سے توبہ کئے ڈاکوؤں کی عملداری ڈیفنس سوسائٹی میں خود اپنے ہی گھر میں غیر محفوظ طور سے

آباد ہیں۔ خدا انھیں ہمیشہ شاد بھی رکھے۔ محمود خان صاحب گرچہ ٹینس کے کئی سال چیمپئن رہ چکے ہیں لیکن ڈنکے اسلم خان کے کھیل کے زیادہ پٹے ہوئے ہیں۔ دونوں کے کھیل کے معیار میں فرق کا تو ہمیں اندازہ نہیں البتہ اس کی ایک وجہ اوّل الذکر کی بے زبانی اور بعد الذکر کی خوب گوئی اور طبیعت کی روانی ہے۔ اسلم خان ٹینس کے ممتاز کھلاڑی ہونے کے علاوہ شخصیت کے اعتبار سے بھی ہشت پہل ہیں۔ وہ علمی و ادبی نشست ہو سیاسی یا سماجی جلسہ ہو، تحریر کا معرکہ ہو یا تقریر کا میدان، ممدوح کسی گھر بند نہیں اور انھیں کچھ چالیں چلنے کے وہ تمام حقوق ملے ہوئے ہیں جو شطرنج کے وزیر کو حاصل ہیں۔ بنیادی طور پر وہ ٹھیٹھ مشرقی اور عوامی انسان ہیں مگر سوٹ بوٹ سے جس کا انھیں شوق ہے ان کا دماغ متاثر ہوتا ہے نہ زبان۔ شاعروں، ادیبوں اور فنکاروں میں ان کی جان ہے اور اسی وجہ سے وہ ساری جنتا کی جان ہیں۔ یہی وہ اسباب ہیں کہ کراچی میں اتنے سال گزارنے کے باوجود درد فراق کا احساس زندہ ہے جس میں وہ اب بھی کروٹیں لیتے رہتے ہیں۔ محفلیں سونی کرنے والے ایسے محبوب دیار کو بہر حال دل کی کسک کی سزا تو ملنا ہی چاہیئے۔ ہمیں رام پور میں ان کے بہت سے دل و جان سے چاہنے والوں سے مل کر ہمدردی ہوئی۔ ان پرستاروں کے خیال میں اسلم خان نے اپنی ہجرت سے جتنے دکھ دوسروں کو دیئے شاید خود اتنے نہیں اٹھائے۔ بقول ایک شیدائی "ایک ظالم کتنوں کو تنہا کر گیا"۔ ہمارے لئے بھی شمع ہر محفل قسم کے ان بزرگ کی قبل از وقت گوشہ نشینی ذہنی اذیت کا باعث اور قبیلے کا بڑا زیاں ہے۔

میزبان ہمیشہ سے ٹینس کے ایسے کڑے عاشق واقع ہوئے ہیں کہ اس سن و سال میں بھی مرض دیرینہ میں افاقے کے آثار نمودار نہیں ہوئے، بلکہ جب ہاتھ پاؤں نے درد کا شکوہ شروع کیا تو معروف صاحب انھیں پٹیوں سے جکڑ کر ٹینس کورٹ

لے جانے لگے اور کئی سال اسی طرح تیسیا کے عالم میں سلسلۂ ذوق جاری رکھا۔ مگر افسوس کہ دل وجان فدا کر دینے کے بعد بھی محبوب کی جفاؤں کی تاب نہ لا سکے اور ڈاکٹروں کے مشوروں سے تنگ آکر فارغ خطی لکھ دی لیکن اب بھی اس نام میں اتنی کشش ہے کہ ٹینس ٹورنامنٹ کا نام سنتے ہی آنکھ لڑانے پہنچ جاتے ہیں اور وہ بھی اپنی بیگم کی موجودگی بلکہ ان ہی کے سہارے۔

لامحالہ اس پروگرام میں تمام دیگر مدعوین پر ٹینس والوں کو فضیلت حاصل رہی البتہ اس انوکھی بزم میں روایات زمانہ کے برعکس دستر خوانی میدان کے اس نمائشی مقابلہ میں شرکاء کی تفصیل کچھ اس طرح سننے میں آئی کہ نئے کی بہ نسبت پرانے ماڈل کی مانگ اور مقبولیت زیادہ تھی۔

اس مرغن زار میں انوار سے بھرپور شخصیت بلاشبہ سید اشہد علی صاحب کی تھی۔ اشہد بھائی ٹینس کپتان ماڈل ۱۹۳۸ء ہیں وہ ہمیشہ سے سیرت و کردار کے ستھرے اور اخلاق کے پاکیزہ واقع ہوئے ہیں اور صورت بھی اتنی ہی دلکش پائی ہے۔ اب برّاق ریش نے سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے۔ چنانچہ ان کی اجلی داڑھی دیکھ کر یار لوگ "فرق ظاہر ہے" پکار اٹھے جس کی برکت سے وہ ہر مجلس کے صدر بنائے جانے کے لئے موزوں ہیں تاہم ان کے بے تکلف ساتھیوں کو ان کی بزرگ رخی پر اعتراض ہے چونکہ اس حسین تبدیلی سے یار دوستوں کو پہچاننے میں دشواری لاحق ہو رہی تھی حالانکہ چاہیئے تو یہ کہ ایسے صفاچٹ حضرات اشہد بھائی کا اتباع کرتے ہوئے اپنے چہروں کو بھی اسلامیانے کی کوشش کریں۔

اشہد بھائی اور معروف بھائی سے بھی زیادہ بیش قیمت ماڈل ۱۹۳۵ء آصف زاہدی صاحب نے بھی اس ملن میں حصہ لیا۔ پاکستان اور کراچی میں بھائی آصف صاحب کی وجہ شہرت ان کی ایل ایل بی کی ڈگری اور عدالتوں میں ساکھ

ہے کیونکہ ان کا شمار سندھ کے ممتاز وکیلوں میں ہوتا ہے۔ برسہا برس پہلے کبھی سیاست میں بھی طبع آزمائی کر لیا کرتے تھے لیکن سیاسیوں کا موجودہ بہروپ دیکھ کر شاید اس نجاست سے تائب ہو چکے ہیں۔

پاکستان کے مشہور بین الاقوامی کھلاڑی سعید حئی کپتان ماڈل ۱۹۴۸ء جو آج بھی عالمی کھلاڑیوں سے پنجہ کشی کرنے کی آرزو رکھتے ہیں، مع اپنے دَراز تر بھائی فاروق حئی کپتان ماڈل ۱۹۴۹ء بھی موجود تھے۔ چشم دید معتبر شائقینِ کھیل کا بیان ہے کہ یہ دونوں لمبے لمبے بھائی بڑی لمبی لمبی رلیز (RALLIES) آخر تک چلاتے رہے اور ماموں کا مال اپنا ہی سمجھ کر اُڑایا کیے۔ مگر ٹینس کورٹ پر اگر پارٹنر بن جائیں تو ماموں بھانجے میں بالکل نہیں بنتی بلکہ ٹھن جاتی ہے۔ چونکہ سعادت مند بھانجے صاحب بوڑھے ماموں کی غلطی گرفت کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔

اس انوکھی بھا میں ٹینس ہی کے ایک اور کپتان بھی پائے گئے جن کا گو کہ ماڈل اتنا پُرانا نہ تھا لیکن نمبر پلیٹ گھس جانے کی وجہ سے سال پڑھنے میں نہ آسکا۔ یہ تھے نیازی رشید صدّیقی۔ میاں نیازی ٹینس سے زیادہ اُستاد زادہ ہونے کی وَجہ سے چاہے جاتے ہیں۔ موصوف اُستادِ محترم رشید احمد صدّیقی مرحوم کی تخلیقی کاوش ہیں اِس طرح ٹینس اُنھیں ورثہ میں ملی۔ کاش وراثت میں کچھ فلمی زر و جواہر بھی ہاتھ آجاتے یا اپنا لیتے تو اپنے والد محترم کی گدّی آباد رہتی اور برِصغیر میں اپنے فن کے یکتا کہلاتے۔

اپنے بُزرگوں کے قدم بہ قدم شامل اور پلیٹ بہ پلیٹ شریک جواں سال و ہُنرمند جاوید محبوب خان بھی تھے جو تمام حاضر کپتانوں میں تازہ ترین ماڈل (LATEST MODEL) کہے جاسکتے ہیں۔ جاوید ٹینس ماڈل ۱۹۶۰ء ہیں، وہ چونکہ ٹینس کے گہرے میں پلے بڑھے اس لئے ٹینس ان کے خون میں شامل ہے لیکن یہ تحقیق نہیں کی جاسکی کہ

کھیل کے میدان میں بیٹا باپ سے بازی لے گیا یا اسلم خاں اس معاملے میں بھی باپ ہی ہیں البتہ برادرم جاوید کو کپتانی کی فضیلت ضرور حاصل ہے اور رہے گی۔

باب ٹینس ختم ہونے آیا تو ذکرِ خیر 'کرکٹیوں' کا ہو جائے جس کا موسم ان دنوں شباب پر ہے اور مقبول اداکاراؤں کی طرح ہر کس و ناکس کے اعصاب پر بشکل عمران خان و میاں داد چھائی ہوئی ہے اور اب تو عالم یہ ہو گیا ہے کہ راہ چلتے کسی دوست سے ہاتھ کے اشارے سے خیریت دریافت کرنا چاہو تو وہ اشاروں سے ہی اس وقت تک کا اسکور بتا دیتا ہے۔ ہمارے محلّہ کے ایک محترم خان صاحب تو فجر کی نماز کے بعد نہایت باقاعدگی سے میچ کی روداد مسجد ہی میں سُنانے لگتے ہیں گرچہ ان کی یادداشت میں کمزوری کی وجہ سے اسکور اور کھلاڑیوں کے ناموں میں ہمیشہ گھپلا ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ میچ اگر انگلینڈ میں ہو رہا ہو تو آسٹریلیا میں کروا دیتے ہیں۔ بہرحال دہشت گردی اور ڈاکو پروری کے دور میں ذکرِ کرکٹ بہت غنیمت ہے چونکہ اس بہانے کچھ سکون تو مل جاتا ہے۔ ورنہ روزمرّہ بُری سے بُری خبریں پڑھنے اور سُننے کو ملتی ہیں جس سے جی کا کام ہوا جاتا ہے۔

کرکٹ کی نمائندگی اپنے دور کے مشہور کھلاڑی اختر حسن صاحب کپتان ماڈل ۱۹۳۵ء فرما رہے تھے۔ اختر بھائی بعد میں اتھلیٹک کپتان ماڈل ۱۹۳۶ء بھی ہوئے۔ اس اعتبار سے وہ 'دو آتشہ کپتان' ہیں ایسا ڈبل اعزاز وہ بھی اکہرے جسم پر علیگڑھ میں کم ہی لوگوں کو نصیب ہوا۔ اسی میچ میں حسیم خان کپتان ماڈل ۱۹۴۴ء بھی 'کریز' پر جمع ہوئے تھے۔ خان صاحب کرکٹ کھلاڑی سے زیادہ قابل سینئر پولیس افسر، مشّاق بلکہ دھتی شکاری اور شکار کے داستان نویس کے نام سے مشہور ہیں شکاریات پر ان کی عنقریب ایک کتاب بھی شائع ہونے والی ہے مگر کتاب کی اشاعت کرکٹ کے کھیل سے بھی زیادہ صبر طلب کام ہے اس لئے کب یہ خوشخبری

سُننے کو ملتی ہے، انتظار کرنا ہوگا۔ جسیم خان کے علاوہ کرکٹ کی طرف سے زور دار بالنگ کرنے کے لئے بھائی بشیر ماڈل ۱۹۴۶ء بھی آئے ہوئے تھے۔ گو محبوبہ کرکٹ نے ان کی طرف کنکھیوں سے دیکھنا چھوڑ دیا ہے لیکن بھائی بشیر ان جفاؤں کو ہنسی خوشی جھیل رہے ہیں اور کرکٹ کا بیچھا چھوڑتے نظر نہیں آتے۔ چنانچہ اکثر جیمخانہ میں بیٹ آزمائی اور گیند پھینکائی کرکے دل کی بھڑاس نکالا کرتے ہیں۔

کھیلوں کے ستاروں سے مرصّع اس شام میں آئی اے خان صاحب نے بھی بڑے اچھّے کٹ لگائے اور کئی خوبصورت گول بھی بنائے۔ اکرام بھائی کرکٹ اور ہاکی گویا دونوں بڑے مورچے سر کئے ہوئے ہیں انھوں نے کرکٹ کلر ۱۹۳۶ء اور ہاکی ۱۹۳۷ء میں حاصل کیا۔ آئی اے خان کو ایک اور بڑا اعزاز حاصل ہے وہ یونیورسٹی یونین کے وائس پریسیڈنٹ بھی رہ چکے ہیں جو یونیورسٹی طالب علموں کے لئے سب سے بڑا اعزاز مانا جاتا ہے۔ اَب سُنا ہے کہ یونین کا پریسیڈنٹ بھی طالبِ علم ہی ہوتا ہے۔ آئی اے خان تیسری پُشت کے علیگ ہیں ان کے والد بزرگوار محترم نواب اسماعیل خان مشہور مسلم لیگی رہنما ۱۹۴۸ء میں علیگڑھ کے وائس چانسلر رہ چکے ہیں اور دادا محترم نواب اِسحاق خان صاحب نے سکریٹری بورڈ آف ٹرسٹیز ایم اے او کالج کی حیثیت سے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ہمارے خیال میں پاکستان چلے آنے کی وَجہ سے آئی اے خان صاحب مادر درس گاہ کی خدمت کے اَجر و ثواب سے محروم رہے وَرنہ تمام مطلوبہ صفات بدرجہ اتم ان میں بھی پائی جاتی ہیں۔

کرکٹ کے مقرّرہ ادوار پھلنکے جا چکے اور اب ہاکی کی وسل سُنائی دے رہی ہے اِس لئے قلم کا رُخ ہاکی کلب کی طرف پھیرتے ہیں۔ یہاں ہمیں ہمیشہ مُسکرانے والے کپتان ماڈل ۱۹۴۰ء محمد حسن عبّاسی صاحب نظر آرہے ہیں جو گلوری چبا کر سُرخ رُو بنے ہوئے ہیں مگر یُوں معلوم ہوتا ہے جیسے تھرو پاس کے اِنتظار میں

بھاگنے کے لئے تیار رہوں۔ عبّاسی صاحب ہاکی کے تو عمدہ رائٹ آؤٹ تھے ہی مگر اسٹک ورک سے زیادہ ان کے گلے کا ورک نمایاں اور لطیف تھا۔ ہاکی تو عبّاسی صاحب کو کبھی کی ڈاج دے چکی لیکن کمال یہ ہے کہ انہیں تال سُر پر ابھی تک ویسا ہی بھروسہ اور عبُور ہے بلکہ اس دوران انھوں نے خصوصی ریاض کے بعد ہاکی کی تمام مُرکیاں بھی موسیقیاذیں اس لحاظ سے وہ کپتانِ ترنّم کہے جا سکتے ہیں۔ اَب رہا اندازِ گفتگو تو وہ اس قدر انفرادیت لئے اور توجہ کش ہے کہ بعد طعام صحبت کو گرمانے کے لئے اکیلے ہی کافی ہیں۔ ان کی فنّی خصوصیت یہ ہے کہ ہاکی کھیلتے ہُوئے تو اکثر 'آف سائڈ' پکڑے گئے۔ گانے میں بھی کبھی کبھار 'نے' گر جاتی ہے لیکن کیا مجال ہے جو بات چیت میں کہیں بے تال ہو کر جھول پیدا ہو یا ملاوٹ کی گرفت کی جا سکے۔ اِسلئے سامعین کو یہ چٹانے دار گفتگوئے مُسلّم ہضم کیے ہی بنتی ہے اور پھر بھی 'ھَلْ مِنْ مَزِیْد' کہنے کو ہی دل چاہتا ہے۔ عبّاسی صاحب کو 'اپنے' ترنگے' ہونے یعنی ہاکی کے علاوہ فٹ بال اور ٹینس کے کلر دار ہونے کا بھی دعویٰ ہے مگر کوشش کے باوجود ابھی تک وہ کوئی مؤید فراہم نہیں کر سکے، جس دن اِس غیر معمولی اعزاز کی تصدیق ہو گئی 'معروف بھائی سے درخواست کی جائے گی کہ وہ اس کو منانے کے لئے ایک علیٰحدہ 'شامِ کلر' منعقد کریں۔

عبّاسی صاحب کے جلو میں جو مگدر جیسی وزنی ٹانگیں زمین پر دھری ہُوئی ہیں وہ ہاکی کپتان ماڈل ۱۹۴۶ء اظہر خان ہیں جن کے لئے مشہور ہے کہ جب کبھی اُن کی اسٹک ناکافی ہو جاتی تو وہ حملہ آور فارورڈز کو پنڈلی سے روک لیا کرتے تھے اور جس فارورڈ نے ایک دفعہ اس 'پنڈلی اسٹروک' کا مزہ چکھ لیا وہ پھر بھول کر بھی اس طرف کا رُخ نہیں کرتا اِس لئے وہ بجا طور پر اظہر خان پنڈلی کے نام سے مشہور ہُوئے۔ وہ عالمی جنگ کا دَور تھا اور ان کے اِس کامیاب حربے کی شہرت کی وجہ سے انڈین

آرمی ان کو کمیشن دینا چاہتی تھی لیکن انھوں نے یہ "پنڈلی میری نہیں قوم کی امانت ہے" کہہ کر انکار کر دیا اِس لئے اپنی محبوب پنڈلیوں کو وہ اب بھی ناجائز اسلحہ کی طرح چھپائے رکھتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر وہ ذرا سا پنڈلی وَرک کراچی میں بھی دکھا دیتے تو مقامی رواج کے مُطابق سیٹھ پنڈلی والا کہلائے جاتے۔

یہ تو تھا کپتانوں اور کھلاڑیوں کا حال حوال لیکن حَقِ دسترخوان ادا کرنے اور محفل کو دلچسپ تر بنانے کے لئے چند اور نُمایاں شخصیات بھی وہاں انجمن افروز تھیں۔ مثلاً بھائی ایس بی سلیمی جو اپنے زمانے میں والی بال کے اَچھے کھلاڑی اور کپتان رہ چکے ہیں۔ انھوں نے ڈائریکٹر جنرل پورٹس اینڈ شپنگ کی حیثیت سے حجّاج کرام کی خدمت کا ثواب بھی کمایا ہے اور شپ یارڈ کے منیجنگ ڈائرکٹر بن کر جہاز سازی بھی کر دکھائی۔ یہی نہیں بلکہ پاکستان کے سفیر کی حیثیت سے میدانِ سفارت میں 'والیاں' لگاتے رہے ہیں۔ ان کا اَب یہی مشغلہ ہے کہ ہر وقت علیگڑھ کی خدمت کو آمادہ رہتے ہیں۔ ان کے علاوہ بھائی ابرار حسن خان خاندانی علیگ تشریف فرما تھے جو گورنمنٹ سے ریٹائرمنٹ کے بعد ایسوسی ایشن کے معاملات میں انتہائی مخلصانہ دلچسپی لیتے ہیں جس کے وہ نائب صدر بھی ہیں اور عرصہ دراز سے ایسوسی ایشن سے وابستہ چلے آرہے ہیں۔ یہاں بریگیڈیئر کرمانی صاحب بھی برقی چمک دمک دکھا رہے ہیں جنہوں نے علاوہ فوج کے، کے ای ایس سی کی چیئرمینی بھی کر دکھائی۔ خدا کا شُکر ہے کہ لوڈشیڈنگ کا مَرض لاحق ہونے سے پیشتر ہی انھوں نے (K.E.S.C) سے اپنی شیڈنگ کر لی۔ ادھر رہے وہاب بھائی، تو انہیں کون نہیں جانتا ایسوسی ایشن کے روزِ اوّل سے ہی خادم ہیں، اور رابطے کے کام میں مہارت رکھتے ہیں ان میں اور تمام ممبروں میں اتنا ہی فرق ہے جتنا حکومت کے پکّے اور کچّے ملازموں میں ہوتا ہے اپنے دَور میں علیگڑھ میں سینئر پراکٹوریل جیسے اہم اَور پُرخطر

عُہدہ پر فائز رہ چکے ہیں اور اُس زمانے کی ساری مشہور اور غیر مشہور پکچریں پابندی سے مُفت دیکھی ہیں مگر ان تمام خدمات کے باوجود انھیں یار لوگ 'معمولی' درجہ دیئے ہوئے ہیں اور علیگڑھ کے عطا شُدہ اس اعزاز کو وہ بخوشی اپنائے ہوئے ہیں۔
ان جملہ غیر کھلاڑی حضرات نے بھی ماحضر سے شکم خواہ استفادہ کیا۔ معروف بھائی کا اس سے متعلق قول یہ ہے کہ "جب کھلاڑی بلند معیار کے جمع کئے جائیں تو انکی قدر شناسی کے لئے مُبصرین و محققین بھی اسی پائے کے ہونا چاہئیں"۔ گویا کھلاڑی اور کھلاڑیوں کا حوصلہ بڑھانے والے لازم و ملزوم ہیں۔ یہ وہ ماہرین ہیں جو محض تالی بجانے نہیں آئے بلکہ وقتاً فوقتاً ٹانگ بھی کھینچ لیتے ہیں۔
کپتانوں سے بھرپُور اس ملن میں چند ہستیوں کی عدم موجودگی البتّہ محسُوس کی گئی۔ گو کہ معروف بھائی نے اپنے رجسٹر میں ان کی غیر حاضری لگادی ہے چونکہ ان کا کہنا یہ ہے کہ دعوت ملنے کے باوجود یہ حضرات نہیں آئے اسلئے ان کا پتّہ آئندہ کے لئے کاٹ دیا گیا ہے۔ ایسے لوگوں میں سرِ فہرست میجر زاہد سعید خان لودھی کا نام نامی ہے جو بلاشبہ کھیلوں کے میدانوں میں جرنیلوں سے بڑھ کر عزّت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں اور انھوں نے اپنی زندگی کھیل اور کھیل کے ہنگاموں کے لئے وقف کر رکھی ہے چنانچہ وہ شہر میں ہونیوالی اسپورٹس کی ہر تقریب میں بُلاوے کا انتظار کئے بغیر پیدل آن ڈیوٹی رہتے ہیں اور کھلاڑیوں اور منتظمین کی خُوب حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اسی طرح کرنل ممتاز رضا خان 'گھڑ کپتان' ماڈل ۱۹۴۰ء کو بھی چانس نہیں دیا گیا، ورنہ وہ بھی بڑی مشکل میخیں اُکھاڑ کر اپنا کرتب دکھاتے، کرکٹ کپتان مظہر ماڈل ۱۹۴۷ء پیڈ کئے 'پویلین' میں ہی بُلاوے کا انتظار کرتے رہے۔
ہاکی کپتانوں میں پولیس کپتان نواب زادہ حامد علی خان ماڈل ۱۹۴۷ء

مُنڈیر پر بٹھا دیئے گئے۔ گرچہ اپنی دانست میں وہ اَب بھی اپنے آپ کو پاکستان کی ٹیم کا اہل سمجھتے ہیں اور کھیل کے میدان سے زیادہ باہر ہی اپنی زبانی فارم کا سِکّہ جمایا کرتے ہیں۔ ہمیں ان سے ہمدردی ہے اور وہ بھی اسی دَھاندلی پر، وہ سلیکشن کمیٹی پر لعن طعن کرنے میں حق بجانب ہیں۔ اسی طرح اپنے وقت کے شاہکار کھلاڑی مبرور شاہ خاں کپتان ماڈل ۱۹۴۹ء کھیلوں کی مُروّجہ سیاست کا شکار بنائے گئے۔ گرچہ تماشائیوں کے ہی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ایسا خوبصورت اسٹک وَرک کرنے والا دُور دُور نہیں ملے گا۔ مبرور شاہ خاں کی طرح بھائی نذیر خان دِلّن کپتان ماڈل ۱۹۵۰ء کو شمولیت میسّر نہیں ہُوئی۔ نذیر خان کو ہاکی کے علاوہ 'چندہ' حاصل کرنے کا بچپن سے ڈھب آتا ہے ان کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ زندگی کی سڑسٹھ بہاریں نبیڑنے کے باوجود چہرے مُہرے چلت پھرت بات چیت ہر اعتبار سے 'لوائے' نظر آتے ہیں اِس لئے ان جیسے لونڈوں کو اولڈ لوائے کہہ کر 'اولڈ' کی مَنّی پلید نہیں کی جا سکتی۔ محرومین میں بھائی محی الدّین کپتان ماڈل ۱۹۴۶ء بھی ہیں جن کی عَدم موجودگی سے فٹ بال کلب کو بھی نمائندگی نہ مل سکی اور کسٹمز کی نمائندگی کا بار بھی تنہا عبّاسی صاحب کے کاندھوں پر آن پڑا۔ بھائی محی الدّین صاحب کو فٹ بال فراموشی کا گِلہ ہے جو بجا ہے۔ یہاں یہ بات بیان کرنا بھی مُناسب ہوگا کہ یہ سب لوگ کراچی والے ٹھہرے، اس لئے عین ممکن ہے کہ قومی پالیسی کو برقرار رکھنے کے لئے ایسے مستحق لوگوں کو شمولیت کے قابل نہیں سمجھا گیا۔ اس بارے میں 'براہِ راست گھوڑے کی زبانی' یہ سُننے میں آیا ہے کہ جنابِ میزبان نے اپنی ساری توجہ کھانے کے معیار اور اقسام پر مرکوز رکھی لیکن مدعو کرنے کے لئے ایسا مقتدر وسیلہ اختیار نہیں کیا جس کی وَجہ سے ایسے ایسے مُستند مستحقین محرومین بن گئے۔ اس سلسلے میں اپیلیں اور پروٹسٹ معروف صاحب تک پہنچ چکے ہیں اور وہ

حسبِ وعدہ بذاتِ خود اس معاملہ کی چھین بین کر رہے ہیں اور گھپلا انگیزی کرنے والے کے خلاف "خوردنی کارروائی" کرینگے۔ یہ سُن کر ہم نے بھی ابھی سے انتظار شروع کر دیا ہے۔ دیکھئے اس کوتاہی کی تلافی کی بشارت کب سُننے میں آتی ہے۔

اپنی نوعیت کی جُداگانہ اس مجلس طعام وکلام میں جہاں کھانے والے معیاری اور باذوق ہوں تو بنی ٹھنی میزوں کا سُہاگ لٹتے دیر نہیں لگتی، چنانچہ ہوا بھی کچھ ایسا ہی یعنی قبل اس کے کہ ڈونگے اور ڈشیں ٹھیک سے میز پر تشریف فرما ہوں بھائی لوگوں نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لے لیا، اور ہاتھ بھی ایسے جو کبھی کہیں خطا نہ ہوئے یہاں کیسے چُوکتے۔ اپنے کھیلوں کے تو یہ لوگ کپتان تھے ہی لیکن کھانے کی اس میز پر ہر ایک ہی کپتان بنا ہُوا تھا۔ کرکٹ اور ٹینس والے ایک سے ایک بڑھیا اسٹروک لگا رہے تھے اور ہاکی والے اتنی آسانی اور صفائی سے فیلڈ گول بنا رہے تھے جیسے گول کیپر گول میں موجود ہی نہ ہو۔ یہاں تعجب اس بات پر ہے کہ زیادہ اسکور ایسے لوگوں نے کر دکھایا جنھوں نے ہاتھ میں کسی قسم کا بلّا پکڑا نہ گیند تھامی۔ ان اناڑیوں کو چھکّے چوکے لگاتے دیکھ کر کپتانوں نے اعتراض کیا کہ اس خصوصی محفل میں غیر کپتان کیسے آ گئے۔ جس پر شیخ معروف نے مُسکرا کر جواب دیا کہ "بھائی اتنے مشاہیر کے اجتماع میں دو ایک معمولی بھی روا ہیں" ان اصحاب کی خوردنی محویت دیکھ کر حیرت یہ ہُوئی کہ خوش خوراکی کے دوران نہ تو دردِ دل کا کسی نے نام لیا اور نہ ہی کسی نے ضعفِ معدہ کا شکوہ کر کے کلیجہ تھام لیا بلکہ اس وقت سبھی فکرِ ادویہ اور کیلوری شماری سے آزاد، گھی اور مصالحہ کے خوف سے بے نیاز، انتہائی بے تکلفی، یکسوئی، بلکہ بیدردی کی حد تک تواضع شکم میں سرگرداں تھے۔ کیونکہ بعض مزاج داں شیخ شناس، احباب کا خیال تھا کہ (بڑا شیخ) بڑی مشکل سے پھنستا ہے کہیں بچنے نہ پائے۔ یہ سماں دیکھ کر رشک آتا رہا معروف بھائی کے مقدّر یا مقدّر کے معروف پر جو مال لُٹتا

دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ چھانٹ چھانٹ کر ایسے بڑھیا دانے چننا کس قدر بلند ذوقی اور خوش نصیبی کی علامت ہے۔

معروف بھائی کی والہانہ محبت اور اُن کے چہرے کے انوار دیکھ کر یہ احساس ہُوا جسے پیشینگوئی بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس روایت حسنہ و حسین پر عمل پیرا ہونے کے لئے اپنے پرستاروں کو زحمت سالانہ دیا کریں گے اور کپتان بھائی کی تقریب منا کر مستقلاً المکلّف کا اعزاز پائیں گے۔ ہم بھی انہیں یقین دلاتے ہیں کہ وہ اِتنی چاہت ایسے پیار سے جب کبھی بُلائیں گے تو ہم بھی بھنک پاتے ہی اپنا گھر سمجھ کر دوڑے دوڑے آئیں گے۔

زہے نصیب شکم، جہاں کھانا خوب، کھانے والے خوب تر اور کھلانے والا ان سے بھی بڑھ کر ہو تو پھر سارا ماحول ہی بہترین ہو جاتا ہے اس لئے علیگڑھ کی آپ بیتیوں، لطائف، اہم میچوں کے احوال سے فضا معمور رہی۔ اَپنے اپنے دَور کی باتیں کبھی آہستہ آہستہ کبھی زور زور سے ہوتی رہیں اور برمحل قہقہوں سے محفل میں جان پڑتی رہی حتیٰ کہ یار لوگ اِن باتوں میں اس حد تک منہمک ہوئے کہ پروگرام کے رُوحانی آئٹم کی باری ہی نہ آسکی اور عبّاسی صاحب کا ہارمونیم گاڑی کی ڈگی میں پڑا 'مال کوس' الاپتا رہا اور مینڈیں لیتا رہا۔ ایسی نامساعد صورتِ حال میں عبّاسی صاحب نے اِنتقاماً گلے کو خوب چکنائی پلائی اور ٹھنڈا پانی پیا تاکہ نوبتِ فرمائش نہ آئے۔ ہمارے خیال میں عبّاسی صاحب نے بھی درست ہی کیا کیونکہ بالعموم دیکھا گیا ہے کہ جب کبھی غذائے جسمانی کا انتظام معیاری اور اعلیٰ ہو تو پھر غذائے روحانی کی لطافتوں سے لُطف اندوز ہونے کی صلاحیت ہی ٹھپ پڑ جاتی ہے یعنی یہ اگر کہا جائے کہ اَچھا کھانا اَچھے گانے کی ضد ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس لئے ایسی صحبتوں میں اگر گانے کو فضیلت دے دیجائے تو

رُوحانی اور جسمانی ہر دو طرح کی مدارات کی جاسکتی ہیں. ذوق بہرحال شرطِ اوّل ہے۔

لذّتِ طعام اور اس کی اقسام اپنی جگہ لیکن دَرحقیقت ساری بات تو اس بے لوث خلوص و محبّت میں بسے ہُوئے رُوح پرَور ماحول کی ہے جہاں دیرینہ رفیقوں کی مُسکراتی صُورتیں دیکھ کر آنکھوں میں نور آتا ہے جس میں سانس لینے سے سرور آتا ہے اور دل کو ٹھنڈک ہی ٹھنڈک میسّر آتی ہے اور اس طرح غمِ روزگار سے کم از کم چند گھنٹوں کے لئے ہی نجات مل جاتی ہے گویا زندگی کو جلا مل جاتی ہے اور عُمرِ عزیز میں کچھ نہ کچھ برکت ہو جاتی ہے لہٰذا ایسی مخلصانہ محفلیں سجانے والوں اور اس میں خلوصِ نیّت سے شریک ہونے والوں کے لئے دل سے مرحبا و شاباش کی صَدائیں نکلتی ہیں اور اس وقت اس رپورٹ کا مقصد ادائے تشکّر کے علاوہ یہ بھی ہے کہ دُوسرے صاحبِ دل علیگ بھائی بھی حُبِّ برادری سے سرشار ہو کر معروف بننے کی کوشش کریں. شاید پہلی مرتبہ میں وہ باآسانی اس قدر کامیاب نہ بن سکیں لیکن براہِ طعام یاروں کی نظر میں اعلیٰ مقام پائیں گے اور مَزید مشقوں کے بعد وہ بھی مشہور و 'معروف شیخ' بَن جائیں گے۔

ہم کپتان سبھا کی پہلی تقریب کو ایجاد اور شاندار طریقے سے منانے پر معروف بھائی اور ان کی جیون ساتھی بیگم آمنہ کو ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں. بیگم کا ذکر اس لئے ناگزیر ہے کہ ان مجالس کے اہتمام اور آئندہ دعوت کا اِمکان تو بیگمات کے ہی دستِ کمال اور موڈ کا رہینِ مِنّت ہے چونکہ آب و نمک کی خفیف سی کمی و بیشی پر دعوت کی کامیابی بلکہ انعقاد کا بہت کچھ انحصار ہے۔ اب رہے مَرد حضرات تو یہ اکثر ان موقعوں پر محض زبانی جمع خرچ چلا کر مُفت کی داد وصولا کرتے ہیں اللہ کرے ہمیں آئندہ اسی طرح شکر گزاری کے مواقع فراہم ہوتے رہیں اور ہم بڑھیا سے بڑھیا داد دے کر حساب چُکاتے رہیں. ہاں چلتے چلتے یہ تجویز برائے

توجّہ پیش کی جاتی ہے کہ آئندہ ہر قسم کے 'ملن' پر تعارف کا آئٹم ضرور ہونا چاہیئے تاکہ جواں سال بھائی اپنے بزرگوں سے اور بزرگ نوجوانوں سے بخوبی واقفیت حاصل کر سکیں۔

فی الوقت ہم قارئین کی تواضع اِن چند سطور سے ہی کرنے پر اکتفا کرتے ہیں چونکہ دراصل آنکھوں دیکھا حال اور تقریب کی تفصیلات بیان کرنے کی اخلاقی اور طعامی ذمّہ داری تو براہِ راست تر مال اُڑانے اور ہضم کر جانے والوں پر عائد ہوتی ہے۔ جہاں تک ہمارا تعلّق ہے تو سچّی بات یہ ہے کہ بغیر نمک چکھّے اس سے زیادہ لکھّا بھی نہیں جا سکتا۔

—>-(:{)-<—

نوٹ :۔ ادارہ کا نامہ نگار سے متّفق ہونا ضروری نہیں۔ ناموں، کارناموں اور کھانوں کے بیان میں کچھ کسر رہ گئی ہو یا کوئی فالتو نام نظر آئے تو اس کی جزوی و کلّی ذمّہ داری و عذاب بر گردنِ راوی تصوّر کیا جائے۔

خُدائی فِضائیہ کے تین ہَوا باز (۳)

گزشتہ صفحات میں یونیورسٹی میں عرصۂ دراز سے مُروّجہ رسومات و روایات کا احوال پیش کیا گیا جس میں دلنواز واقعات آپ نے پڑھے۔ سوچا آخر میں ایک دل گداز مضمون کو بھی موضوع بنایا جائے جو علیگڑھ کی دوستی کی ایک مُنفرد و معیاری مثال ہے۔ اسے پڑھ کر آپ یہ جان سکیں گے کہ وہاں کی یاری دوستی وقتی نہیں بلکہ دوامی ہوتی تھی اور علیگڑھ کے دوست جینا نہیں مرنا بھی ساتھ چاہتے تھے۔ یہی نہیں میدانِ حشر میں بھی اکٹھے حاضر ہونا پسند کرتے تھے۔ ہمارے یہ تینوں ہوا باز دوست ایسے دم ساز تھے جنہیں موت بھی جُدا نہ کر سکی۔ چُنانچہ ان تینوں دَمسازوں کے سانحاتِ ارتحال میں بھی روایاتِ علیگڑھ کا رنگ جھلکتا ہے۔

پچھلے دنوں ایک تقریب شادی میں مُبارک سے مُلاقات ہُوئی حسبِ معمول ہشاش بشاش تھے ہونٹوں پر وہی دلآویز مُسکراہٹ جس سے اُن کا چہرہ ہمیشہ سجا رہتا تھا کھیل رہی تھی۔ ہم نے پوچھا بھائی نفیس کیسے ہیں، وہ بولے "بھائی اُنکی حالت تو دیکھی نہیں جاتی اور دوستوں کو دیکھ کر تو وہ اِتنے بے چین ہو جاتے ہیں کہ سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے اس لیے ہم اور ارشاد اب ٹیلیفون پر ہی خیریت معلوم کر لیتے ہیں"۔ ہم نے کہا "بھائی ملنے کی کوشش ہم نے بھی کی لیکن مُلاقات نہ ہو سکی۔ شاید اسی وجہ سے ملنے جلنے پر ڈاکٹر نے پابندی لگا دی ہو"۔ ہماری اس

ملاقات کے پانچ چھ روز بعد اخبار پڑھا تو پتہ چلا کہ ۴ جنوری کو بھائی مبارک علی خان سفرِ مراجعت پر روانہ ہو کر نفیس سے سبقت لے گئے۔ اس خبر نے سچ مچ وحشت زدہ کر دیا۔ سُنا ہے کہ حسبِ معمول مُبارک نے سہ پہر گالف کھیلا اور خوب کھیلا اور زندگی کے آخری اسٹروک لگا کر بیٹھ گئے۔ چائے پی، سموسہ کھایا، دُنیا سے ناتا توڑا اور عالمِ جاودانی کی طرف چل دیئے۔ دوسرے روز فوجی قبرستان متصل گورا قبرستان میں ہجوم سوگواران نے سُپردِ خاک کیا۔ نمازِ جنازہ میں بھائی ارشاد حلیم آگے ہی کھڑے تھے، نماز کے دوران ان کی آنکھیں بوجھل تھیں، بے خوابی سے نہیں بلکہ دوست کی جُدائی کے غم نے انہیں نڈھال کر دیا تھا۔ قبرستان میں ملے تو اور زیادہ دل گرفتہ تھے کہنے لگے "ہمیں تو نفیس کا دھڑکا لگا ہُوا تھا مگر یہ پہلے چل دیئے"۔

۱۵ جنوری ۱۹۹۲ء کو اچھو خان نے مزید الم انگیز خبر ٹیلیفون پر سُنائی کہ بھائی نفیس بھی کل اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اس طرح وہ جان سے گئے مگر اس بہانے اذیتِ مسلسل کا درماں مل گیا۔ پسماندگان پر جُدائی یقیناً بجلی بن کر گری ہو گی لیکن کئی ماہ عالمِ بے بسی و نا اُمیدی میں مُبتلا رہنے والے نفیس کو بالآخر سکون مل گیا، دائمی سکون! اَب نہ اُسے اپنی معذوری سے شرمساری ہو گی نہ شدّتِ مرض اس کا کچھ بگاڑ سکے گی گویا اس نے نئی زندگی پائی۔ ۱۶ جنوری کو بعد ظہر اُنہیں بھی فوجی قبرستان میں دفن کیا گیا۔ عجب اِتفاق ہے کہ نفیس نے اپنے دوست مُبارک کا مرنے کے بعد بھی ساتھ نہ چھوڑا اور پڑوس میں ہی آرام کرنے لیٹ گئے۔

نفیس کو سُپردِ خاک کرنے والوں میں دیرینہ ساتھیوں اور عزیزوں کے علاوہ ایئر فورس کے افسران اور عملہ تھا تدفین کے دوران ہم نے اس اتفاقِ قرب کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ دونوں نے خوب ساتھ نبھایا تو وہاں موجود کسی دوست نے کہا "محض دونوں نے نہیں بلکہ تینوں نے"۔ ہم یہ سُن کر چونکے تو انھوں نے بتلایا

کہ "کل ارشاد حلیم نفیس کو دیکھنے آغا خان ہسپتال گئے وہاں سے لوٹے تو بہت مضطرب تھے کہتے تھے ڈاکٹروں نے جواب دے دیا۔ رات میں سو گئے۔ صبح جب اُٹھنے میں دیر ہوئی بیگم جگانے گئیں تو معلوم ہوا کہ وہ بھی ساتھیوں سے ساتھ نبھانے چل دیئے۔ نفیس کے پہلو میں ایک خالی قبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُنہوں نے بتلایا یہ ارشاد کا ٹھکانہ ہے"۔ ہم ان سانحات کے اتفاق پر حیرت زدہ کھڑے تھے کہ جنرل جلال نے بڑے پتے کی بات کہی وہ بولے "معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ان تینوں نے ساتھ مریں گے اور ساتھ بسیں گے، کا کوئی خفیہ عہد کر رکھا تھا"۔ دو روز ارشاد کے لڑکوں کی واپسی کا انتظار کیا گیا اور ہفتہ ۱۸ جنوری کو وہ بھی فوجی قبرستان میں اپنے ہمیشہ کے دوستوں کے پاس ہمیشہ کے لئے پہنچ گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

ایئر کموڈور نفیس احمد خان شیروانی علیگڑھ میں ہمارے پہلے دن کے ساتھی اور پکے دوستوں میں تھے۔ وہ عثمانیہ ہوسٹل میں اپنے بڑے بھائی انیس احمد خان شیروانی مرحوم اور مرحوم جسٹس مشتاق حسین صاحب کے ساتھ رہا کرتے جبکہ ہم ایم ایم ہوسٹل میں تھے۔ کلاسوں میں ہم پاس بیٹھتے۔ خالی گھنٹوں میں لکٹھے گھومتے۔ سائنس کے پریکٹیکل بھی ساتھ کرتے، ہوسٹلوں میں بھی جا کر ایک دوسرے کی خبر گیری کیا کرتے۔ بلحاظ طالب علم ہم اور نفیس متوسط درجے کے ہی تھے اور اسی وجہ سے ساتھ ساتھ رہنے میں زیادہ لطف آتا۔ نفیس شروع سے ہی مجسمۂ شرافت تھے انہیں کھیل کود سے کوئی سروکار نہ تھا لیکن ہمارے میچ دیکھنے ضرور آتے وہ خود شرارت میں بھی کم ہی پہل کرتے لیکن یار لوگ جب کوئی حرکت کرتے تو اس سے پورا پورا لطف اُٹھاتے۔ کالجوں میں فرسٹ ایئر کے طلباء تو بالعموم دیگر طلباء کا ہدف ہوتے ہیں لیکن علیگڑھ میں پہلے سال والوں کو نہ صرف چوکنا بلکہ مؤدب رہنا پڑتا ہے مگر کبھی کبھار زبانی دفاع سے کام نہ چلے تو مدافعت کے لئے ہاتھ پاؤں بھی استعمال کرنا پڑ جاتے ہیں۔

نفیس سجیلے گراں ڈیل جوان تھے اور جثّہ کے اعتبار سے ہم بھی انکی دوستی کے اہل تھے چنانچہ ہم چار پانچ مضبوط قویٰ والے دوستوں کا ایک جتھا بن گیا تھا جس کی وجہ سے 'ایرے غیرے' جملے کسنے سے گریز کرتے اور شیطنت کے دعویدار ہم لوگوں کو دیکھ کر کترا کر گزر جاتے۔ انٹرمیڈیٹ میں کامیابی کے بعد ہمارے چند ساتھی انجینئرنگ میں پہنچ گئے لیکن ہم دونوں نے بی ایس سی کی راہ پکڑی اور ان دو برسوں میں ایک دوسرے کے قریب تر ہوتے چلے گئے۔ نفیس نے بی ایس سی کر کے میکلیگن انجینئرنگ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ ادھر ہم نے اپنا قیمتی سال ہاکی ٹیم کی نذر کیا، نتیجۃً حاضریاں کم ہونے کی وجہ سے شرکت امتحان سے محروم رہے! اور سعی مکرر کے دوران بھائی ارشاد حلیم قدوسی ہمارے ساتھ ہو گئے اب وہ ٹھہرے صف اوّل کے پڑھیل اور ہم نرے 'کھلنڈرے' لیکن مرحوم کی فراوانیٔ اخلاق کی وجہ سے ہم جماعتی رشتہ، تعلّقات دوستی میں تبدیل ہو گیا۔ ارشاد حلیم دوران طالب علمی بھی مقدّس رہے۔ بی ایس سی میں شاندار کامیابی کے بعد انجینئرنگ کالج میں داخل ہوئے اور ۱۹۴۸ء میں فرسٹ ڈویژن میں پاس ہونے کے بعد پاکستان ایئر فورس میں شامل ہو گئے۔

گریجویشن کا معرکہ سر کرنے کے بعد ہم نے جب سول انجینئرنگ کا مورچہ سنبھالا تو وہاں بھائی مبارک علی خان کلاس فیلو بننے کے لئے موجود تھے۔ خوش مزاج، خوش لباس، خوش شکل ہونے کے علاوہ مبارک میں ایک کشش تھی جو ان کی ہر دلعزیزی کا سبب تھی۔ بھائی مبارک کرکٹ کے اچھے کھلاڑی تھے اور کھیل کے اچھے جوہر دکھانے پر یونیورسٹی ٹیم میں منتخب کر لئے گئے جو اس دور میں ایک بڑا اعزاز تھا۔

انجینئرنگ کی ڈگریاں بغل میں دبانے کے بعد سب نے پاکستان کی راہ لی جہاں پہنچ کر تینوں یار مبارک، شیروانی اور قدوسی ایئر فورس سے وابستہ ہو گئے اور پھر 'کند ہم جنس باہم جنس پرواز' کے مصداق دوستی کے بندھن میں جکڑتے ہی چلے گئے۔

اکثر و بیشتر یہ حضرات ایک دُوسرے کے قریب ہی رہنے کی کوشش کرتے گراؤنڈ بدل جاتا تب بھی فاصلے کا تعلقات پر اثر نہیں پڑتا۔ ارشاد حلیم قدوسی اور نفیس شیروانی ایئر کموڈور اور مُبارک صاحب گروپ کیپٹن کے عہدوں سے ریٹائر ہوئے۔ مُبارک وفات سے قبل غازی ٹریکٹرز کے منیجنگ ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔

مُبارک علی اور قدوسی ڈیفنس میں اقامت پذیر ہوئے نفیس خان نے قریب ہی کلفٹن میں اڈا پسند کیا اس طرح میل مُلاقات کے مواقع بڑھتے گئے یہاں تک کہ موت نے تینوں کو ہمیشہ کے لئے اکٹھا کر دیا۔

اللہ تعالیٰ بہت غفورُالرحیم ہے وہ تو کیسے کیسے گنہگاروں کو بھی مایوس نہیں کرتا اب یہ ہمارے تینوں یار ٹھہرے پاک طینت پاکباز ہوا باز جنھوں نے زندگی بھر کسی کی بُرائی چاہی نہ سوچی اس لئے ذات باری تعالیٰ سے قوی توقع ہے کہ جنّت کے باغات میں بھی اکٹھے گھوما کریں گے۔ اب یہ نہیں معلوم کہ وہ خدائی فضائیہ میں رکھے جاتے ہیں یا پھر کارگزاری دکھانے کا کوئی اور موقع پاتے ہیں۔ بہرحال انشاءاللہ زیرِ سایۂ رحمت ساتھ ہی رہیں گے۔

——·>·(※)·<·——

www.taemeernews.com

سرسیّد علیہ الرّحمۃ کے مدارِج کی بُلندی

خداوندِ کریم علی الحساب جزا دے اُس مردِ مومن کو جس کی دانائی و بینائی نے مادرِ وطن میں علم کی شمع روشن کی اور اپنی عزیمت و استقامت سے اسے اتنی توانائی فراہم کر دی کہ اس وقت جو پھونک کی متحمل نہ ہو سکتی تھی وہ شمع آج ایک ایسا مینارۂ نُور ہے جس کی ضوفشانیاں دُنیا کے دُور اُفتادہ تاریک گوشوں کو منوّر کر رہی ہیں، اس لئے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نامورانِ علیگڑھ کے قافلے تیّار ہوتے رہیں گے اور سرسیّد علیہ الرحمۃ کے نام کی تابانی و درخشانی بڑھتی رہے گی۔

سرسیّد کو اللہ تعالیٰ نے ہمہ جہت شخصیّت بنایا تھا انھیں زندگی بھر قدم قدم پر مصائب و مراحل سے دوچار ہونا پڑا لیکن ہر امتحان میں جس امتیازی شان سے وہ کامیاب ہوئے اس کو توفیقِ ایزدی ہی کہا جا سکتا ہے، انھیں کبھی غیر مقلّد تو کبھی 'نیچری' کے لقب سے نوازا گیا اور ان کے ہمعصروں نے زِچ کرنے کے لئے اوچھے سے اوچھا ہتھیار استعمال کیا، یہاں تک کہ کُفر تک کا فتویٰ بھی صادر کر دیا گیا، لیکن ذاتِ باری تعالیٰ میں غیر متزلزل یقین اور آقائے دوجہاںؐ سے بے پناہ محبّت کی بدولت وہ بڑی سے بڑی آزمائش میں سُرخرو ہوئے اور مخالفین کو ہمیشہ مُنھ کی کھانا پڑی، چنانچہ ان کی غیر معمولی قوّتِ ارادی، ایثار، سخت کوشی، بصیرت اور منصوبہ بندی کا شاندار ماحصل آج علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے پیکرِ

جمال وکمال میں چودھویں شب میں تاج محل کی طرح جلوہ گر ہے۔ ۱۸۷۶ء کی قائم کردہ یہ بارگاہِ علم وادب آج صرف برِّصغیر ہی کی نہیں سارے عالم کے مسلمانوں کی سب سے بڑی تعلیم گاہ اور تربیتی مرکز ہے اور لاکھوں فرزندانِ علی گڑھ دُنیا بھر میں اپنی اس مادرِ درسگاہ کا پرچم بلند کر کے اس محسن ملّت کا نام روشن کرتے چلے آرہے ہیں۔ اس ہستی کی عظمت میں کیا کلام ہو سکتا ہے جو معلّم بھی تھا معمار بھی جو قوی ہیکل بھی تھا مگر قوم کے غم میں بیمار بھی، وہ ایسا غنی تھا جو قوم کے لئے کبھی بھکاری بنا اور کبھی مداری، جو خطیب بھی تھا اور ادیب بھی، جو مُنصف بھی تھا اور صحافی و مُصنّف بھی، جس نے ناموسِ دینِ مصطفیٰؐ کے تحفّظ کے لئے وہ کارنامہ انجام دیا جو دین کے بڑے بڑے دعویداروں سے نہ ہو سکا، اس نے شکست خوردہ وزبوں حال مسلمانوں کو ہمّت وحوصلہ دیا، ان کے مُنھ میں زبان اور ہاتھ میں قلم دیا۔ اس نے محض قوم کے مستقبل کی خاطر انگریز کی غلامی کرنا گوارا کی جس کے لئے اغیار ابھی تک طعنہ زن ہیں اور جب کارگہِ عالم میں اپنا اہم کردار ادا کرنے کے بعد یہ عندلیبِ بستانِ محمدؐ صلّی اللہ علیہ وسلّم خاموش ہُوا تو اس حالت میں کہ اپنا سب کچھ اپنے نانا کی اُمّت کے لئے لُٹا چُکا تھا اِتنا کچھ کہ اپنے گور وکفن کے لئے بھی کچھ نہ چھوڑا تھا۔

ہم نے جب سے ہوش سنبھالا اکابرِ قوم کو اپنے اس محسن کو طرح طرح سے نذرانۂ ہائے عقیدت پیش کرتے، بہتر سے بہتر اَلقابوں سے نوازتے سُنا، اس کے باوجود اس کے احسانات کا بوجھ آج بھی جُوں کا توں ہے، لیکن خدا بھلا کرے اہلِ رامپور کا جنھوں نے حال میں ہی سرسیّد نوازی کا منفرد ثبوت فراہم کیا۔ یُوں تو رامپور نے روزِ اوّل سے ہی علیگڑھ کی خدمت کی اور اس کے بانی سے بھرپور تعاوُن کیا، چُنانچہ محمڈن کالج کو یونیورسٹی بنانے کے دُشوار مرحلے میں اس وقت کے نواب حامد علی خان نے قدم قدم پر آغا خان کا ساتھ دیا جو یونیورسٹی کے منصُوبے کو

عملی جامہ پہنانے کے لئے سرگرداں تھے اور اس ضمن میں مبلغ ڈیڑھ لاکھ روپیہ کا چندہ فراہم کیا جو اُس زمانہ میں بلاشبہ ایک خطیر رقم تھی، چنانچہ علی گڑھ یونین کا رامپور حامد ہال اس عطیئے کی رسید کے بطور آج بھی موجود ہے، نواب صاحب کا تعاون خصوصی اس لئے زیادہ قابلِ قدر ہے کہ یہ وُہی ذاتِ شریف ہیں جو نہ صرف تعلیم سے بے بہرہ تھے بلکہ علم کی دوستی کو مضرت رساں سمجھ کر خائف از علم رہتے تھے اور جن کے مظالم وچیرہ دستیوں اور عیش پرستیوں کے افسانوں کا زمانے میں چرچا تھا۔

اسی شہر رامپور کو غالبؔ 'دارالسّرور' کہا کرتے تھے مگر جو اب کثرت آبادی اور روایاتِ حسنہ کی پامالی، عدل وانصاف کی نایابی اور جستجوئے علم کے فقدان کے سبب 'دارالشرور' بنتا جارہا ہے جہاں اب پہلے سے کہیں زیادہ اسکول ومدارس قائم ہیں لیکن علم کے سچّے متلاشی شاذ ہی نظر آتے ہیں، کیونکہ بڑے شہروں کی دیکھا دیکھی رام پور میں بھی 'علم فروشی' ایک کاروبار بن چکا ہے اس لئے بجائے ماہرینِ تعلیم اب کاروباری حضرات بیڑی کے کارخانوں کی طرح درس گاہوں کی صنعت چلا رہے ہیں لامحالہ علم اور معیارِ تعلیم گھٹتا جارہا ہے لیکن فیسوں اور بستوں کا بوجھ بڑھتا جارہا ہے۔ اس ضمن میں محض رامپور کو کیا دوش دیا جائے جبکہ یہ مرض آفاقی ہوچکا ہے اور کم از کم برِصغیر پاک وہند کی آب وہوا تو اسے بہت راس ہے۔

ہمیں جب شوقِ زیارت نے اُکسایا اور جنوری ۱۹۹۰ء میں اپنی جنم بھومی کی یاترا کرنے گئے تو وہاں بزرگوں کے مقدّس مزارات کی زیارت کے ساتھ اعلیٰ اقدار کے شکستہ مقابر بھی دیکھنے کو ملے۔ زرپرستی اور زرگیری کے مقابلوں نے پیار و محبّت جیسی 'ہارڈ کرنسی' کو بھی بُری طرح متاثر کیا ہے اب نہ وہ روایتی جذبۂ ہمدردی ہے نہ ایثار آمادگی، بلکہ بیشتر کوششیں اور وسائل ایک دوسرے کو نیچا دکھا کر ووٹ یا نوٹ حاصل کرنے کے لئے دھڑلے سے استعمال کئے جاتے ہیں۔ خیر

اللہ اللہ کر کے ان دنوں بے زبانوں نے زبان پائی ہے اور فراموش کردہ شہر کے باسیوں کو ان کا اپنا ایک ترجمان ملا ہے۔ کیا پتہ خدا اسی ذریعے سالہا سال کی محرومیوں اور ناانصافیوں کا ازالہ کر دے اور شہر کی کھوئی ہوئی رونقیں واپس آجائیں۔ یہاں یہ تذکرہ برمحل ہوگا کہ عرصۂ دراز کے بعد رامپور کی میونسپلٹی جو اب نگر پالیکا کہلاتی ہے کے بحال ہونے سے کیچڑ سے منجمد نالوں پر رقّت طاری ہونے لگی ہے اور ناہموار گلیوں اور شکستہ نالیوں کی مرمّت و دیکھ بھال شروع ہوگئی ہے شاید اسی وجہ سے وہاں پر آئندہ مہمانوں کی پذیرائی کے لئے مچھروں کے "کوی سمیلن" سننے کو نہیں ملے۔ یہ آثار نہایت خوش آئند ہیں بشرطیکہ کارکردگی کا جذبہ سرد نہ پڑ جائے اور نالوں کی مٹّی واپس نالوں میں نہ پاٹ دی جائے جو میونسپلٹیوں کی پسندیدہ ادا ہے۔ اپنے اجداد کے اس دیار میں میل مُلاقات کے علاوہ زیادہ وقت کوچہ نوردی میں گزارا اس لئے آثارِ قدیمہ کے ساتھ آثارِ نو پر بھی نظر پڑ کر کسی قدر تسلّی ہوئی اسی گشتی معائنے کے دوران ہمیں رامپور میں چھوٹے بڑے ہر سائز اور تراش کے اسکول نظر آئے۔ ننھے مُنّے یونیفارم میں ملبوس بچے بھی دیکھے جو رکشاؤں میں ایسے خوبصورتی سے چُنے ہوتے ہیں جیسے فارم کے پنجروں میں چوزے' ان جدید اسکولوں کے نام بھی جدید طرز کے ہیں جس سے ظاہر ہوا کہ ان مدارس میں درس و تدریس سے زیادہ انگریزی پیروں یعنی 'سینٹس' کی توجہات سے برکات حاصل کی جاتی ہیں۔ ظاہر ہے ان نیم یا فرضی پیروں کے ناموں سے فروغِ علم تو کیا ہی ہوسکتا ہے کاروبار میں ترقی البتہ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ان 'سینٹس' کی آشیرباد سے اسکولوں کی نئی نئی شاخیں شہر کے گلی کوچوں میں پھیلتی جارہی ہیں جن کے طرزِ تعلیم کی بدولت طالب علم علم سے محروم ان کے والدین ناتواں' مگر مالکان اسکول دن بدن توانا ہوتے جارہے ہیں' جن کی توندیں بچّوں کے بستوں کی طرح بھاری ہوتی جارہی ہیں۔ چنانچہ تعلیم کے یہ

بیوپاری ہر سال اپنی شاخوں میں اضافہ کرتے جارہے ہیں اور "مُردار بیل" کی طرح یہ کمرشیل سلسلۂ تعلیم خوب پھل پھول رہا ہے۔ سینٹوں کی طلب میں اس روز افزوں اضافہ کی وجہ سے پیرانِ عظام کے نام اس حد تک کم پڑ گئے کہ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے 'سینٹ تلاشی' و 'سینٹ سازی' کا فن معرضِ وجود میں لایا گیا۔ لہٰذا ایسے ہی ایک 'سینٹ جُو' کو جب مَردوں کی فہرست میں کوئی موزوں نام دستیاب نہ ہو سکا تو انھوں نے ایک مسلمان خاتون کو سینٹ بنا کر نسوانی توجہات کا وسیلہ اختیار کیا اور کوہِ نینی تال کی شاداب چوٹی پر "سینٹ اَمَتہ" (ST. AMATUN) کے نام سے بچیوں کا اسکول قائم کر دیا جو اپنے اسلامی نام کی کشش سے کاروبار میں ترقی کی چوٹیاں سر کر رہا ہے۔

جہاں اس قسم کے جدید الاسم اداروں کی ولادت ہمارے لئے تعجب انگیز تھی وہاں رامپور کی مشہور شاہراہ راجدوارہ پر 'سینٹ سرسیّد' اسکول کا بورڈ آویزاں دیکھ کر ہمیں استعجاب سے زیادہ خوشی ہوئی کہ اس جہان سے رُخصت ہو جانے کے بانوے سال بعد ہی سہی کسی عقیدت کیش نے سرسیّد جیسے بے پیرے کو پیر و مُرشدمان ہی لیا۔ اب یہ فعل عالمِ جنوں میں سرزد ہُوا ہو یا یہ دلیلِ بیداری ہو اس کے متعلق کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ ہاں اس میں کوئی شک نہیں کہ 'اسمِ سرسیّد' سے اکتسابِ فیض کا ایک سلسلۂ جاریہ قائم کر دیا گیا جس سے بانیٔ ادارہ کو تو فاقہ مستی کا کوئی خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا البتہ 'سینٹ سرسیّد اسکول' اپنے قائم کرنے اور چلانے والوں کے پھلنے پھولنے کا یقیناً ضامن رہے گا۔ مگر یہاں یہ ماننا پڑتا ہے کہ اللہ میاں کس کس طرح اپنی مخلوق کو فراہمیِ رزق کے مواقع فراہم کرتے ہیں ان کے کام واقعی کیسے نرالے ہیں! اور اس طرح سرسیّد کے عقیدتمندوں کے دیرینہ خواب کی تعبیر تو میسّر آ گئی کیونکہ ایم اے او کالج اور یونیورسٹی سو سال سے موجود ہوتے ہوئے بھی جو سرسیّد پیر نہ بن سکے تھے بچوں کے اس چھوٹے سے مدرسے نے دو سال میں ہی انہیں

'سینٹ' کے منصب پر سرفراز کروادیا۔

خُدا کا شُکر ہے کہ نبی آخرالزماںؐ کی تشریف آوری کے بعد سلسلۂ نبوّت تکمیل کو پہنچ چُکا ہے وَرنہ اختراع شعاروں نے تو نہ جانے کتنے نئے انبیاء بنا کر ان کے ناموں سے استفادہ کا کاروبار شروع کر دیا ہوتا۔

ہمیں افسوس ہے کہ دلی خواہش کے باوجود ہم 'سینٹ سرسیّدؒ' کے اسکول کے موسس اور متولّی صاحب سے شرف نیاز حاصل نہ کر سکے اس لئے فی الوقت 'ماحضر' سے زیادہ معلومات سے تواضع نہیں کر سکتے البتہ یہ پیغام آپ سب کی طرف سے انہیں پہنچوایا ہے کہ اگر ہمارے سینٹ یا شاہ سرسیّد قدس سرہٗ العزیز کا عُرس سراپا قدس منانے کا پروگرام ہو تو ہمیں بھی داخلِ حسنات ہونے کا موقع دیں اور جس دن یہ مُبارک سلسلہ مقبول ہو گیا تو پھر سینٹ ساز اسکول یا کالج جیسے مشغلوں سے ہمیشہ کے لئے بے نیاز ہو جائیں گے۔

—— ·)·)·(:·:·)·(·(· ——

چٹکی کا لمس

دُنیا میں بالعموم سَفر کا مقصد سیر و سیاحت سمجھا جاتا ہے جو بڑی حد تک درست بھی ہے چونکہ اب تو سیاحت کی سارے عالم میں ایسی دُھوم ہے کہ قریہ قریہ کوبہ کو اور صحرا بہ صحرا شوخ بھڑکیلی پوشاک میں ملبوس ٹورسٹوں کے غول کے غول نظر آتے ہیں اور حکومتوں کو سیّاحوں کی پذیرائی بلکہ اپنی کمائی کے لئے باقاعدہ محکمے اور وزارتیں بنانا پڑ گئی ہیں اور اب 'ٹورزم' ایک ایسا عالمی کاروبار ہو چکا ہے جس کی بدولت لاکھوں انسان مصروف جہاں نوردی ہیں اور اس سے بھی زیادہ اس ذریعے سے رزق پاتے ہیں چنانچہ یہ دَھندا روز بروز بڑھتا ہی جا رہا ہے اور شوقِ سیاحت بھی زرگیری کا بڑا وسیلہ بن گیا ہے لیکن ابھی دُنیا خصوصاً ایشیائی ممالک میں ایسے موانست جُو، وضعدار لوگ پائے جاتے ہیں جن کا مقصدِ سفر سیر سپاٹا نہیں بلکہ دور افتادہ احباب سے تجدیدِ ملاقات ہوتا ہے یہ وہ محبت کے مارے ہوتے ہیں جو اس سَفر کے لئے ساری زندگی کی پونجی نذر کیا کرتے ہیں، طرح طرح کی صعوبتیں جھیلتے ہیں تاکہ اپنے پیاروں کی جھلک دیکھ لیں ان کی زبانی ان کی خیریت سُنیں اور اپنی کہانی انہیں سُنائیں اُنہیں اس سے کوئی سروکار نہیں کہ تاج محل کہاں ہے لال قلعہ کدھر ہے کشمیر اب بھی بے نظیر ہے یا نہیں۔ اس بارے میں ہمارے ہندوستانی دوست نے کچھ انوکھی رائے کا اظہار کیا بقول ان کے "کشمیر کا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہونا چاہیئے چونکہ جب

پاکستان کے حصّہ میں بے نظیر آگئی تو کشمیر بھارت کو ہی ملنا چاہیئے"۔ ان کے خیال میں پاکستان بیک وقت کشمیر و بے نظیر کا دعویدار کیونکر ہو سکتا ہے۔ ہم اپنا شمار بھی ان ہی مُسافروں میں کرتے ہیں جو محبّت کے گُلدستے لئے جاتے ہیں اور پھُولوں کی خُوشبو میں بسے ہُوئے لوٹتے ہیں' ہم جب بھی پورب اُور جاتے ہیں تو وہاں چاہنے والے ہم سے زیادہ بیقرار نظر آتے ہیں اور جب ہم والہانہ طور سے ایک دوسرے کو چمٹتے ہیں تو قلب و دماغ کو سکون و فرحت کی دولت میسّر ہوتی ہے۔ ان لطیف لمحات میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہم نے دُنیا کے سب سے اُونچے پہاڑ کی چوٹی سر کرنے کے بعد اس پر فتح کا جھنڈا لہرا دیا ہو۔ ہندوستان پہنچ کر خوشی و انبساط کی موجوں سے گزُرنے کے بعد ہم عالمِ بیقراری میں بزُرگوں اور دُنیا سے رُخصت ہو جانے والے دوستوں کی نشانیاں ڈھونڈتے ہیں۔ در و دیوار سے صُورت گری کرتے ہیں کھنڈروں میں نقش و نگار بناتے ہیں' تند و تیز ہوا کے شور میں جانی پہچانی صدائیں سُنتے ہیں اور جنھیں سُنکر یہ معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی دُور بہت دُور سے ہمیں دھیمی آواز دے رہا ہو ہمیں پہچان کر پکار رہا ہو' یہ وہ لطافتیں ہیں جو ان مُسافتوں کا انعام ہوتی ہیں اس لئے بار بار ان صُورتوں کو دیکھنے' نگارخانۂ احباب میں جھانکنے' اور بھولی بسری پیاری پیاری آوازوں کو سُننے کو جی چاہتا ہے اور یہی للک نہ جانے ہم جیسے کتنے لاکھوں کو ہندوستان سے پاکستان اور پاکستان سے ہندوستان کے سفر کی صعوبتیں جھیلنے پر مجبُور کرتی ہے لیکن ایک المیہ یہ ہے کہ ان فطری جذبات کے طوفانوں کو حکومتیں اپنی سرد مہری سے دبانا چاہتی ہیں۔ وہ بطور پالیسی محبّتِ باہمی کے رشتوں سے نا آشنا رہتی چلی آئی ہیں اس لئے سال بہ سال پابندیوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ سفر کی سختیاں بڑھتی جاتی ہیں' لہٰذا محبّت کے ماروں کو کسٹمز ایمی گریشن وغیرہ کے عذابوں کو گوارا کرنا پڑتا ہے اور چوبیس چوبیس گھنٹے کبھی سخت سردی

میں اولوں اور کبھی شدید گرمی میں لُو کا مزہ چکھنا پڑتا ہے لیکن پریم دیوانے مجنوں بن کر ساری مصیبتیں جھیل رہے ہیں اور صرف ملنے کی آس پر شدید تر جسمانی و ذہنی امتحانوں سے گزر رہے ہیں جبکہ سب جانتے ہیں اور آئے دن ٹی وی پر دیکھتے بھی ہیں کہ اُسی دیس ہندوستان سے آنے والے سکھ یاتریوں کی کیسی آؤ بھگت کی جاتی ہے کتنا شاندار استقبال ہوتا ہے جو بلاشبہ ایک احسن اقدام ہے لیکن اس کے برعکس دوسرے مسافروں کو جو اپنے ہی دینی بھائی ہیں کس کس طرح ستایا جاتا ہے کس بے حیائی سے رشوتیں دینے پر مجبور کیا جاتا ہے لیکن ان مظالم کی داستانیں اخبارات میں شائع ہونے کے باوجود میزبان حکومت کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ ایک یہی رونا کیا جس خطۂ زمین میں عوام نامی مخلوق ہی نہ ہو یا اس پر اتنی بے حسی طاری کر دی گئی ہو کہ اُسے اپنی موجودگی کا احساس مٹ گیا ہو جہاں ہر دور میں چند دولتمند تعیش پسند مبتلائے ناؤ نوش خاندان ہی مُلک کی قسمت کے مالک رہے ہوں وہاں شکوہ و فریاد کیا معنی؟ معلوم نہیں اگر آج کے دور میں علّامہ اقبال زندہ ہوتے تو اس لاوارث قوم کی زبوں حالی کا شکوہ اللہ تعالیٰ سے کس انداز سے کرتے۔

دل کے پھپھولے مزید پھوڑنے سے کیا حاصل آیئے اپنی منزل کی طرف قدم بڑھاتے ہیں، ہم نے ہمیشہ کی طرح ۱۹۹۰ء کی جنوری میں یاروں کی تلاش کا سفر کیا، اپنوں کی مہک، دہلی علیگڑھ پٹنہ اور رامپور کے علاوہ جہاں جہاں لے گئی ہر ہر قدم ہمارا نفس، ہزار گلے کی خوشبو سے رچتا بستا چلا گیا چنانچہ احباب سے یہ رُوح افزا ملاقاتیں ابھی تک مشامِ جاں مُعطّر کیے ہوئے ہیں اور دل چاہتا ہے کہ کوئی ہمیں ذرا چھیڑے اور ہم آپ بیتی سُنانے لگیں۔

منجملہ سینکڑوں پُرخلوص مُلاقاتوں کے اس مرتبہ ایک دوست سے اس طرح لُطفِ باریابی حاصل ہوا جو بلاشبہ اس سفر کا حاصل بن گیا۔ اوائل فروری ۱۹۹۰ء میں

جب ہم علیگڑھ نصیب ہوئے تو موسم اپنے خوشگوار ترین دور سے گزر رہا تھا جابجا رنگا رنگ پھولوں کی محفلیں سجی ہوئی تھیں ان دنوں نہ گرمی کا گزر تھا نہ سردی کی حکمرانی بلکہ عنایاتِ خداوندی کی فراوانی ہر سُو جلوہ گر تھی جس سے کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید اللہ میاں نے مہربان ہو کر اپنے بندوں کو حسبِ منشا موسم بنانے کی اجازت دے دی ہو اور آپ جانتے ہیں کہ جب سمے سُندر ہو تو رونی شکلوں پر بھی مسکراہٹیں کھیلنے لگتی ہیں۔ اس لئے ہم جن عزیزوں اور دوستوں سے ملے بلا تخصیص سب ہی کو اپنی پذیرائی کے لئے چشم براہ پایا۔ ان میں دیرینہ وضعدار ڈاکٹر ابرار مصطفےٰ خان اور سدا بہار طرحدار وحید قریشی بھی تھے نمونہ انکسار بھاری بھرکم بھائی محمد احمد پی آر او بھی تھے اور اولاد جیسی چاہت سے گھر کو گل و گلزار بنائے رکھنے والی سراپا شفقت بیگم رشید احمد صدیقی بھی، ہمیں یونیورسٹی کے خادم دیرینہ و قدیم ترین علیگ بھائی محترم عُبید الرحمٰن خاں شیروانی سے بھی جن پر اب اُن کے سائے کا گمان ہوتا ہے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہم نے ہر جگہ حق چائے ادا کیا پھر بھی بعض احبابِ مزاج شناس نے ہماری نیت کو تاڑ کر مہماں نوازی میں چار چاند لگائے اور شہرۂ آفاق مٹری اور گزک کی رسدیں بالائے قلعہ سے لاکر لال ڈگی تک پہنچائیں۔ ہم علیگڑھ میں صرف بزرگوں اور دوستوں سے ہی نہیں اپنے جواں سال علیگ بھائیوں سے بھی ملے ان کو مصروف حصولِ علم دیکھا ہم ان کے نگراں اساتذہ سے بھی ملے اور ہوسٹل کے بیروں سے بھی شرفِ نیاز حاصل کیا۔ حاکمانِ ڈائننگ ہال یعنی باورچیوں کے دستِ کمال کی بانگی بھی دیکھی جس کی لذت و شناخت پچاس سال گزرنے کے بعد بھی جوں کی توں قائم پائی، ہم نے فٹ بال گراؤنڈ پر ہیجو دیو افریقہ سے درآمد شدہ کالے کالے کھلاڑیوں کو لڑتے جھگڑتے دیکھا مگر اتنے تن و توش کے باوجود ہمیں یہ سب کھلاڑی بالکل اناڑی نظر آئے چونکہ ہمارے یہاں جن معمولی تنازعات کا

حل کلاشنکوف یا ٹی ٹی پستول سے کیا جاتا ہے وہاں اس وقت صرف گھونسوں اور لاتوں سے ہی قضیہ چکایا جا رہا تھا، ہم نے ایک سہ پہر مشہورِ زمانہ یونیورسٹی ہاکی گراؤنڈ پر پتلون پہنے کھلاڑیوں کا دردناک منظر دیکھا اور دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اب گراؤنڈ پر بھی یونیفارم کی قید و بند نہیں اس لئے یونیورسٹی کلر کی جرسی تو ایک سرے سے ہی ندارد تھی ممکن ہے انٹر ورسٹی ٹورنامنٹ کے موقع پر جرسیوں اور کلر کے کوٹوں کی رونمائی کرادی جاتی ہو' الغرض بہت سے ناآشنا آشنا بنے اور آشنا باعثِ راحتِ جاں ہوئے۔

اِسی عرصہ قیام میں ہمیں یہ مسرّت انگیز خبر موصول ہوئی کہ بھائی اسرار احمد ہماری یاد میں مُبتلا ہیں اور چونکہ وہ بینائی کھو چکے ہیں اس لئے ہم نے پہلی فرصت میں ان سے ملنے کی ٹھان لی' اس سے پیشتر کہ اس مُلاقات کا مفصّل حال احوال سُنائیں مختصر سا اسرار کا تعارف کروانا ضروری معلوم ہوتا ہے، ۱۹۴۷ء میں ہم جب علیگڑھ میں سیکنڈ ایئر کے طالب علم تھے اسرار یونیورسٹی اسکول کے سینئر طلبا میں تھے اور میٹرک پر حملہ آور ہونے والے تھے' وہ اکثر اپنے دوستوں سے ملنے ہمارے ہوسٹل تشریف لایا کرتے' چونکہ بے اِنتہا ہنس مُکھ اور ملنسار واقع ہوئے تھے اس لئے کسی کوشش کے بغیر ہم بھی ان کے یاروں میں ہو گئے' اسرار گو بڑے بوٹا قد واقع ہوئے تھے لیکن کسی طرح بھی ان کا معشوقوں میں شمار نہیں کیا جا سکتا تھا چونکہ ان کا چہرہ گھنے بالوں کے ٹرف سے آراستہ تھا اور وہ پابندی سے شیو کرتے تھے جبکہ ہماری مسیں بھی ٹھیک سے نہیں بھیگی تھیں' ان کا چھوٹا ڈیل' ٹھکا ہُوا جسم اور ہر دم ہنستا مُسکراتا چہرہ دیکھ کر یار دوستوں کا موڈ تازہ ہو جاتا تھا اور وہ ادھر متوجّہ ہونے پر مجبور ہو جاتے تھے، اسرار کے مزاج میں شوخی ضرور تھی لیکن عیّاری نام کو نہ تھی' میٹرک کا بار

گراں سر سے اُتارنے کے بعد وہ ہوسٹل میں ہمارے پڑوس میں ہی رہائش پذیر ہو گئے جہاں وہ ہمارے ساتھ تمام اعلیٰ پایہ شرارتوں میں پیش پیش رہا کرتے انھوں نے ایک حقیقی ڈرامے میں بہت حسن و خوبی سے جواں سالہ مُغنّیہ کا کردار ادا کیا تھا جس کا تفصیلی تذکرہ ہم اپنے مضمون 'صاب' میں کر چکے ہیں جو ہماری تصنیف 'دیوانِ عام' کا ایک دلچسپ باب ہے۔ الغرض اپنی خوبیوں اور کارکردگی کے بل پر اسرار ہماری پارٹی کے ایک سرگرم اور اہل رُکن بن گئے اور ان کی معیّت میں چند سال بڑے دلچسپ گزرے۔ اکثر چھٹی کے دِن یا شام کو جب یاروں کی محفل جمتی اور احباب کی حماقتوں اور شرارتوں کا حال سُنا جاتا تو میاں اسرار پھُدک کر لاڈلے بچّے کی طرح ہماری گود میں بیٹھ جاتے جس سے ہم پہ شفقت کا ایسا غلبہ طاری ہوتا کہ ہم ان کے گالوں کی چٹکیاں لینے لگتے حالانکہ اس وقت یہ محسوس ہوتا جیسے اُنگلیاں رُخساروں پر نہیں، ریگ مال پر پھیری جا رہی ہوں چونکہ میاں اسرار بقامت مختصر واقع ہوئے تھے ورنہ بعمر وہ سب سے بڑے ہی تھے اس لئے اکثر لڑکے اِس بارانِ نازِ نعم پر جُملے کستے تو اسرار کہہ دیتے "ہم بچّوں کے مُنہ نہیں لگتے جاؤ برخوردار برابر والوں سے مذاق کیا کرو، تمہارے باپ میرے ساتھ کھیلا کرتے تھے، ان سے پوچھ لینا۔"

پھر ۱۹۳۹ء میں گوروں کی چاند کھُجلائی اور اللہ تعالیٰ نے ہٹلر سے ان کی ایسی جوتا کاری کروائی کہ تین چوتھائی دُنیا پر حکومت کرنے والوں کو لندن میں ہی خند قوں میں محصور کر دیا جس کے بعد بزیمت خوردوں نے اپنے محکوم و مجبور ہندوستانیوں کو لڑائی کا ایندھن بنانا شروع کر دیا اور طرح طرح کے لالچ دے کر نوجوانوں کو اپنی فوج میں بھرتی کر لیا۔ چُنانچہ حد تو یہ ہے کہ کُل پونے پانچ فٹ لمبے اسرار بھی انڈین ایئر فورس کے لئے منتخب کر لئے گئے۔ ممکن ہے 'ہٹلر زدہ' گوروں کو یہ سوجھی ہو کہ جاپانیوں کے مدِّ مقابل چھوٹا مال ہی چلے گا۔ اسرار نے چونکہ پڑھنے

لکھنے سے کبھی 'دل لگی' گوارا نہیں کی اس لئے انجام سوچے بغیر ایئر فورس میں کسی دفتری کام سے وابستہ ہو گئے پھر اس کے بعد طویل عرصے تک انہوں نے علیگڑھ کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھا۔ تقسیم ہند کے بعد البتہ اسرار یونیورسٹی کے کسی آفس میں مُلازم ہو گئے اور علیگڑھ کے ہو رہے اور وہاں سے سبکدوش ہو کر اپنی محرم اسرار کے ساتھ سرسیّد نگر میں بہن کے یہاں قیام پذیر ہیں' ان کے دو لائق و فائق بھانجے یونیورسٹی میں پروفیسر اور میڈیکل کالج میں ڈاکٹر ہیں جو اپنے ماموں کا بہت احترام کرتے ہیں شاید اس لئے بھی کہ اسرار کی بہن ان کا بہت خیال رکھتی ہیں۔ اسرار نے جب ایئر فورس میں رہ کر کوئی بم نہ مارا تو اندرون خانہ ان سے کیا توقع کی جا سکتی ہے اس لئے لاولد رہے اس وقت جبکہ وہ پینسٹھ ستّر کی لپیٹ میں ہونگے۔ بصارت سے محرومی ان کے لئے عذابِ جاں سے کم نہیں اللہ کا شکریہ ہے کہ 'بھابی' بقیدِ حیات ہیں جو ہمارے اس گود بیٹھلے بچّے کو سنبھالے ہوئے ہیں ورنہ نہ جانے بچارے کو کتنی مزید صعوبتیں برداشت کرنا پڑتیں۔

اسرار کا پیغام پانے کے بعد ہی ہم اپنے کزن خوشنود خان کے ہمراہ اسرار کی قیام گاہ پر پہنچے اطلاع کرائی کچھ دیر عالم انتظار میں ڈرائنگ رُوم میں بیٹھے، ان کے بھانجے اور ان کی بیوی سے گفتگو کرتے رہے کہ اتنے میں بیگم کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے جناب اسرار کمرے میں داخل ہوئے، لکھنؤ طرز کا سفید ڈھیلے پائنچے کا پائجامہ شفاف کپڑے اور ریشِ براق سے مُزیّن چہرہ چنانچہ ان کے کمرے میں قدم رکھتے ہی ایسا محسوس ہوا جیسے فلیش لائٹ کے بہت سے طاقتور بلب روشن ہو گئے ہوں، بیگم اسرار ان کے ہاتھوں کو بھانجے کے ہاتھ میں دے کر احترام حجاب سے شرما کر پیچھے رہ گئیں اور ہم اپنے اس محروم بصارت دوست کی پذیرائی کیلئے آگے بڑھ گئے۔ اسرار نے جذبات بھری آواز نکال کر کہا "بھیّا تم آ گئے"، اور یہ

کہہ کر ہمارے ساتھ چپک کر بیٹھ گئے، ابھی دو بچھڑے رفیقوں کے مابین داستان فراق شروع بھی نہ ہو پائی تھی کہ اسرار اچانک اُچک کر باندازِ دلبرانہ ہمارے زانو پر بیٹھ گئے جس کے بعد ہی بالکل غیر ارادی طور پر ہماری اُنگلیاں ان کے ریشیں دار رُخساروں کی چٹکیاں بھرنے لگیں لیکن جُوں ہی ہماری اُنگلیاں ان کے کلّوں سے مَس ہُوئیں ان کی آنکھوں سے موتی جھڑنے لگے جن میں سچّے موتیوں سے زیادہ آب تھی، چاہت کی آب محبّت کی آب۔

دیکھنے والے بچّے اس منظر کو حیرت و بے تابی سے دیکھتے رہے تکتے رَہے اور جب اسرار کا سیلابِ اشک ہماری رُوحوں کو سیراب کر چُکا تو وہ آہستہ سے واپس صوفے پر بیٹھ گئے۔

اس شدید تجدید موانست کے بعد ہم نے کیا گفتگو کی اور وہاں میزبانوں نے ہماری کس طرح مہماں نوازی کی، سچ تو یہ ہے کہ ہمیں کچھ بھی یاد نہیں۔ ہاں اسرار نے جس خونِ جگر سے ہماری تواضع کی وہ گُہر ہائے نایاب آج بھی ہماری گود میں بھرے ہیں، یہ وہ تُحفہ ہے جس کا نہ کوئی مول ہے نہ تول۔ واقعی ہم کتنے خوش قسمت صاحب احباب ہیں کہ دوست موتی لُٹا کر ہماری پذیرائی کرتے ہیں۔ قیام ہندوستان کے دَوران یہ وہ سوغات نصیب ہُوئی جو سرمایۂ زیست ہے، بیشک یہ ایسا گراں قدر نذرانہ ہے جسے نہ کوئی چھین سکتا ہے اور نہ کبھی چُرا سکتا ہے۔

کمالاتِ میرٹلینڈی

ذکر ہے جولائی ۱۹۴۱ء کی نوجوانی کا ہمیں علیگڑھ یونیورسٹی میں داخلے کا اعزاز پائے ایک نازک سال گزر چکا تھا۔ نازک اس اعتبار سے کہ نو واردانِ علیگڑھ پر سالِ اوّل کچھ زیادہ گراں گزرتا ہے۔ 'فرسٹ ایئر فول' کا تمغہ تو ہر کالج اور یونیورسٹی میں پہلے سال کے طالب علم کو از خود ہی دے دیا جاتا ہے، لیکن علیگڑھ میں داخل ہونے والے کو بہت سے دیگر متنوع تربیتی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ کتنی ہی روایات کا پاس رکھنا ہوتا ہے، اور اپنی عادات اور کبھی مرضی کے خلاف بھی رہ کر طرزِ زندگی گزارنے کے طریقے سیکھنے ہوتے ہیں۔ گھر اور ماں باپ کی شفیق نظروں سے دور رہ کر یہ مختصر دور ایک کڑی آزمائش ہو جاتا ہے۔ چنانچہ طبع نازک رکھنے والے بھونرے میں پرورش کئے جانے والے لڑکے ان امتحانوں سے نبرد آزما نہیں ہو پاتے اور پہلے ہی سال دم دبا کر علیگڑھ سے فرار ہو جاتے ہیں، مگر ایسے بھگوڑوں کی تعداد بہت ہی کم ہوتی ہے اس کے برعکس ایسے جیالے جو یہ ایامِ مشقت جھیل جاتے ہیں، وہ ہمیشہ کو علیگڑھ کے ہو جاتے ہیں بلکہ علیگڑھ انھیں اپنا لیتا ہے۔ ایک دو سال کے لئے نہیں بلکہ تمام عمر کے لئے ؎

جو درس گاہ محبت میں ایک بار آیا　　وہ سوئے دیر و حرم عمر بھر نہیں جاتا

اس نرالی درس گاہ میں ان کو ماں کی گود کا سکون اور پیار ملتا ہے۔ باپ جیسی بھرپور

شفقت اور حفاظت مہیّا ہوتی ہے۔ سگے بھائیوں کی سی اخوّت و موانست ملتی ہے، اور جہاں اتنی محبتوں کا جمگھٹا ہو وہاں سب بچّے اور اچھّے علیگ بن جاتے ہیں، انہیں گھر سے زیادہ علیگڑھ عزیز ہو جاتا ہے چونکہ والدین کی جگہ اُستاد لے لیتے ہیں، اور بھائیوں کی تو اتنی بڑی برادری بیک وقت میسّر ہو جاتی ہے کہ ہمہ وقت انہیں میں دل پڑا رہتا ہے۔

جی ہاں، تو ہم گرمیوں کی تعطیلات نہایت فراخدلی سے گھر پر خرچ کر کے علیگڑھ واپس پہنچے تو یہاں نئے رنگروٹوں کا ہر طرف میلہ لگا تھا جو اپنے سرپرستوں کی زیرِ نگرانی یونیورسٹی میں داخلے اور ہوسٹل میں جگہ پانے کے کٹھن مراحل سے گزر رہے تھے جو لڑکے اس پُل صراط کو پار کر چکے تھے، وہ اپنی پہلی کامیابی پر مطمئن و مسرور نظر آ رہے تھے۔ پرووسٹ اور وارڈن صاحبان پر ان ابتدائی ایّام میں کام کا خاصا بار اور اس سے زیادہ سوشل دباؤ ہو جاتا ہے۔ ہر ایک کو اچھّا ہوسٹل، اچھّا کمرہ، اچھّا پارٹنر درکار ہوتا ہے جو سب کو فراہم کرنا ناممکن ہے۔ پھر بھی جیسے تیسے ہر ایک کو ٹھکانے کی کوشش کی جاتی ہے اور بسا اوقات جگہ نہ ہوتے ہوئے بھی کہیں نہ کہیں گنجائش نکالنا پڑتی ہے۔ اس زمانے میں کلاسز برائے نام شروع تو ہو جاتی ہیں لیکن درس و تدریس کی باری نہیں آتی۔ لڑکے نئی جگہ اور نئے ماحول سے اپنے کو مانوس کرنے کے کوشاں ہوتے ہیں۔ بعض بزرگ اپنی اولاد کو ہر دلعزیز بنانے کے لئے 'سینئرز' کی تواضع میں محو ہو جاتے ہیں یا یوں کہیئے کہ سینئر طلباء 'سینیارٹی' کی 'رائیلٹی' خود ہی وصول کرتے ہیں۔

اُس پُر رونق اور ہنگامہ خیز ماحول میں ہم صبح کو اپنے وارڈن صاحب کی خدمت میں بغرض سلام حاضر تھے۔ پروفیسر عمر الدین صاحب محسن الملک ہوسٹل کے وارڈن ہی نہیں سب کچھ تھے وہ پہلے بلاک میں اقامت پذیر تھے یہ محسن الملک ہاسٹل

ایم ایم ہوسٹل یونیورسٹی کے تمام دُوسرے ہوسٹلوں سے اس لحاظ سے منفرد تھا کہ اس کی کوئی چہار دیواری یا پھاٹک نہیں تھا اور سنگ و خشت کی پابندیوں سے آزاد تھا۔ یہ سرسیّد ہاؤس کے قریب ہی واقع دو خوبصورت بنگلوں پر مشتمل تھا جن کے اطراف خوشنما باغیچہ مہکتی روشیں اور کھیل کے لئے وسیع میدان تھے۔ ادھر مشرقی سمت تا حدِّ نظر میدان تالاب اور کھیت تھے۔ اس لحاظ سے یہ یونیورسٹی کے 'بارڈر' پر تھا۔ آج اُس لق و دق میدان نے ترقّی کر کے ٹاؤن شپ کی حیثیت حاصل کر لی ہے، اور سرسیّد نگر جیسے پیارے نام سے پُکارا جاتا ہے۔ اب عالم یہ ہے کہ میدان و تالاب ڈھونڈے سے نہیں ملتے۔ ہر سمت خوشنما بنگلے، خوبرو مکین ہیں، پختہ سڑکیں ہیں۔ ہر گھر از خود سبزہ زار بنا ہے۔ پچھلے زمانے میں تاک جھانک کے شیدائیوں کو سعی بسیار کے بعد اگر چند برقعے نظر آجاتے تو وہ دن اچھا سمجھا جاتا تھا۔ اور پھر رات کو تادیر ان نظاروں کا تذکرہ ہوا کرتا تھا لیکن اب تو جیسے حُسن و جمال کے قدر شناسوں کے لئے ہر طرف نمائشِ خوباں لگی ہے۔ محبوبوں کے جُھرمٹ ہیں مگر ادھر دیکھنے کی کسے فرصت۔ اس طرح اب ہر سُو یورش غزالاں سے ٹھرکی عاشقوں کی جنس ناپید ہو چکی ہے حتیٰ کہ قومی عجائب گھر میں بھی ان کو ٹھکانہ نہیں میسّر ہو سکا۔ میڈیکل کالج کو شاہراہِ آرزو میرس روڈ سے سرسیّد نگر ہی ملاتا ہے۔ یکّے یکسر ندارد ہیں، تانگے کسی کونے بچالے میں فاقہ زدہ گھوڑے کے ساتھ مُنھ چھُپائے کھڑے ہیں۔ تاریخی کٹھ پُلا ترقّی پا کر کنکریٹ پُلا بن گیا ہے گو نام پُرانا ہی مقبول ہے یعنی کٹھ پلا کہلاتا ہے کہیں کہیں بسوں کا بھی گزر ہے ورنہ بالعموم آدمی پر آدمی سوار نظر آتا ہے گرچہ اس سواری کو بجائے مُنش ہتّھیا کے رکشا کا نام دیا گیا ہے۔ ترقّی اسی کا نام ہے جس کی بدولت اِنسانوں کو جانوروں کا درجہ مل گیا ہے۔ سائنس کے اس دَور میں جبکہ خلائی راکٹ اِنسان چلاتا ہے، ہمارے نادار ملکوں کا اِنسان آج بھی رکشا چلاتا ہے شب و روز معیشت کی ترقّی کے دعووں کے باوجود آبادی کی کثیر تعداد کو زندہ رہنے کا حق نہیں۔

تپتی دُھوپ میں رکشا چلانے والے کو دو گھونٹ ٹھنڈا پانی میسّر نہیں جبکہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے والے ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں سرگرم ناؤ نوش ہیں۔ ملک و قوم کے لامحدود وسائل پر چند محدود طبقوں کا قبضہ ہے۔ جمہوریت کے نام پر یہ تماشہ سب سے زیادہ ملکوں میں ہو رہا ہے۔ جتنا غربت، بھوک، جہالت بیماری اور بے روزگاری کے بوجھ سے پِس رہی ہے امیروں کے ٹھاٹ روز افزوں ہیں اور اس صورتِ حال سے سب باخبر ہیں اب ان حاکموں سے کوئی پوچھے کہ آزادی کی نعمت میں غریبوں کو کیا حِصّہ ملا! اس عالمِ مجبوری میں اگر لوگ ایّامِ غلامی یاد کریں تو اس میں ان کی کیا خطا ہے۔

دیکھنے والوں کو رکشا معیوب نظر آتی ہے لیکن چلانے والے سے پوچھو جو اسے اپنی ماں سمجھتا ہے۔ باپ کا درجہ دیتا ہے اس لئے کہ وہ اُسے روٹی دیتی ہے، روکھی سوکھی سہی اس کے بھوکے بچّوں کا کم از کم ایک وقت تو پیٹ بھرتی ہے یہ سوچ کر ہمیں رکشا سے پیار ہو گیا چونکہ انسان کو انسان پر رحم نہیں آیا لیکن رکشا نے خوفِ خدا کھایا ہے انسان کو سہارا دیا، ہمّت دی، رزق دیا اِس لئے رکشا منش رکشا ہے اپنے اس محسن کا احترام کرنا چاہیئے اور رکشا اور اس کے چلانے والوں سے پیار کرنا چاہیئے۔

ذکر تھا ایم ایم ہوسٹل کا سو وہ آج بھی ہے لیکن نہ تو اب وہ ہوسٹل رہا ہے نہ اس کا حُلیہ ہوسٹل جیسا ہے کیونکہ اب وہ محصور ہو چکا ہے، اس کے تالاب اس کے میدان اس کی کھُلی کھُلی فضا اس کی آزادی بنگلوں اور مکانوں نے چھین لی۔ البتّہ ان چالیس سال میں ایم ایم ہوسٹل کے اِرد گرد کئی مزید نئے ہوسٹل تعمیر ہو گئے اس طرح وہ اب ایم ایم ہال کے اعلیٰ منصب پر فائز ہو چکا ہے۔ مگر معلوم نہیں کہ محسن الملک کو بھی اس ارتقائے مدارج کا علم ہوا یا نہیں چونکہ ایم ایم ہال نئے

تو بہت ہیں لیکن نواب مہدی علی خاں محسن الملک کے مرتبہ شناس شاذ ہی نظر آتے ہیں۔

خدا غریقِ رحمت کرے ہمارے وارڈن عمر الدین صاحب بھی کیسی نوادر جوبیوں کا مُرقّع تھے۔ وہ رہنے والے مغربی پاکستان کے تھے قدرتاً ان کا لہجہ کرخت تھا اِس لئے شروع شروع میں لڑکے ان کے تیور دیکھتے ہی اور گفتگو سُننے سے پیشتر ہی خوفزدہ سے ہو جاتے تھے لیکن چند روز میں اَجنبیّت کے سارے پردے ہٹ جاتے اور وارڈن صاحب کی شفقت و محبّت دلوں میں جاگزیں ہو جاتی تھی۔ عُمر الدّین صاحب کے اس دربار صبحگاہی میں ان کا محبُوب بیرا رمضانی ایک نوجوان کو لئے کمرے میں داخل ہوا یہ حضرت نہایت معصوم بلکہ رونی شکل بنا کر اپنی بیگناہی کا تاثّر دے رہے تھے ان کا بدن چھریرا اور ڈیل بھی خاصا دراز مگر اتنا بھی نہیں کہ عقل کے حدوں سے گزر جائے ان کی چمکیلی نگاہوں سے ذہانت اور شرارت کی آمیزش کے شرارے نکل رہے تھے۔

"اوئے آدمی کے بچّے" عُمر الدّین صاحب نے اپنی نارمل آواز نکالی جو ہمیں ڈراؤنی محسوس ہوئی۔ "یہ تُو نے ڈاکٹری کہاں پڑھی؟ اَبے کھال میں رہ اور سیدھا چل نہیں تو ہم کو سیدھا کرنا خوب آتا ہے" یہ کہتے وقت ان کی آواز اور گرجدار ہو گئی تھی۔ یہ ان کی ناراضگی کا خاص انداز تھا۔ اس کے ساتھ ہی وارڈن صاحب نے موصوف کے کمرے کی منتقلی کا حُکم بھی صادر کر دیا۔ اس طرح وہ ہمارے بلاک بلکہ پڑوس میں جبریہ بھیجد یئے گئے۔ معتوب نوجوان کے چلے جانے کے بعد وارڈن صاحب نے ان کے جُرم کی وضاحت کی "ارے کل رات ہم ادھر سے گزر رہے تھے تو ایک لڑکا نظر پڑا جو بغل میں مچھر دانی کا ڈنڈا کھڑا کئے لیٹا تھا اور کراہ رہا تھا۔ ہم نے قریب جا کر دیکھا تو اسے بخار تھا۔ جب پوچھا کہ یہ ڈنڈا کیوں لگا لیا ہے

تو اس نے بتلایا کہ میں نے اپنے پارٹنر صاحب سے بخار کی شکایت کی تو انھوں نے کہا 'کچھ دیر یہ ڈنڈا لگائے رکھو سب ٹھیک ہو جائے گا'۔ دیکھ یار ہماری جان کو بھی کیسے کیسے آجاتے ہیں۔ دَر اصل سزا تو اس کو ملنا چاہیئے جو ڈنڈا لئے پڑا تھا۔" واردات کی اس تفصیل کو سُن کر سب مُسکرا دیئے، اور ہم بھی دل ہی دل میں خوش ہُوئے کہ چلو ایک کارآمد اور مزے دار ساتھی پڑوس میں آگیا، یہ مسکین چہرہ تبسّم بَرلب نوجوان سیّد افضل حسین تھے جن کے کمالات ہم اس وقت قلمبند کرنے چلے ہیں۔

یہ تو غالباً والدین کو بھی نہیں پتہ کہ افضل کا نام کیا تھا۔ پانچویں دَرجہ تک افضال حسین رہے۔ بعد ازاں ہائی اسکول تک اقبال حسین اور علیگڑھ پہنچتے پہنچتے افضل حسین بن گئے جہاں یار دوست انھیں میر صاحب، اور بے تکلّف احباب میر ٹینڈی کے لقب سے یاد کرتے۔ میر صاحب کے والد ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب وٹیرنری سرجن، جسے اس زمانے میں عُرفِ عام میں سروتی ڈاکٹر کہا جاتا تھا وہ آگرہ کے قدیم باشندے تھے اور محلّہ نائی کی منڈی کے پُرانے رہنے والے تھے اس وَجہ سے ان کا تعارف کرواتے وقت ہم لوگ کہتے کہ میر صاحب بڑے خاندانی لوگ ہیں۔ آج بھی اپنی ہی منڈی میں رہتے ہیں۔ میر صاحب نے ایف ایس سی ایگریکلچر میں داخلہ لیا تھا۔ ہم بھی سائنس کے طالب علم تھے اِس لئے ہاسٹل سے یونیورسٹی آتے جاتے اکثر ساتھ ہو جاتا جس کی وجہ سے باہم قُدرتی اُنسیّت پیدا ہو گئی۔ پھر میر صاحب کو تھوڑا بہت ہاکی کے کھیل میں بھی دخل تھا اِس لئے ہوسٹل کی حد تک ہاکی گراؤنڈ پر بھی مُلاقات رہتی لیکن سب سے زیادہ ان کے ہشّاش بشّاش رہنے کی عادت دلچسپ چلت پھرت اور پُرکشش شخصیّت نے اپنی طرف مائل کیا، اپنی ان خصوصیات کے باعث چند ماہ کے اندر ہی میر صاحب ہمارے یارِ غار بن گئے۔ میر صاحب نے ان تعلّقات کو وقتاً فوقتاً شکار کا گوشت کھلا کر مزید مستحکم اور مضبوط کر لیا۔ وہ اکثر دو دن

کی چھٹی میں آگرے چلے جاتے اور واپسی میں ناشتہ دان میں شکار کا سالن ہرن کے کباب، مُرغابیاں وغیرہ لئے لوٹتے تو ان کا والہانہ استقبال ہوتا۔ بالخصوص میر صاحب کے یہاں کا مُرغ تو مُرغوں کا مغلِ اعظم ہوتا جس کی وجہ یہ تھی کہ میر صاحب کے والد صاحب نے اس زمانے میں مُرغوں میں فیملی پلاننگ کا نفاذ کر دیا تھا یعنی وہ مُرغ کو پٹھا بننے سے پیشتر اپنی نشتر دستی سے نس بندی فرما دیا کرتے اِس لئے اُس کے گوشت کی لذّت و ذائقہ انوکھا ہوتا۔

جیسے جیسے دِن گزرتے گئے، ہمارے مابین بے تکلفی بڑھتی گئی اور میر صاحب کے جوہر کھُلتے گئے۔ چند مرتبہ کمرے پر تازہ ٹماٹر اور ہری مرچ وغیرہ دیکھ کر تعجّب ہوا کہ یہ سبز تازہ ترکاریاں کون لے آیا لیکن جب ہم اپنے ساتھیوں کی شاہ خرچی سمجھ بیٹھے تھے وہ میر صاحب کے فن کا ادنیٰ اظہارِ اوّلیں تھا، یعنی موصوف گورنمنٹ زراعتی فارم پر جب کبھی پریکٹیکل کرنے جاتے تو وہاں سے ترکاریوں کا تحفہ لئے لوٹتے۔ چُنانچہ سبزیوں کی رَسد کو کارآمد بنانے کے لئے کمرے پر بھاجی پکنا شروع ہوگئی۔ فارم کافی دُور تھا۔ میر صاحب کا اگر ادھر جانا نہ ہوتا تو پھر سبزی کی سپلائی مفقود ہو جاتی۔ اس پریشانی کو دُور کرنے کے لئے میر صاحب نے آس پاس کی کوٹھیوں کا ایگریکلچرل سَروے کر ڈالا جس سے یہ معلوم ہوگیا کہ کس کوٹھی میں کونسی فصل بوئی گئی ہے اور کب تیار ہوگی۔ یُوں تو ان منصُوبوں سے فیضیاب ہونے والوں میں دس بارہ یار دوست شریک تھے لیکن صحیح کارکُن آل علی الٹن، ریاض فرشوری مرحوم، اشفاق خان، راؤ حمید وغیرہ تھے مگر ہر مُہم کے لیڈر شروع سے لے کر آخر تک بلا دعوے غیرے میر صاحب ہی ہوتے تھے۔ ایم ایم ہوسٹل کے اطراف میں زیادہ تر کوٹھیاں جاننے والوں کی تھیں جو یا تو یونیورسٹی کے اساتذہ تھے یا یونیورسٹی کے دفاتر میں مُلازم تھے۔ اس لئے ہمارے لئے یہ شناسائی ان بنگلوں سے فصل کی اُگاہی میں مانع تھی۔ بالآخر ایک دن فقہی تصفیہ کیا گیا

کہ چونکہ طالبِ علم اُستاد کے لئے مثل اولاد ہوتا ہے اس لئے اولاد کو اُستاد کی ملکیت میں پورے حقوق حاصل ہیں۔ لہٰذا اس معاملہ میں جھجک نہ ہونا چاہیئے۔ حُسنِ اتفاق سے ڈاکٹر افضال قادری مرحوم کا بنگلہ بھی قریب ہی تھا جو ریاض فرشوری کے بہت قریبی عزیز اور ایک طرح سے سرپرست بھی تھے۔ میر صاحب کے مخبر نے خبر دی کہ ڈاکٹر صاحب کی چقندر کی فصل بہت اچھی ہے اور بالکل تیار ہے۔ یہ سن کر ریاض کے تو چھکے چھوٹ گئے مگر ان کو میر صاحب کی یہ دلیل ماننا پڑی کہ وہ تو علاوہ اُستاد کے گارجین بھی ہیں، اس لئے ان پر تو دُہرا حق بنتا ہے اور ہم تو بقدرِ شوق خوشہ چینی کرتے ہیں کوئی فصل تھوڑی اُجاڑتے ہیں چنانچہ رات میں میر صاحب دو ساتھیوں کو لے کر چقندری مہم (OPERATION BEETROOT) سر کرنے گئے۔ ادھر ریاض کا مارے خوف کے بُرا حال کہ اگر پہچانے گئے یا دھر لئے گئے تو بوریا بستر ہی لپٹ جائے گا اور خاندان میں مُنہ الگ کالا ہوگا۔

مہم کی واپسی میں جتنی دیر لگ رہی تھی ریاض پر اتنی ہی کپکپی طاری ہوتی جا رہی تھی۔ ہُوا یُوں کہ یہ لوگ بنگلہ میں چہار دیواری پھاند کر آسانی سے اُتر گئے لیکن واپسی پر علاقے کے چوکیدار کو دیکھ کر خواہ مخواہ یہ سمجھے کہ اس نے دیکھ لیا ہے۔ بس انا ڑی تو تھے ہی، میر صاحب کی دلجمعی کے باوجود بھاگ پڑے۔ اِدھر کتوں نے آدھی رات کے سناٹے میں جو بھگدڑ کی آوازیں سُنیں تو وہ بھی نوا نجی کے موڈ میں آگئے اور بُرے کارے لگانا شروع کر دیئے۔ نتیجے میں تینوں چقندر توڑ علیحدہ علیحدہ راستوں سے ہوسٹل پہنچے تو اس عالم میں کہ صرف میر صاحب باچقندر تھے۔ بقیہ کو اتنا ہوش بھی نہ تھا کہ مالِ غنیمت کب اور کہاں گر گیا۔

جیسے تیسے فصل کاٹنے کا یہ پہلا ناکام تجربہ ختم ہُوا جس سے خاصا سبق حاصل ہوا۔ دوسرے دن سہ پہر کو ریاض کو بھیجا گیا کہ جائے واردات کی رپورٹ لے کر آئیں تاکہ تمام کارروائی سے متعلق صحیح روزنامچہ مرتب کیا جا سکے۔ ڈرتے ڈراتے بے چارے ریاض جب وہاں پہنچے تو دیکھتے ہیں کہ دونوں بھائی ڈاکٹر ابرار قادری

مرحوم اور ڈاکٹر افضال قادری مرحوم بڑی سرگرمی سے تفتیش میں مصروف ہیں۔ ان کی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ آخر چور نے واردات کے بعد چقندروں کو سڑک پر کیوں بکھیر دیا۔ دوسرے دونوں بزرگوں کا اس امر پر اتفاق تھا کہ یہ کسی پیشہ ور باغبان کا کام نہیں بلکہ جس طرح سے کھود اگیا ہے وہ کوئی اناڑی ہی کر سکتا ہے لیکن ڈاکٹر افضال صاحب کو صدمہ یہ تھا کہ یہ پہلی فصل تھی جو لٹ گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر دو ڈاکٹر صاحبان یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ آخر چور کو یہ کیسے پتہ چلا کہ چقندر تیار ہو چکے ہیں۔ ریاض یہ سب کچھ سنتے رہے اور دم سادھے بیٹھے رہے، اور اس ضمن میں جب لڑکوں کا نام کہیں سے کہیں تک نہیں لیا گیا تب ریاض کے نیم مردہ جسم میں سانس آئی، پھر انھوں نے بھی موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا اور چقندروں کے زیاں پر اپنے دلی رنج و غم کا ذکر کر کے بخیر و عافیت ہوسٹل آ گئے۔

اس پہلی مہم میں چقندر تو نہیں ہاتھ آئے مگر ڈر سا نکل گیا! اس لیے پہلے سے زیادہ بڑے منصوبے بنائے جانے لگے۔ چھوٹی موٹی وارداتیں تو میر صاحب یکہ و تنہا ہی کرنا پسند کرتے تھے مثلاً محمد علی صاحب کے مکان پر دو چکوترے پسند آ گئے رات میں ادھر سے گزرتے وقت اُتارتے لائے۔ ڈاکٹر اسحاق صاحب کے یہاں سے چند سیر گاجریں نکال لیں۔ الغرض تھوڑے ہی عرصہ میں یار دوستوں میں میر صاحب کے ہاتھ کی صفائی کی دھوم مچ گئی تو دوسرے ہوسٹلوں اور بنگلوں سے وارداتوں کے دعوت نامے موصول ہونے لگے! اس زمانے میں بھائی آفتاب الدین خان امیر نشاں کوٹھی سے متصل کوارٹرز میں مقیم تھے جہاں امرود کا خاصا مناسب باغ بھی تھا۔ اب یہ ان کی شرافت تھی کہ صبح و شام امرود پکتے اور ٹوٹتے دیکھتے اور محض خوشبو لینے پر اکتفا کرتے لیکن جب میر صاحب کی کارگزاریوں کی شہرت ان تک پہنچی تو انھوں نے موصوف کو خصوصی "دعوتِ سرقۂ امروداں" دے ڈالی۔ چنانچہ میر صاحب نے

اپنی ٹیم کے ساتھ دو ہی کامیاب 'آپریشنز' میں درختوں کو ننگا کر دیا۔ لطف کی بات یہ کہ ڈر کے مارے آفتاب نے امرودوں میں سے حصّہ بھی نہیں لیا کہ کہیں ان کی خوشبو سے بھانڈا نہ پھوٹ جائے۔ اس طرح امیر نشاں پر چھاپے کی ساری یافت میر صاحب کے گویا ہم سب کے ہاتھ آئی۔ ان مسلسل کامیابیوں سے میر صاحب اور رفقاء کے حوصلے بڑھ رہے تھے مگر کسی طرح اسماعیل زبیری صاحب کے باغ پر ہاتھ ڈالنے کی ہمّت نہیں ہوتی تھی۔ اس باغ کے چاروں طرف خاصی اونچی دیوار تھی اور متصل ہی ان کا مکان تھا جس کی روشنی رات کو پیڑوں پر پڑتی رہتی تھی۔ اسی زمانے میں پپیتے کے پیڑ پھلوں سے لدے کھڑے ہر گزرنے والے کو دعوتِ خوردنی دے رہے تھے لیکن بیان کردہ حفاظتی حالات میں کامیابی کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی تھی، پھر ایک دن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ رات دس بجے بڑی سخت آندھی آئی اور زبردست گرج چمک کے ساتھ طوفانی بارش شروع ہو گئی۔ بس یہ دیکھتے ہی میر صاحب نے نیکر پہن لیا اور ٹیم کو "فالو۔ اِن" کا حکم دے دیا۔ سچّی بات ہے اس وقت بارش کی شدّت بجلی کی چمک اور بادل کی گرج سے ہم سب کا کلیجہ سہما جاتا تھا لیکن میر صاحب کی حکم عدولی کی تاب بھی کس میں تھی اس لئے اس اندھیری طوفانی رات میں ٹیم 'آپریشن نرسری' کے لئے نکل کھڑی ہوئی اور صرف ایک گھنٹے کے اندر ہی درجنوں پپیتوں کی کھیپ لئے واپس پہنچی اس وقت سب حملہ آور بھیگ کر چوہا ہو چکے تھے اور تھر تھر کانپ رہے تھے۔ ابھی پپیتوں کو ٹھیک سے رکھنے بھی نہیں پائے تھے کہ سامنے بارش میں بھیگتے دو اشخاص ہماری طرف آتے نظر آئے بس پھر کیا تھا سب یہ سمجھے کہ وارڈن صاحب آ رہے ہیں۔ اس وقت گھبراہٹ اور پریشانی کا جو عالم تھا وہ نہ پوچھئے۔ بجائے مشن کی کامیابی پر اظہارِ مسرّت کے میر صاحب پر گالیاں پڑنے لگیں مگر آنے والے جب قریب آئے

تو اپنے یار دوست ہی نکلے، جو ایسے شاندار موسم میں چائے کی تلاش میں ہماری طرف آ رہے تھے چونکہ انھوں نے میر صاحب کو ادھر آتے دیکھ لیا تھا اور اس ہیئت میں دیکھ کر یہ یقین کر لیا تھا کہ یہ کمرے پر پہنچ کر لازمی چائے پئیں گے۔ میر صاحب کی پھلوں کی تمام دیگر مہمّات میں یہ واقعی قابلِ ستائش کامیابی تھی جس میں انتہائی ذہین منصوبہ بندی اور حوصلے سے میر صاحب نے زبیری صاحب کی دفاعی میجنولائن، توڑ مروڑ کر رکھ دی۔ واقعی میر صاحب کو بڑے موقع سے بات سوجھتی تھی اگر وہ اس وقت طوفان سے فائدہ نہ اُٹھاتے تو زبیری صاحب کے باغ کے پیپتوں کا داغ ہمیشہ کے لئے دل میں لے جاتے۔

یہ حقیقت ہے کہ میر صاحب گرچہ پڑھنے لکھنے میں اتنی دلچسپی لیتے جیسے آجکل بیشتر تہذیب زدہ نوجوان مذہبی اُمور میں لیتے ہیں، یعنی عیدین کی نماز، الوداع کا روزہ اور بہت تیر مارا تو جمعہ بھی پڑھ ڈالا۔ لہٰذا میر صاحب بھی 'کلاسیز' کے معاملے میں کسی پابندی کے قائل نہیں تھے البتہ حاضری لگوانے کا پکّا بندوبست کر رکھا تھا۔ ان کے کھیل کا معیار بھی بس واجبی تھا۔ ہاکی کھیلتے کیا تھے بس ڈنڈے بجا لیا کرتے تھے مگر اپنے فن میں البتّہ وہ بلا شریک یونیورسٹی چیمپئن کہے جا سکتے تھے یقیناً وہ ان اُمور پر گیان دھیان کرنے کے بھی عادی تھے تب ہی تو ایسی دُور کی کوڑی لاتے اور اس خوبصورتی سے تجاویز کو عملی جامہ پہناتے کہ سب ساتھی حیرت زدہ رہ جاتے اور ان کی اعلیٰ کارکردگی کی داد دیئے بغیر نہیں رہتے۔ فرمائش پُوری کرنے کا تو گویا میر صاحب کو انتظار رہتا جہاں احباب نے کسی خواہش کا اظہار کیا اور میر صاحب پر اس کی تکمیل کا بھُوت سوار ہُوا۔ ایک روز یُوں ہی الّن نے کھانے کے وقت مُرغ کا تذکرہ کیا، دوسرے ہی دن ہم کسی وجہ سے کلاس نہیں گئے اور کمرے پر مقیم تھے۔ میر صاحب علی الصبح حسبِ معمول تیّار ہو کر سائیکل پر سوار ہوئے اور یونیورسٹی کا رُخ کیا

لیکن چند منٹ بعد واپس آ گئے۔ کچھ اپنے کمرے سے اُٹھایا اور پھر چلے گئے۔ ہم سمجھے کوئی کاپی وغیرہ بھول گئے ہوں گے لیکن ذرا دیر میں ہی دیکھتے کیا ہیں کہ میر صاحب پھر پلٹے آ رہے ہیں اور زیرِ بغل تولیہ میں کچھ دبا ہوا ہے وہ بغیر کچھ بتائے سائیکل سے اُتر کر سیدھے غسلخانہ کی طرف گئے اب جو ہم اپنا تجسس دُور کرنے اس طرف پہنچے تو دیکھا میر صاحب مُرغ ذبح کرنے میں مصروف ہیں ہم نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا' بھئی یہ کیا، تو فرمایا "کل آلِ علی نے تذکرہ کیا تھا، میں آج نکلا تو اختر صاحب کے مکان کے پاس کچھ مال نظر آ گیا"، ہم نے کہا بھائی مگر یہ پکڑا کیسے، دن دہاڑے کسی نے دیکھا نہیں مُرغ نے بھی شور نہیں مچایا تو کہا" میں اسی مقصد سے تو ہوسٹل واپس آیا تھا۔ یہاں سے تولیہ بھگو کر لے گیا تھا بس ذرا تولیہ ڈالنا ہی مشکل ہے' باقی کام تو آپ بھی انجام دے سکتے ہیں"۔ اس مُرغ کو ہضم کرنے کے بعد میر صاحب نے یہ ناانصافی نہیں کی کہ صرف بے چارے اختر صاحب کو ہی مرغیوں سے محروم کرتے بلکہ آئندہ ذوقِ مُرغ خوری کی تکمیل کے لئے دوسرے ٹھکانوں سے بھی مال اُٹھا لایا کرتے۔ انھوں نے اس غیر معمولی کام میں کبھی بھی اپنے کسی دوست کو سنگت کی زحمت نہیں دی۔ اس طرح ہم بھی مُرغی چور بننے سے محفوظ رہے۔

علیگڑھ جہاں کھیل کود شوخی شرارت کے معاملے میں مشہور ہے وہاں تمام ہندوستان کی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں ڈائننگ ہال کے کھانے کے معیار و مقدار خصوصاً ذائقے کے بارے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا ہے۔ وَاللہ عَالم بالصّواب' کہتے ہیں سر سید علیہ الرحمتہ نے طلباء میں تزکیۂ نفس کی عادت پیدا کرنے کے لئے وہاں کے کھانے کا نسخہ خود تجویز فرمایا تھا اور اس تاکید کے ساتھ کہ دُنیا بدل جائے لیکن کھانے کا رنگ رُوپ اور ذائقہ ہرگز نہ بدلنے پائے۔ چنانچہ اُنیسویں صدی کے خالص انگریز کے دور کا یہ نسخہ آج بیسویں صدی میں آزادیٔ ہند کے پینتالیس سال

گزرنے کے بعد بھی جوں کا توں رائج اور مقبول ہے جبکہ اس سو سالہ مدّت میں نہ جانے کتنے باورچی مرکھپ گئے۔ کتنے ڈائننگ ہال منشی صاحبان جو ان تلوں میں سے بھی تیل نکال لیا کرتے اپنی شاندار توندوں اور پس انداز راشن کی بوریوں سمیت اصحابِ قبور میں شامل ہو چکے جہاں اپنی فاتحہ کا خود ہی انتظام بھی فرما رہے ہوں گے لیکن ڈائننگ ہال کا انتظام استمراری اٹل ہے اور اپنے معیار پر سختی سے قائم ہے۔ ہمارے علیگ بھائی کھانے کی ناقابلِ تغیّر لذّت اور حسنِ ظاہری کے بارے میں یقینِ کامل رکھتے ہیں اور اس بیان کی صداقت میں کسی کو ذرّہ برابر بھی شک نہیں ہو سکتا۔ یوں تو ہم اس موضوع پر تبصرہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتے تاہم ایمان کی پختگی کے لئے حال ہی میں ہم نے خود ہوسٹل کے ڈائننگ ہال جانے اور وہاں جا کر دخل در لقمہ جات دینے کی سعادت حاصل کی۔ فروری ۱۹۸۷ء میں جب قسمت نے یاوری کی اور ہمیں ۲۵ سال کے بعد علیگڑھ کی زیارت کی توفیق نصیب ہوئی تو وہاں پہنچ کر یونیورسٹی جامع مسجد میں جمعہ کی نماز اور 'بابائے اقوام' سرسیّد رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر حاضری کے بعد ہماری سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ ڈائننگ ہال میں بغیر کسی پیشگی اطلاع کے اپنے بچّوں مگر علیگ رشتے کی مناسبت سے بھائیوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا 'دیکھا' جائے تاکہ جواں سال بھائیوں کی خورد و نوش کی صلاحیّتوں کا کچھ جائزہ بھی لیا جا سکے۔ روٹی سالن کے متعلق علیگان نوخیز کے تبصرے سُنے جائیں۔ بیروں کے ہاتھ کی صفائی اور باورچیوں کے کھانا اُتارنے کی مہارت جانچی جائے اور میز پر پلیٹوں اور گلاسوں کی جھنکار سُنی جائے، یہاں کھانا دیکھا جانے سے ہماری مُراد کھانا کھائے جانے سے ہے کیونکہ علیگڑھ کے 'ڈائننگ ہال' کا کھانا 'کھانے' سے زیادہ دیکھنے سے تعلّق رکھتا ہے۔ بالخصوص سردی میں جب سطحِ سالن پر چکنائی کے جزیرے نمایاں جاتے ہیں اور روٹیوں میں روزن نمودار ہو جاتے ہیں تو یہ منظر قابلِ دید اور ناقابلِ فراموش ہو جاتا ہے۔ خدا بھلا کرے

برادرم نعمت علی خان کا جو سلیمان ہال کے حسرت موہانی ہوسٹل میں وارڈن تھے انھوں نے ہمارے دل کی بات تاڑلی یا پھر اسے تصرف سمجھئے کہ ہم نے بغیر لب کشائی مدعائے دل ان تک پہنچایا اور انھوں نے برائے تواضع نہیں بلکہ ازرہ فرمائش ڈائننگ ہال جاکر کھانا چکھنے کی دعوت دی۔ ہمارے زمانے یعنی ۱۹۴۸ء تک سلیمان ہال میں ڈائننگ ہال نہیں تھا اور صرف پانچ ہوسٹل تھے جہاں اب ماشاءاللہ اس خاندان میں دو کا اضافہ ہوگیا ہے اور اب سات ہوسٹل ہیں، اس کے علاوہ صاف ستھرا اور کشادہ ڈائننگ ہال بھی ہے جس میں جالیوں کی اوٹ کے باوجود مکھیوں کی آمدورفت پر کوئی پابندی نہیں ممکن ہے اس میں وضعداری کو دخل ہو اور سابقہ صورتِ حال کو برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہو۔ نئے ہوسٹل کشمیر ہوسٹل اور کویت ہوسٹل کے نام سے پکارے جاتے ہیں جہاں دو منزلہ عمارات میں اکثر لڑکے رہتے ہیں۔ ہم جب ڈائننگ ہال پہنچے تو دن کا تقریباً ایک بجا تھا اور ہال کی محفلِ طعام شباب پر تھی۔ نونہالانِ چمن اپنے غلبۂ بھوک کو ڈائننگ ہال کی قلیل خوراک سے زیر کرنے میں برسرپیکار تھے مستعد تجربہ کار بیرے سالن خواہوں کو دال سے مطمئن کر رہے تھے۔ دیرینہ روایات کے برعکس ڈائننگ ہال میں شیروانی تو دُور دُور نظر نہیں آئی اس لئے شیروں کے بچے بھوک کے باوجود غرّانے کی سکت بھی نہیں رکھتے تھے۔ ہماری خوش نصیبی سے سینئر فوڈ مانیٹر صاحب بھی اس وقت ہال میں موجود تھے۔ چنانچہ ان کی کمال سعادت مندی اور خصوصی توجہ سے ہمیں بھی میز پر مناسب جگہ مل گئی۔ یہی نہیں بلکہ بحیثیت سینئر علیگ ہمیں وی آئی پی کا درجہ دے دیا گیا۔ کھانے سے پیشتر غیر متوقع طور پر ہمیں یہاں اپنے بھانجے ببو (جو اب ڈاکٹر صہیب بن چکے ہیں) سے مل کر بے حد مسرت ہوئی وہ پٹنہ میں رہتا ہے اور علیگڑھ میڈیکل کالج کا طالب علم ہے گرچہ بھائی ڈاکٹر عابد رضا خاں بیدار کے لختِ جگر کو ہم نے اس سے پیشتر کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن اسے ڈائننگ ہال کی برکت

کہیئے جس کے طفیل اپنے اس پیارے بچّے سے چند لمحوں کے لئے ہی سہی مُلاقات تو ہوگئی۔ ہمارے ساتھ اس وقت عزیزم راشد غنی خان اور ماموں جان وَلی اللہ خان بھی تھے۔ راشد خان علیگڑھ کے دَوران قیام ہماری پارٹنر شپ کے اہم فرائض بڑی مُستعدی و عقیدت سے انجام دیتے رَہے اِس لئے اِس دعوتِ شیراز کے پُورے مُستحق تھے۔ ابھی ہم گردن گھما کر نوجوانوں کے ہاتھوں کھانے کی میز کا صَفایا ہوتے دیکھ رہے تھے کہ سینئر فوڈ صاحب بہ دَستِ نفیس نہایت عُمدہ سینکی ہُوئی گرما گرم دو تنوری روٹیاں لے آئے۔ علی گڑھ کے ڈائننگ ہال میں اس قدر پُر نُور روٹی دیکھ کر مَسرّت کے ساتھ ساتھ حیرت بھی ہوئی اس لئے ہم نے روٹی کے اس نکھار کی ترکیب دَریافت کی تو پتہ چلا کہ سینئر فوڈ صاحب بکوشش خصوصی بہت اچھّی کوالٹی کا آٹا منگواتے ہیں اور اپنی دلچسپی کی وَجہ سے روٹی کا معیار اور ڈائننگ ہال کا وقار بلند کرنے کے درپے ہیں۔ ہم نے کہا بھائی آپ کی محنت سے ڈائننگ ہال کا نام اُونچا ہوا تو کس پُکار کا جب روٹی سالن کی سو سالہ روایت کا ہی بھرم قائم نہ رہا تو اسلاف اور اخلاف میں شکمی تعلّق کیسے بَرقرار رہے گا جس ناتے آج کا طالب علم اس کا فخریہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اسی معیار کا محروم لذّت کھانا کھاتا ہے جو بانیٔ درسگاہ نے ۱۸۷۵ء میں ایجاد کیا تھا اور ہمارے تمام پیش رو بُزرگ تواتر سے یہی ذائقہ اَپناتے چلے آئے ہیں۔ روٹی کے بعد سالن کی پلیٹ نازل ہُوئی جس کی سطح، تارے سے سجی ہُوئی تھی لیکن جُوں ہی نوالہ مُنھ میں لیا وُہی چالیس سال پہلے کا مزہ یاد آگیا جنابِ سینئر فوڈ صاحب ہمارے تاثّرات جاننے کے لئے بے چین اور ہمارے چہرے کے اُتار چڑھاؤ اور تبسّم کی لہریں گننے میں مصروف تھے تا آنکہ ہم نے کھانے کے معیار کے استقلال اور ناقابلِ تبدیل ہونے کی بآواز بلند شہادت دی اور سچ پوچھئے تو ہمیں یہ جان کر بڑا اطمینان بلکہ قلبی سکون ہُوا

کہ ابھی تک ایک ایسی بھی شے باقی ہے جو امتدادِ زمانہ سے بھی زیر نہ ہو سکی جس کا مزہ تبدیل ہوا نہ شکل صورت ہی بدلی اور ہر خوبی اپنی جگہ جوں کی توں قائم ہے پس ثابت ہُوا کہ اس دارِ فانی میں ڈائننگ ہال کے طعام کو لذّتِ دوام حاصل ہے اس کو بجز کرامتِ سیّدی اور کہا بھی کیا جا سکتا ہے۔ روٹی سالن کے آئٹم پاس کرنے کے بعد دال کی مزاج پُرسی کو جی چاہا جو میز سے غیر حاضر تھی اس لئے بذریعہ آرڈر منگوائی گئی۔ سچ پوچھئے تو دال کا پتلا حال دیکھ کر یہ پہچاننا دشوار تھا کہ اس کی ذات پات کیا ہے چونکہ اگر کہیں بچاری دال ہو تو پہچانی بھی جائے وہاں تو ڈونگے میں نمک مرچ گھُلے پانی کا سیلاب تھا جس کی تہ میں کہیں دال کے چند دانے سزاً غرقاب کر دیئے گئے تھے۔ لامحالہ ایسی دال کا نوالہ لینے کے بعد بھی اس کے حسب نسب کا کوئی پتہ نہیں چل سکا۔ ہمیں جب یہ بتایا گیا کہ اَب یہ دال کھائی نہیں بلکہ پی جاتی ہے اور عند الطلب فراہم کی جاتی ہے تو پھر ہم نے بھی اس کا نام نشان جاننے کی زحمت نہ کی۔ بدقسمتی سے سوئٹ ڈش یعنی بزبان علیگڑھ ورائٹی جسے بیرے "بریٹی" کہا کرتے تھے کا دن نہیں تھا اِس لئے گلشنی یا شاہی ٹکڑوں سے نیاز حاصل کرنے کی حسرت ہی رہ گئی۔ ڈائننگ ہال صاف ستھرا تھا البتہ وہاں موجود مکھیوں کو اِتنی آزادی نہیں تھی کہ وہ سالن میں غوطہ زنی کی جسارت کریں۔ پینے کا پانی بھی صاف اور ٹھنڈا تھا اِس لئے بحیثیتِ مجموعی ڈائننگ ہال میں سوائے سیاہ شیروانی کے کوئی کمی نہیں تھی۔

ہم ٹھہرے دسترخوانِ سیّد کے قدیم نمک خوار اس لئے اس طرح نمک چکھنے کے بعد جب مانیٹر صاحب نے ہماری رائے جاننا چاہی تو ہم نے بھی نہایت رازداری سے بتلا دیا کہ روٹی اعلیٰ درجہ کی ہونے کے باوجود ہم اس کے نمبر اِس وجہ سے کاٹیں گے کہ ہمارے معیار پہ پوری نہیں یعنی اس نے اسلاف کے

قائم کردہ معیار سے تجاوز کرنے کی جرأت کی۔ اب رہا سالن کی خوش رنگی کا مسئلہ تو جہاں تک رنگ و نمو کا تعلق ہے اس میں خانساماں کے ہنر سے زیادہ سینئر فوڈ صاحب کی موجودگی کو دخل ہے اور چونکہ ہم بھی سینئر فوڈ رہ چکے ہیں اس لئے کھانا اُتروانے کی 'ٹرک' سے واقف ہیں۔ بہرحال باعث مسرت یہ حقیقت ہے کہ کھانے کا مزاج اور ذائقہ بعینہٖ وہی ہے۔ البتہ دال کو کچھ زیادہ ہی مبتلائے رقّت پایا۔ پچھلے زمانے میں مزہ خواہ کچھ نہ ہو دال پہچان لی جاتی تھی لیکن اَب تو ایکوا! (AQUA) ہی ایکوارہ گیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ دال خوروں کی کثرت سے دالوں کی یہ قلّت واقع ہوگئی ہو اور دال کی جگہ 'دال جَل' دینے کا رواج ہوگیا ہو تاہم بحیثیت مجموعی بغیر کسی کی سفارش کے ہم نے کھانے کو فرسٹ کلاس نمبر دے دیئے۔ اس بابت یہ جان کر بہت تعجّب ہُوا کہ گرانی کے اس دَور میں دونوں وقت کا یہ کھانا صرف ایک سو دس روپیہ ماہوار میں فراہم کیا جاتا ہے۔ برّ صغیر کیا دُنیا کے کسی ادارے میں اتنی کم قیمت پر یہ خوراک مُہیّا نہیں کی جاسکتی، لہٰذا پھر ماننا پڑتا ہے کہ یہ سب کچھ خواہ حسنِ انتظام ہو یا لذّتِ طعام سب 'بڑے بابا' کی دل کی گہرائی سے نکلی ہُوئی دُعاؤں کی مقبولیت کے اثرات ہیں جو ہوسٹلوں، ڈائننگ ہالوں کالج کے کلاسوں غرضیکہ یونیورسٹی کے ہر شعبہ اور ہر ہر گوشے میں جلوہ گر ہیں۔

سلسلہ تھا چونکہ علیگڑھ کے کھانے کا تو ہم اس کی خوشبو کے تصوّر میں ایسے مدہوش ہوئے کہ تجدید نمک کے تاثرات رقم کئے بغیر نہیں رہ سکے۔ تو بھائی میرے آپ علیگ ہیں تو بتانے کی ضرورت نہیں، اگر علیگ نہیں تو اِتنا جاننا دُشوار نہ ہوگا کہ ڈائننگ ہال سے ملی ہُوئی خوراک اور اس کی کرامات ظاہری و باطنی کے علاوہ معدہ کی جولانیوں پر قابو پانے کے لئے غذائی امداد کی ضرورت مسلسل لاحق رہتی اور شکم پُری کے لئے علیگڑھ کی مشہور زمانہ ٹری (بسکٹ) کیونیٹر کے

کثیر المقاصد مکھن، پیسٹریاں، جلیبیاں، حلوہ گاجر، برفی، نمک پارے، گزک، سنگھاڑے وغیرہ کا سہارا لیا جاتا۔ بعض کمروں میں تو نجی 'منی باورچی خانے' چالو کر لئے جاتے لیکن ماہ کے آخر میں جب سارے وسائل جواب دے جاتے تو پھر صرف چائے پر ہی گزارا موقوف ہوتا جس کے لئے ہر کمرے میں مٹی کے تیل کا اسٹوو یا الیکٹرک ہیٹر موجود رہتے لیکن باایں ہمہ انتظامات بسا اوقات کڑکی کے ایسے بھی دن آتے کہ شکر ہے تو چائے کی پتی نہیں اور سب کچھ ہے تو دودھ نہیں، مگر جوانی کے عشق میں تو طلب میں شدت بھی ہوتی اور وہ اندھی ہوتی ہے خصوصاً علیگڑھ والوں کو تو معدہ کی نابعداری کرنا ہی پڑتی ہے، چنانچہ موسم کی بدمزاجی اور وقت کی ناموزونیت کے باوجود آدھی رات کو برفیلی ہواؤں کے علی الرغم چائے پینے ڈیڑھ میل دور ریلوے اسٹیشن جایا جاتا! ایسی ہی ایک رات ہم طلبِ چائے کے لئے اسٹیشن پہنچے اور جیب کے وزن کی مناسبت سے بریلی لائن والے قدیمی علیگ پرور 'ٹی اسٹال' پر پہنچ گئے روایت کے بموجب ایک آنے والی چائے کی پیالی انڈیلی، کچھ نمکین بسکٹ ڈھکیلے، ہم اس بے وقت کی پیٹ پوجا میں مصروف تھے کہ میر صاحب راؤ کے ہمراہ 'ابھی آتا ہوں' کہہ کر اٹھ گئے اور ہم 'ٹی اسٹال' سے ہٹنے نہ پائے تھے کہ دونوں حضرات ہاتھوں میں جنگلی کبوتر تھامے واپس آ گئے۔ ہم نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا کہ بھائی یہ بے وقت 'پنکھا' کہاں مارا تو میر صاحب نے فرمایا کہ آپ کو بھی دلوائے دیتا ہوں، یہ کہہ کر ہاتھ کے کبوتر دوسروں کو تھما کر چل دیئے اور اسٹیشن کی ایک محراب کے پاس جا کر دوست کے کاندھے پر کھڑے ہو گئے اور نہایت صفائی اور خامشی سے محوِ خواب محراب نشیں کبوتروں کو اٹھا لائے۔ ہم نے کہا یہ کب سوجھی تو فرمایا "کچھ نہیں ابھی چائے پیتے پیتے نظر پڑ گئی تو سوچا یہ 'ٹرن' کیوں نہ حاصل کی جائے۔

کڑکی کے ایسے ہی ایام میں ایک رات سخت سردی پڑ رہی تھی کچھ مہاوٹ کا سلسلہ بھی جاری تھا اور خاصی بوندا باندی ہو رہی تھی کہ یک دم ریاض مرحوم پُرطلبِ چائے کا دورہ پڑ گیا۔ ریاض کا جب یہ عالم دیکھا تو ہر شخص میں چائے کی چاہت جاگ اُٹھی۔ اب چائے سازی کا سامان کھکوڑا تو اتفاق سے علاوہ مٹی کے تیل کے سب کچھ موجود پایا۔ بجلی کا چولھا پہلے سے تار جلائے پڑا تھا۔ رات آدھی گزر گئی تھی کہ دکانیں کبھی کی بند ہو چکی تھیں اور اس وقت پڑوسیوں کو بھی پریشان کرنا مناسب نہ تھا۔ ان ناموافق حالات میں ہم سب کا شوق بھی موسم کی مانند سرد پڑنے لگا کہ میر صاحب نے فوراً اپنی سائیکل اُٹھائی، ایک والنٹیر کو اسٹوو پکڑا کر ساتھ بٹھا لا، اور چل دیئے۔ ایسے موقع پر میر صاحب کو ٹوکنا بہت ناگوار معلوم ہوتا تھا بالکل اسی طرح جیسے کسی مچھلی کے شوقین سے شکار پر جاتے وقت کوئی پوچھ لے کہ کہاں جا رہے ہو؟ اور وہ بے حد بُرا مانتا ہے بلکہ بعض ٹوٹکا فہم تو واپس لوٹ پڑتا ہے چنانچہ میر صاحب اس نیم طوفان زدہ موسم میں برق رفتاری سے سائیکل پر یہ جا وہ جا ہوئے۔ سچی بات ہے کہ گرچہ میر صاحب کو اس طرح جانے سے تو ہم نے بھی نہیں روکا لیکن ہمیں اس 'تیل جوئی' کی مہم میں کامیابی کی کوئی اُمید نہ تھی۔ ایسی صورتِ حال میں کتاب میں کس کا دل لگ سکتا تھا۔ اس لئے ساعت انتظار گزارنے کے لئے تاش لے کر بیٹھ گئے۔ ہم سب لوگوں کا خیال تھا کہ میر صاحب حصولِ تیل کے لئے کم از کم ریلوے اسٹیشن تک تو ضرور گئے ہوں گے۔ اس لئے ایک گھنٹہ سے پہلے تو لوٹنے سے رہے لیکن میر صاحب نے آدھے گھنٹے کے اندر ہی واپس ہو کر سب کو خوش گوار حیرت میں ڈال دیا۔ میر صاحب اور اسٹوو بردار اشفاق خان گرچہ بھیگ کر چوہا بن چکے تھے، اُوپر سے مارے سردی کے بُرا حال تھا لیکن 'تیل یابی' کی خوشی سے ان کے چہروں پر شیوخِ عرب کی سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ جب اس مہم کی تفصیل طلب کی گئی تو میر صاحب نے حسبِ معمول

نہایت سادگی سے بتلایا" بالکل دُور جانا نہیں پڑا، راستے میں ہی کام ہوگیا"۔
ہم نے کہا وہ کیسے، کہا بس، دودہ پور، تک گئے تھے۔ دودہ پُور اس زمانے میں محض ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جہاں لالٹین دار پولیس چوکی تھی لیکن آزادی نے اس علاقے کے ایسے دن پھیرے کہ اَب وہ یونیورسٹی کا بہت مصروف کمرشل ایریا اور بازار بن گیا ہے۔
اس زمانے میں، دودہ پور، تک بجلی کی رسائی نہیں ہوئی تھی۔ چُنانچہ اسٹریٹ لائٹ کا اِنتظام بجائے بجلی کے لکڑی کے کھمبوں پر مٹّی کے تیل کے لیمپ جلاکر کیا جاتا تھا چنانچہ میر صاحب نے کہا" بس اس وقت چار پانچ کھمبوں سے ہی تیل لے لیا ہے تاکہ کام چل جائے"۔ ویسے نہ جانے کیوں میر صاحب نے کسرِ نفسی سے کام لیا چونکہ اس عُجلت کے باوجود میر صاحب اسٹوو تو پورا تیل سے بھر لائے تھے۔ اس قدر مَشقّت سے تیّار کی جانے والی چائے کا مزہ کیسے فراموش کیا جاسکتا ہے اِسلئے اَب بھی دودہ پور کے نام سے وہ چائے یاد آجاتی ہے۔

ایسے واقعات معمولی سہی مگر روزمرّہ کی اِن چھوٹی موٹی 'چمتکاروں' سے میر صاحب کی ذہین منصُوبہ بندی عملی صَلاحیّت خصوصاً عُقاب نگاہی کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے ہوسکتا ہے اس طرح کبوتر اور مُرغ مسروقہ دوسرے بھائی لوگوں نے وقتاً فوقتاً داخل درشکم کیے ہوں، چونکہ اللہ معاف کرے علیگڑھ کے ایّامِ جوانی میں کھانے پینے کے لوازمات کی فراہمی کا شمار چوری میں نہیں کیا جاتا تھا بلکہ اس کو ایک قسم کی مُہم جوئی یا' ایکٹویٹی' ہی سمجھا جاتا لیکن اس سَرد بھیگی رات میں اسٹوو کے لئے میونسپلٹی کی لالٹین سے تیل حاصل کرنے کا تصوّر میر صاحب کی ندرتِ خیال کا شاہکار ہے اور یقیناً سوچ کے اس میدان میں ان کا ہم پلّہ ملنا دشوار ہے۔

علیگڑھ میں سنگھاڑے بڑے میٹھے اور خوشبودار اور خاصے ارزاں ہُوا کرتے تھے۔ اَب خدا معلوم اس فصل کا کیا حال ہے۔ جب تالاب ہی پٹ گئے دروں

مکان اُگ آئے تو سنگھاڑے کیا پنپ سکتے ہیں۔ یہی حال گنّے کی گنڈیریوں کا تھا جو فارم کے پونڈوں کی کہی جاتی تھیں یہ گنڈیریاں لبہائے محبوب سے زیادہ نرم و نازک رسیلی اور میٹھی ہوتی تھیں لیکن دراصل شکار کا جو مزہ شکار کرنے میں ہے یوں ہی گھر بیٹھے شکار کھانے میں کہاں ؎

جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا　　لہو گرم رکھنے کا ہے اِک بہانہ

چنانچہ دو چار آنے کے خریدے ہوئے سنگھاڑوں اور گنّوں میں وہ لذّت و لطافت مفقود تھی جو خود توڑ کر کھانے میں آتی تھی۔ ایم ایم ہوسٹل سے تھوڑی ہی دُور وسیع میدان میں خاصے بڑے دو تالاب تھے اور فصل کے ایّام میں دونوں سنگھاڑوں سے بھرے رہتے تھے جس کی وجہ سے سنگھاڑے خرید کر کھانے میں لذّت جاتی رہی تھی۔ میر صاحب کی توجّہ اس فصلی آئیٹم کی طرف مبذول کرائی گئی تو وہ ٹھیک ہے کہہ کر خاموش ہو گئے۔ ہم نے کہا ٹھیک کیسے ہے وہاں تو کنارے پر لاٹھی بردار چوکیدار موجود ہوتا ہے جو بغیر دیکھے ہی آوازیں لگاتا رہتا ہے۔ میر صاحب نے کہا یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں، رات میں دو بجے کے بعد شب خون مارا جائے گا۔ چنانچہ میر صاحب نے وقتِ مقررہ پر روانگی سے قبل یہ ترکیب نکالی۔ "میں چوکیدار کے قریب جا کر ہی کچھ سنگھاڑے توڑنے کی کوشش کروں گا تم لوگ تالاب کے دُور والے کنارے پر خاموشی سے بیٹھ جانا اور جب چوکیدار میرا تعاقب کرے تب تم اپنا کام شروع کر دینا" چنانچہ میر صاحب اور ایک ساتھی نے چوکیدار کے نزدیک جا کر کارروائی کا اس وقت افتتاح کیا جب ہم لوگ دور والے کنارے پر پہنچ چکے تھے۔ چوکیدار جو سفید گرم کمبل نما چادر اوڑھے لیٹا تھا پانی میں شڑپ شڑپ سن کر اُٹھ بیٹھا اور لاٹھی لے کر للکارتا ہُوا میر صاحب کے پیچھے دوڑ پڑا۔ میر صاحب نے میدان کا رُخ کیا اور بھاگنے کی رفتار کو اس طرح متعین کیا کہ تھوڑی تھوڑی دیر میں چوکیدار ان کے بالکل قریب پہنچ جاتا

اور سمجھتا کہ بس پکڑ لیا۔ اس موہوم اُمید گرفتاری نے چوکیدار کو دوڑنے پر مجبور رکھا اور میر صاحب اس کو خوب ریٹاتے رہے۔ جب وہ یہ سمجھ کر کہ چور کو بھگا دیا ہے تالاب کی طرف لوٹتا تو میر صاحب پھر واپس ہو جاتے۔ الغرض ادھر چوکیدار میر صاحب کے ساتھ چور پکڑنے کا کھیل کھیل رہا تھا اُدھر ہم لوگ نہایت تیزی سے کچے پکے سنگھاڑوں سے چادر بھر رہے تھے۔ بالآخر چوکیدار کی نگاہ رات کی تاریکی کی وجہ سے بہت دیر بعد ہماری جانب گئی تب کہیں جا کر میر صاحب کا داؤ اس پر کھلا، لیکن اس وقت تک کھیل ختم ہو چکا تھا اور ہم سنگھاڑوں کی اچھی کھیپ لئے کامیابی سے ہوسٹل کی جانب لوٹ رہے تھے۔

میر صاحب ایگریکلچر کے طالب علم ہونے کی وجہ سے فارم کے گنّوں کا ذائقہ ہم سے زیادہ جانتے تھے اِس لئے وہاں کی تازہ فصل دیکھ کر ان سے بھلا کہاں صبر ہوتا چنانچہ فارم پر یورش کرنے کا پروگرام وضع کیا۔ اب چونکہ فارم سرکاری تھا اِس لئے بدیسی حکومت سے زیادہ اس پر ہمارا حق تھا چنانچہ شروع رات میں فارم پر پہنچ گئے۔ جنگل میں شام بھی آدھی رات سے زیادہ مہیب تاریک اور خاموش ہوتی ہے اِس لئے میر صاحب نے گنّے کاٹنے کا ذمہ خود لیا اور ایک اسسٹنٹ کو ساتھ لگایا۔ بقیہ لوگوں کو مال اُٹھانے پر مامور کیا۔ سب سے پہلا مسئلہ تو خاردار تار پھاند کر حدودِ فارم میں داخلے کا تھا۔ سو وہ میر صاحب دن میں کلاس سے واپس ہوتے ہوئے حل کر آئے تھے یعنی تار کاٹ کر راستہ بنا لیا تھا تاہم رات میں اس تنگ نائے کا تلاش کرنا مشکل تھا۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے نئے راستے کے قریب میر صاحب ایک اُونچا سا گنّا کاٹ کر کھڑا کر آئے تھے۔ میر صاحب نے پلان سمجھایا کہ پہلے وہ ایک کارکن کے ساتھ اندر جا کر کٹائی کریں گے اور کام کی تکمیل کے بعد ٹارچ سے سگنل دیں گے جس کے بعد ہم لوگ بھی اندر پہنچ جائیں گے

سَردی خاصی تھی، ہَوا بھی سَر اُٹھائے ہُوئے تھی۔ اِتّفاق سے نہر کے کنارے کُچھ آگ سی جلتی نظر آئی۔ ہم لوگوں نے اسے غنیمت جانا اور قریب جاکر ہاتھ تاپنے لگے کُچھ آوازیں تو میر صاحب کی گنّا کٹائی کی آتی رہیں لیکن بَعد میں کھانسی کے ساتھ "دیکھ لیا ہے" کی دل ہلا دینے والی صَدا بلند ہُوئی۔ پہلی آواز پر کان کھڑے ہُوئے لیکن بعد میں دوسری آواز ذرا زیادہ قریب اور زور سے آئی معلوم ہُوا کہ فارم میں سے کوئی مُنھ نکال کر بول رہا ہے اس مرتبہ جو آواز بلند ہُوئی اس نے تو چھکّے چھُڑا دیئے۔ "ارے یہ آدھی رات کو چتا پر کون بیٹھا ہے" چتا کا نام سُننا تھا کہ ریاض مرحوم کی تو گھگّی بندھ گئی اور آؤ دیکھا نہ تاؤ وہ نہر کے اندر کود پڑے یا گر گئے لیکن نہر میں پانی برائے نام تھا جس سے ریاض کی کیچڑ پوشی خاصی ہوگئی وَہاں سے بدقّت انھیں کھینچا گیا اور اس عالم بدحواسی میں سب مخالف سمت میں بھاگ پڑے۔ سچّی بات تو یہ ہے کہ چوکیدار سے تو ڈر خاک نہیں لگا تھا مگر 'چتا' کا نام سُن کر سب ہی حواس باختہ ہوگئے۔ الغرض ہمیں کُچھ پتہ نہیں کہ میر صاحب پہ کیا گُزری۔ کئی میل کا چکّر لگا کر ہانپتے کانپتے ہوسٹل پہنچے تو میر صاحب کو وَہاں موجود پایا، جو سخت بَرہم تھے اور زیادہ غُصّہ ان کو ریاض پر آرہا تھا۔ ہم سے کہا: "خان بھوت اس کا کیا بگاڑتا وہ تو اسے دیکھ کر خُود دبک کر آگ میں ہی بیٹھ گیا ہوگا"۔ مگر ریاض کا عالم یہ تھا کہ لحاف اوڑھنے کے بعد بھی تھر تھر اسٹ جاری تھی۔ اپنی عادت کے بموجب میر صاحب وہاں سے خالی ہاتھ نہیں پلٹے بلکہ اس وَقت تک جو شکار ہاتھ آیا تھا وہ بطور 'سوونیئر' لیتے آئے تھے۔ اس نامساعد حالت میں جب کہ سَب کے اعصاب پر آسیب طاری ہوچکا تھا کچھ نہ ہونے سے چھ سات گنّے ہی بہتر تھے۔

جیسا کہ بیان کیا میر صاحب اس گورنمنٹ فارم کو اپنی آبائی ملکیت سمجھتے تھے۔ چُنانچہ ہر نئی فصل ان کے لئے مُژدۂ نو روزلاتی اور وہ نہایت خلوص سے

موسم بہار میں مالکانہ حقوق وصول کرنے کا نیوتا دیتے۔ اس مرتبہ میر صاحب نے 'گریپ فروٹ' کا ذکر اس پُرشوق انداز سے کیا کہ سُننے والوں کے مُنھ میں پانی آگیا۔ اس زمانے تک یہ پھل عام طور سے بازار میں دستیاب نہیں تھا جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ گریپ فروٹ کے صحیح قدرشناس انگریز حکام اعلیٰ تھے، جن کا زیادہ تر قیام بڑے شہروں میں ہوتا تھا اس لئے ان کے پسندیدہ پھل کو بھی بڑے ہی ٹھکانے زیادہ پسند تھے جس کی وجہ سے ہر شخص اس کے نام اور خواص دونوں سے واقف نہ تھا چنانچہ گریپ فروٹ کا جب یہ 'مرتبہ' علم میں آیا تو اس کی قدر و منزلت اور بھی بڑھ گئی۔ اس نئی فصل کے اُتارنے کے لئے حکمتِ عملی بھی نئی وضع کی گئی۔ چھاپہ مارنے کے اوقات تبدیل کر دیئے گئے اور ہدایات جاری کرتے ہوئے میر صاحب نے کہا "میں مغرب سے ایک گھنٹہ قبل فارم پر پہنچ جاؤں گا اور متعینہ عملے کو اپنے ساتھ مشغول رکھوں گا، آپ لوگ باغ میں جنوبی سمت سے داخل ہو کر غروب آفتاب سے پیشتر ہی فروٹس اُتار لیں گے"۔ ہم نے کہا "میر صاحب اللہ کو مانو کیا دن دہاڑے یہ سب کچھ کرنا پڑے گا" تو میر صاحب نے نہایت قائدانہ اعتماد سے اعلان کیا کہ "یہ ذمہ داری میری ہے"، چنانچہ حسبِ پروگرام فارم پر دھاوا بول دیا گیا اور ہم نے بڑے پیار سے چُن چُن کر گریپ فروٹ توڑ کر چادر میں بھر لئے اور مغرب کی اذان ہوتے ہوتے ہی واپس ہو لئے۔ ہمارے ہوسٹل پہنچتے خاصا اندھیرا ہو چکا تھا۔ میر صاحب اس کے بھی کچھ دیر بعد آئے۔ سب نے آپریشن کی اتنی شاندار کامیابی پر خوشی کا اظہار کیا۔ مگر اس کے ساتھ ہی قائدِ مشن سے پوچھا کہ "آخر یہ چوکیدار کو کیا پلا دیا تھا" کہا "کچھ نہیں، بھائی وہ لوگ بہت روز سے مُرغابی مُرغابی کی رَٹ لگائے ہوئے تھے میں نے دوپہر نہر سے جا کر چار پانچ چڑیاں مار لیں اور وہ لے کر پانچ بجے ان کے پاس پہنچا تو مارے خوشی کے ان کا بُرا حال تھا اور مُصر تھے کہ میں رات کا کھانا

ان کے ساتھ کھاؤں"۔ یہاں بتاتے چلیں کہ میر صاحب نہ صرف ماہر شکاری تھے بلکہ بندوق کے لائسنس ہولڈر تھے، اور سب سے بڑھ کر شکار بنانے میں خصوصی مہارت رکھتے تھے۔ خدا خوش رکھے اس طرح میر صاحب کی مہم جوئی کی بدولت ہم لوگ بھی 'گریپ فروٹ صاحب' سے متعارف ہو گئے ورنہ اس سے قبل اس فصل کے دوسرے افراد چکوترا، مہتابی، انھنی، نارنگی، سنترا وغیرہ سے ہی ربط ضبط تھا۔

شوقیہ وارداتیں کرنے کے علاوہ کبھی کبھار میر صاحب تعلقات نبھانے کے لئے بھی اپنے فن کا مظاہرہ کر دیا کرتے۔ اس چار پانچ سال کے عرصہ میں میر صاحب کو نہ تو کبھی ندامتِ شکست اُٹھانے کا اتفاق ہُوا اور نہ ہی کبھی مال بدست دُھرے گئے، ان کی کارگزاریوں کے چرچے البتہ حلقۂ احباب سے بھی باہر پھیل گئے تھے اور یار دوستوں میں میر صاحب کی تواضع تو خوب مشہور ہو گئی تھی۔ لہٰذا بھائی لوگ میر صاحب سے اپنے چھوٹے موٹے کیس برائے صلاح و مشورہ رجوع کرتے چنانچہ ایسا ہی ایک مسئلہ آفتاب الدین خان کو درپیش ہُوا۔ علیگڑھ میں سینئر جونیئر کا بہت لحاظ کیا جاتا تھا اب معلوم نہیں انقلابِ زمانہ کے بعد یہ تعلق باہمی کس نہج پر ہے اور کیا عجب ہے جو اُلٹی گنگا بہنے لگی ہو اور سینئر صاحبان جونیئر بنا دیئے گئے ہوں، تو اس دور میں کبھی کسی جونیئر سے کوئی نادانستہ فعل سرزد ہو جاتا تب بھی وہ قابلِ گرفت و فہمائش سمجھا جاتا۔ جان بوجھ کر تو کسی جونیئر کی مجال نہ تھی کہ کسی بیہودگی کا ارتکاب کرے۔ ہُوا یوں کہ آفتاب کے پڑوس میں اختر خاں نامی ایک نوجوان رہنے لگے جو ڈپلوما انجینئرنگ کے طالب علم تھے اور بنیادی طور پر میٹرک پاس تھے۔ آفتاب الدین خان انٹر پاس تھے اور ڈگری کے طالبعلم تھے۔ اب ان اختر خان نے زیادتی یہ کی کہ اپنے کمرے پر ایک تختی لگائی جس میں اپنے نام کے آگے آر ڈی ایس (لندن)، آئی ڈی (بامب) لکھا ہُوا تھا۔ اس تختی کا نتیجہ یہ ہُوا کہ اہلِ محلّہ اختر خان کو یا تو

انتہائی اونچے درجہ کا طالبِ علم یا لکچرر کا درجہ دینے لگے اس پر اختر خان کی شیخی اور 'دون' کی لینے کی عادت نے ان کی شان میں اور چار چاند لگا دیئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آفتاب الدین خان خاصے سینئر ہوتے ہوئے اختر خان کے سامنے جونیئر دکھائی دینے لگے، یہی نہیں بلکہ آس پاس کے دوسرے سینئر صاحبان کو آر ڈی ایس صاحب کی یہ جسارت کھلنے لگی۔ اپنی اس دلی پریشانی کا ذکر جب آفتاب الدین خان نے میر صاحب سے کیا تو میر صاحب نے ان کی پوری تشفی کی اور کہا "صرف مجھے موقع اور محل دکھاؤ باقی سب ٹھیک ہو جائے گا"۔ سہ پہر کو میر صاحب معائنہ مشن کا کہہ کر گئے مگر دوسرے دن علی الصبح اختر خان گھبرائے ہوئے آفتاب خان کے پاس گئے اور کہا "پارٹنر نہ جانے کون رات یہاں سے میری تختی اکھاڑ کر لے گیا۔ آفتاب خان نے بھولا منہ بنا کر کہا چلو دیکھیں، جب پہنچے تو اختر خان چیخ اٹھے "ارے یار میری نئی چق اور پردہ بھی تو غائب ہے اور تو اور یہ میری سائیکل کے دونوں پہیوں میں بھی پنکچر ہے"۔ آفتاب خان میر صاحب کی اس 'ہرن رفتار' کارروائی پر خود بھی ششدر رہ گئے۔ پھر آنسو پونچھنے کے لئے دو تین روز بعد اختر خان کو میر صاحب کے پاس لے کر آئے۔ میر صاحب نے روایتی افسوس کا اظہار کیا۔ تختی کی بازیابی سے مطلق معذوری ظاہر کی۔ چق کے بارے میں کہا کہ بھائی یہ کمبخت نئی چق تو چھوڑتے ہی نہیں۔ میں نے بھی کل ہی ڈالی ہے، اب آر ڈی ایس لندن بچارے کیسے پہچان سکتے تھے کہ میر صاحب نے کل جو چق ڈالی ہے وہ ان کی ہی ہے اس لئے پردہ ملنے کی امید اور یہ اطمینان لئے کہ آئندہ ان کی نگہداشت آفتاب خان کریں گے خوشی خوشی گھر واپس لوٹ گئے اس طرح میر صاحب کی معمولی ضرب سے سینئروں کا کھویا ہوا وقار واپس مل گیا۔

اس میں کوئی مبالغہ نہیں اگر یہ کہا جائے کہ کاغذ کم پڑ جائے، روشنائی

ختم ہو جائے، مگر میر صاحب کی یہ سچّی کہانیاں ختم نہ ہو سکیں گی۔ تاہم اس خیال سے کہ کم از کم یہ اَن سُنے واقعات تا حدِ امکان کاغذ پر منتقل و محفوظ کر دیئے جائیں تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ علیگڑھ کے "گمنام" لوگوں میں بھی کیسی کیسی باکمال ہستیاں گزری ہیں جن کے ذکر کرتے ہی لوگوں میں شوقِ شرارت جوش مارنے لگتا ہے اور کبھی کی بیتی عمر یا واپس لوٹتی معلوم ہوتی ہے ان واقعات کے تصوّر سے دل میں گُدگُدی ہونے لگتی ہے اور ایسا محسُوس ہوتا ہے کہ ہم گھُپ اندھیری رات میں گنّوں کی تلاش میں 'چِتا' پر بیٹھے ہیں یا سنگھاڑے والے تالاب میں گھٹنوں گھٹنوں ٹھنڈے پانی میں کھڑے ہیں یہ شوخیاں اور شرارتیں ایسا ٹانک ہیں جو آج بھی دل میں جوانی کی اُمنگ بھر دیتی ہیں عالمِ کیف و مستی طاری کر دیتی ہیں۔

سالانہ امتحانوں کے خاتمے کے بعد بھی بعض 'بورڈنگ پسند' لڑکے یونیورسٹی چھوڑنے کو آمادہ نہیں ہوتے تھے اور اسی وجہ سے کلاس سے سرکنے سے گریزاں رہتے، غالباً ایسے 'چپکو' لڑکوں سے یونیورسٹی کو نجات دینے کے لئے عقلمندوں نے 'سپلیمنٹری' اِمتحان کا نظام ایجاد کیا تاکہ ان مستقل ناکاموں کو 'سپلیمنٹری دھکّا' لگا کر اگلی جماعت میں پہنچا دیا جائے۔ یہ نسخہ کسی حد تک کامیاب رہا جس کی وجہ سے بڑے سے بڑے 'گُل محمّد'، خواص کے حضرات بھی کلاس پھاندنے پر مجبور ہو گئے۔ ہمارے میر صاحب کو ایک سال یہی عارضہ لاحق ہُوا جس کی وجہ سے علیگڑھ کے گرما گرم مئی جُون کا ناقابلِ فراموش مزہ چکھنا پڑا۔ گرمیاں تو ہر جگہ آتی ہیں، ہر سال بڑی شدّومد سے آتی ہیں اور اس کی زیادتیوں کے شکوے بھی ہمیشہ سے سُنتے چلے آ رہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ علیگڑھ کی گرمی آدمی کو مٹری (بسکٹ) کی طرح سینک کر رکھ دیتی ہے۔ سُورج نکلتے ہی 'لُو' کی ابتدا ہو جاتی ہے جو بسا اوقات رات کو بارہ بجے تک یکساں زور شور سے چلتی رہتی ہے۔ دن میں

زرد دھول آسمان پر ایسی چڑھتی ہے کہ عمارات و اشجار شعلہ بار محسوس ہوتے ہیں پھر ایّام تعطیلات میں ہر طرف بیکراں سنّاٹا ایک ہُو کا سا عالم ہوتا ہے بس گنتی کے 'سپلیمنٹری کے مُبتلا' ایک دو کمروں کو آباد کئے رہتے ہیں۔ اس لئے ایّام گرما خصوصاً چھٹیوں کے دوران یونیورسٹی ایریا کا ماحول ہی مہیب و خوفناک ہوتا ہے۔ میر صاحب بھی یہ بے کیف ایّام چند اور مجبوروں کے ساتھ گزار رہے تھے۔ اکتاہٹ کے اس ماحول میں پڑھنے میں دل کیسے لگ سکتا ہے اس لئے سپلیمنٹری والوں کی ساری اُمّیدیں 'گیس پیپر' سے وابستہ ہوتی ہیں اور میر صاحب اس میں اپنا گیس چلا کر مزید پچاس فیصد کمی کر لیتے تھے۔ اس طرح وقت بہت اور پڑھنا کم پڑتا۔ چنانچہ ہر شام مغرب سے قبل میر صاحب دماغ تازہ کرنے 'نقوی پارک' کا رُخ کرتے اس زمانے میں اس پارک کی عمر تین چار سال کی ہوگی۔ پارک کا نام گرچہ یو پی کے گورنر 'ہیلٹ' کے نام پر رکھا گیا تھا لیکن کیونکہ اس کی تمام منصوبہ بندی تعمیر و تزئین اے ٹی نقوی صاحب آئی سی ایس کلکٹر علیگڑھ کی ذاتی دلچسپی اور توجّہ کی مرہونِ منّت تھی۔ اِس لئے پارک از خود لیکن بجا طور سے 'نقوی پارک' مشہور ہو گیا۔ گرچہ تقسیم ہند کے بعد اس کو ناموں کی مختلف پوشاکیں پہنائی گئیں، مثلاً جواہر پارک وغیرہ مگر علیگڑھ میں ابھی تک نقوی پارک پکارنے والوں کی خاصی تعداد پائی جاتی ہے۔ میر صاحب کی چہل قدمی کے ساتھی قیصر، حمید زماں مرحوم وغیرہ تھے اس پارک کے شمال مشرقی کونے میں خاردار تار لگا کر ایک چھوٹا چڑیا گھر بھی مہیّا کر دیا گیا تھا جس میں پرندوں کے علاوہ ہرن، نیل گائے، چکارے، چیتل وغیرہ پالے گئے تھے۔ ایک شام چلتے چلتے قیصر نے میر صاحب کو چھیڑ دیا اور کہا اگر چیتل کا پٹھا پار کرو تو سپلیمنٹری پاس کرانا ہمارا ذمّہ۔ میر صاحب پہلے تو اسے مذاق سمجھ کر ٹالتے رہے لیکن جب ہر شام ٹہلنے کے دوران میر صاحب کو چیتل

کے ٹھوکے لگائے جاتے رہے تو انھوں نے بھی صبر کو بالائے طاق رکھ دیا، مگر اس پروجیکٹ کی منصوبہ بندی اور تکمیل کے لئے دس روز کی مہلت مانگی، چنانچہ دوسرے روز ہی میر صاحب چیتل کے لئے چارہ لے کر پارک پہنچ گئے اور اُسے پچکار کر نزدیک بلایا اور بڑے پیار سے کھلا دیا۔ یہ عمل چارہ گری چند روز بڑی پابندی سے جاری رہا جس کی وجہ سے چیتل کا پٹھا میر صاحب کو دیکھ کر ہی تاروں کے پاس آجاتا۔ الغرض ساتویں ہی روز ٹھیک دوپہر کے وقت جب گرمی کی شدت اور لُو کے تھپیڑوں کی وجہ سے دُور دُور تک کوئی آدمی نہ آدم زاد نظر آرہا تھا بلکہ پرندے بھی دبکے دبکائے پیڑوں میں پناہ گیر تھے، میر صاحب قیصر کو ساتھ لے کر نقوی پارک پہنچے حسبِ معمول چیتل کو چمکارا اور جب وہ قریب آگیا تو اسے پکڑ کر تاروں سے باہر نکال لیا اور بوری میں باندھ کر پیچھے سائیکل سے باندھ دیا لیکن بجائے ہوسٹل جانے کے نہر کا رُخ کیا جو کئی میل دُور تھی، نہر پر جاکر چیتل کو ذبح کیا۔ گوشت بنایا۔ ہاتھ پاؤں اور چاقو دھوئے اور تین بجے تک واپس ہوسٹل پہنچ کر پلنگ پر دراز ہو گئے جس کے بعد شام کا سارا وقت بجائے امتحان کی تیاری کے، ڈنر کی پکائی میں گزرا۔ بعد میں کسی دوست نے اس فعل کو ظالمانہ بتایا تو میر صاحب نے کہا اس میں میرا بالکل قصور نہیں یہ سب کچھ ان کا یعنی قیصر کا کیا کرایا ہے۔ مجھے اس حد تک تنگ کیا کہ لاج نبھانا پڑی مگر قیصر کے وعدے کے باوجود میر صاحب درجہ عبور نہ کر سکے۔ ان کا خود بھی یہ گمان ہے کہ 'چیتل' کی بددعا لگ گئی۔

میر صاحب کو اللہ نے بڑی سمجھ بوجھ دی تھی وہ ہمارے ان واحد دوستوں میں تھے جن کا پوسٹ آفس سیونگ اکاؤنٹ تھا گرچہ وہ اسے انتہائی اہم راز کی طرح چھپائے رہتے لیکن ڈاکخانے پر یار لوگوں نے اکثر میر صاحب کو رقم کا حساب کتاب کرتے دیکھ لیا تھا اس لئے ہم سب لوگ اس سے آشنا تھے۔ سچ پوچھئے تو

میر صاحب کی یہ پردہ داری کسی حد تک بجا بلکہ جائز تھی۔ علیگڑھ میں شاید ہی کوئی ایسا بدنصیب لڑکا ہوتا ہو جس کا مہینہ ختم ہونے سے پہلے جیب خرچ ختم نہ ہو جاتا۔ پھر اس کے بعد خوانچے والوں سے، دکانداروں سے، دھوبی سے، نائی سے سب سے حساب چلتا تھا۔ پھر بھی کبھی اُفتاد پڑ جاتی تو آپس میں بھی قرض لے لیا جاتا۔ اب ایسے ماحول میں اگر میر صاحب کے اکاؤنٹ کی خبر عام ہو جاتی تو میر صاحب اور ان کے اکاؤنٹ کی خیر کیسے ہو سکتی تھی، اپنی تمام دلکش شخصیت کے باوجود میر صاحب بنیادی طور پر خُرد رس واقع ہوئے ہیں۔ وہ جتنی جی داری واردا تیں کرنے میں دکھلاتے اس سے زیادہ کمزوری روپیہ پیسہ خرچ کرنے کے معاملات میں برتتے۔ ہوسٹل میں خوانچوں والوں سے چٹورپن کرنا ہو۔ پکچر دیکھنے شہر جانا ہو یا چائے وغیرہ پینے کیفے ڈی جمیل میں بیٹھنا ہو اس نوع کے ہر موقع پر میر صاحب امامت سے اغماض برت کر مقتدی بننا پسند کرتے۔ علیگڑھ کی زندگی میں کیفے جانا بڑا محبوب مشغلہ ہوتا تھا جو دراصل ایک ضرورت یا مجبوری بھی تھی لہٰذا روزانہ کوئی نہ کوئی ساتھی کیفے کی دعوتِ مستانہ دیا کرتا جس پر سب لوگ صدق دل سے لبیک کہہ کر بلا تامل و تاخیر شیروانیاں ڈال کر ساتھ ہو لیتے۔ میر صاحب اپنے مالی حالات دوسروں سے بہتر ہوتے ہوئے بھی کیفے لے جانا بدعت تصوّر کرتے تھے۔ اس لئے ان کو پھانسنا بڑا دقت طلب تھا۔ البتہ ان کا نہایت پسندیدہ عمل یہ ہوتا کہ جب چائے کا بل میزبان دوست ادا کر دیتا تو میر صاحب جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے شمشاد یا اعجاز پان فروش کی دکان کی طرف لپکتے اور ہم لوگوں کے پہنچنے سے پیشتر پان لگوا لیتے اور پھر بڑی محبت سے سب کی تواضع فرماتے۔ وہ پان والے کو دو تین آنے ادا کرنے میں بڑی عجلت سے کام لیتے تاکہ کوئی اور یہ ثواب حاصل نہ کر لے۔ اُس زمانے میں دو پیسے میں نہایت عمدہ الائچی دار پان دستیاب تھا۔ اس لئے میر صاحب دو چار آنے میں ہی اپنی دریا دلی کا سکہ جمانے

کی کوشش کرتے میر صاحب سے ہر چند اس روز کا میزبان کہتا رہ جاتا کہ یہ پیسے بھی وہی ادا کر دیگا لیکن میر صاحب بہت برا منھ بنا کر کہتے کہ بھئی ہمیں بھی کچھ موقع دو۔ اس طرح روپیوں کی جگہ میر صاحب چند پیسوں سے ہی کام نکال لیا کرتے۔ بالآخر میر صاحب کے اس حربہ کا توڑ کرنے کے لئے ریاض نے ان کی پاس بک پار کر دی اور جب تک میر صاحب کو آمادہ نہیں کر لیا کہ وہ محض پانوں پر ہی نہیں ٹرخایا کریں گے بلکہ شریف آدمیوں کی طرح چائے مع لوازمات پلوایا کریں گے مسروقہ پاس بک واپس نہیں کی گئی۔ جب میر صاحب کا یہ کفر ٹوٹا یا توڑا گیا تو پھر ان کا رویہ بھی عام مسلمانوں کا سا ہو گیا۔ دراصل یہ حساست میر صاحب کو ورثہ میں ملی تھی چونکہ ہم نے دیکھا بلکہ شدت سے محسوس کیا کہ قبلہ ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب خرچ کے معاملے میں بھی میر صاحب کے باپ ہی تھے وہ ضرورت سے زیادہ محتاط روی کے قائل تھے اور اپنی اولاد کو بھی اپنے نقش قدم پر چلانا چاہتے تھے۔ بڑے میر صاحب کی بخل روی کی تصدیق آگے آنے والے واقعہ سے ہو جائے گی جس تجربہ کے بعد ہم اپنے میر ٹینڈی صاحب کو شاہ خرچ سمجھنے پر مجبور ہو گئے۔

انتہائی دلچسپ چار پانچ سال میر صاحب کے ساتھ گزارنے کے بعد آخر شب جدائی کا موڑ آیا یعنی ہم نے انجینئرنگ کالج میں داخلہ لیا اور سلیمان ہال پہنچے اور میر صاحب نے آبا و اجداد کی منڈی کی راہ لی اور آگرہ واپس ہو گئے۔ علیگڑھ سے آگرہ خاصا قریب ہے مگر میر صاحب نے اسے قریب تر بنا دیا یعنی خیر صلا لینے ہر آٹھویں دسویں چکر لگا جاتے۔ ہمیں یہ آرام ہو گیا کہ جب بھی آتے بڑے مزیدار کھانوں سے بھرا ناشتہ دان ساتھ ہوتا۔ آگرے کا پیٹھا اور دال موٹ کے متعلق ان کا خیال تھا کہ یہ چیزیں تو ہر جگہ بازار میں دستیاب ہیں یعنی لانے لیجانے کے قابل نہیں اس لئے ان تکلفات میں نہیں پڑتے۔ میر صاحب ہوسٹل کی تقریبات میں اکثر بطور مہمان فن کار شرکت

کرتے وہ بھی اس طرح کہ اپنے کمالات کا مظاہرہ کئے بغیر نہیں رہتے۔ ایک روز یار لوگوں نے طے کیا کہ شامِ موسیقی منائی جائے اس زمانے میں شرافت علی خاں ریشمین، (مرحوم) "جب ترے شہر سے گزرتا ہوں" والے علیگڑھ میں عالمِ شباب گزار رہے تھے اس لئے 'گلا' بھی لاجواب تھا لیکن انھیں گانے پر آمادہ کرانا ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی بس یوں سمجھئے کہ اختری بائی مرحومہ بھی شاید ہی اتنے نخرے کرتی ہوں جتنے میاں ریشمین کو یاد تھے۔ البتہ یارانِ دیرینہ کی خاطر وہ گالیوں کے خوف سے سارے ناز نخرے بھول کر مع ہارمونیم آجایا کرتے۔ اِدھر اس محفل کے محرّک اکبر حسین تھے جو اپنے شغلِ موسیقی خصوصاً طبلہ نوازی کی وجہ سے گردھاری کے نام سے مشہور تھے چوبیس گھنٹے گانے بجانے کے موڈ میں رہتے تھے، حتّٰی کہ صبح کو جب باتھ روم جاتے تو فوراً پتہ چل جاتا کہ گردھاری صاحب کہاں 'الاپ' فرما رہے ہیں۔ ہمہ وقت تبسم ریز ہونٹوں پہ پان کی لالی، بات کرنے سے پہلے نینوں کے بان چلانے والے 'آل راؤنڈر' شوقین ہمارے یارِ گردھاری بھی کوئی چیز واقع ہوئے تھے۔ اللہ میاں کو بھی نہ جانے ان کی کونسی ادا پسند آگئی جو بفضلہٖ درجہ بدرجہ جدّہ پر پڑے دُنیا و عقبیٰ کمانے کی پوزیشن میں ہیں۔ دُنیا کی کمائی کا حال تو خوب معلوم ہے مگر عقبیٰ کی خبر خدا جانے۔ اَب کوئی ساٹھ کے پیٹے میں ہیں۔ شادیوں کے معاملے میں بھی اپنی جدّت طرازی سے پُرانے مال کا شائق ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ اَب جب ان کا صلواتیں سُننے کو جی چاہتا ہے تو دو چار سال میں صورت دکھا جاتے ہیں اور 'گردھاری' کہنے کا تقاضا کرتے ہیں اور جب گردھاری کے ساتھ کچھ اور مال مسالا لگا دو تو باچھیں کھل جاتی ہیں۔ ہاں تو محفل کے اِنتظام کے بارے میں تجویز یہ بھی ہوا کہ کمرے میں ہی چھوٹا سا اسٹیج بنایا جائے تاکہ گائک اور طبلچی اور ہارمونیم والے اس پر آرام سے بیٹھیں، نیچے فرش پر سامعین براجمان ہوں لیکن پھر یہ سوچ کر کہ اسٹیج کہاں

ملے گا خیال ترک کر دیا گیا۔ یہ زمانہ تھا جب ڈیکوریشن والوں نے یہ پیشہ نہیں اپنایا تھا اِس لیے اس قسم کا سامان رؤسا کے کنول خانوں کے علاوہ کہیں اور دستیاب نہیں ہوتا تھا جس وقت یہ گفتگو ہو رہی تھی اتفاقاً میر صاحب بھی موجود تھے اور غالباً جمعہ کا دن تھا اگلی جمعرات کو رات دس بجے محفل کا وقت متعیّن کیا گیا میٹنگ برخاست ہوئی میر صاحب نے آگرہ اور دوسروں نے اپنے اپنے کمروں کی راہ لی۔ دوران ہفتہ پروگرام کو آخری شکل دے دی گئی اور فرشی محفل کا ہونا قرار پایا۔ اسٹیج کی بات آئی گئی ہو گئی۔ بالآخر جمعرات آئی گویا من کی مُراد لائی۔ سب نے سرِ شام ہی کھانے سے فراغت پائی چارپائیوں کو کمرہ بدر کیا، سب دریوں اور چادروں کو اکٹھا کر کے فرش بچھایا گیا پانوں کی تھالی فصیح میاں کے گھر سے منگوائی۔ سرور میاں نے اپنے ذوق کے مطابق پان بنانے کی ذمّہ داری سنبھالی۔ چائے کا بندوبست تو ہونا ہی تھا اسی میں رات کے ۹½ بج گئے۔ موسیقار شرافت علی خان، ریشمین طبلچی گردھاری لال، ہارمونیم ماسٹر مُنّھ سے گھنگرو بجانے والے ماسٹر صادق، ایک ایک کر کے سب اکٹھے ہو گئے۔ اتنے میں ایک یکہ دروازہ کے سامنے آکر رُکا، جا کر دیکھا تو اس پر سامنے ایک تخت لدا ہوا ہے اور پیچھے میر صاحب براجمان ہیں بس کیا تھا تخت کو دیکھتے ہی خوشی کا نعرہ بلند ہوا۔ اُمیدوں کے قطع ہونے کے بعد محسوس ہو رہا تھا کہ چوبی تخت نہیں آیا بلکہ نزولِ تختِ سلیمانی ہوا ہے۔ تخت اُتارا گیا۔ اسے کمبلوں کی مسند سے آراستہ کیا گیا اس وقت تک خاصے یار لوگ جمع ہو چکے تھے اس لئے حصولِ تخت کے راز سے پردہ اُٹھانا مناسب نہیں معلوم ہوا۔ بہرحال محفل جمی مگر اختتام محفل پر کسی گویّے یا منتظم کو اتنی داد نہیں ملی جتنی واہ واہ میر صاحب کی ہوئی۔ جب لوگ رُخصت ہو گئے تو میر صاحب سے دریافت کیا گیا کہ جناب یہ تخت کہاں سے اور کیونکر فراہم کیا گیا۔ سب کا خیال تھا کہ میر صاحب نہ جانے شہر میں کہاں کہاں مارے

مارے پھرے ہوں گے تب کہیں جاکر کامیابی نصیب ہوئی ہوگی۔ میر صاحب نے کہا "بھائی یہ تو یہیں شمشاد بلڈنگ سے لے آیا ہوں مگر کل واپس کر دینا ہے" پھر پوچھا گیا کہ آخر ہے کس کا تو میر صاحب بولے "ہوتا کس کا یہ کبابی کا تخت ہے۔ اس کا کام ۹ بجے کے سائرن کے بعد ختم ہو گیا تو تخت میں اِدھر اُٹھوا لایا۔ وہاں تو بالکل خالی پڑا رہتا یہاں کام آگیا۔ صبح پہنچا دیں گے" اب بھلا بتائیے میر صاحب کی اس حاضر دماغی اور خدمت گزاری کی کیسے داد نہ دی جاتی۔

جوانی کے ترنگ کے دن کیسے برق رفتار ہوتے ہیں دیکھتے دیکھتے ہی مہینے نہیں سال گزر جاتے ہیں جو پھر کبھی پلٹ کر نہیں آتے، پھر جولانیوں کی اس عمر میں بے نظم و ضبط گھڑیاں کچھ ایسی چھب دکھاتی ہیں جن کے خیال سے تن بدن میں جوانی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ ان ایام گزشتہ کے تصور میں محض مسکرا دینے سے کام نہیں چلتا ہنسی کھلکھلا کر نکل پڑتی ہے جسے سن کر آس پاس بیٹھنے والے چونک جاتے ہیں اس لئے ہمارے ماضی کے اِس تصوراتی سفر کو نا سمجھ کبھی نفسیاتی دورہ سمجھ بیٹھتے ہیں۔ کاش ہم جو خود دیکھ رہے ہوتے ہیں، دوسروں کو بھی دکھا سکتے۔ ماضی کی مسرتوں اور اذیتوں کا ہمارے ساتھ ساتھ آج کی نسل بھی نظارہ کر لیتی تو ہمارے دکھ سکھ کا اندازہ لگا کر زندگی کے نشیب و فراز سے نبرد آزما ہونے کی زیادہ اور بہتر صلاحیتیں میسر آجاتیں۔

ہم انجینئرنگ کے آخری سال کے امتحان کی تیاری میں مصروف تھے یعنی طالب علمی کے سنہری دور کو خیرباد کہنے میں صرف دو ماہ باقی تھے۔ یہ طالب علمی کا دور بھی عجیب دور ہوتا ہے یعنی دورانِ طالب علمی ہر نوجوان اپنے کو معاشرہ کا مصروف ترین مظلوم ترین فرد سمجھتا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ اپنے آپ کو قیدی سمجھتا ہے اسلئے درس و تدریس امتحان و آزمائش کے قید و بند سے جلد چھٹکارہ حاصل کرنے کا خواہاں

ہوتا ہے۔ وہ بچپن سے لدے ہوئے کتابوں کے بوجھ کی گٹھری کو اپنے سر سے اُتار پھینکنا چاہتا ہے اس کو کالج اور یونیورسٹی سے باہر ہر سراب ایک حسین منظر معلوم ہوتا ہے لیکن جس گھڑی وہ علم سے فراغت پاکر باہر کی دُنیا میں قدم رکھتا ہے اسی لمحے یہ احساس ہو جاتا ہے کہ دورِ طالبِ علمی کیا نعمت ہے۔ یہ عُمر راج کرنے کی عمر ہے جہاں طالب علم حاکم باقی سب محکوم ہوتے ہیں اِس لئے یونیورسٹی سے دفاتر میں پہنچنا حاکم سے محکوم بن جانے کے مترادف ہے۔ زندگی کے ان انقلاب آگیں ایام میں ایک صبح میر صاحب وارد ہوئے لیکن اِس مرتبہ چہرہ پر غیر معمولی مُسکراہٹ بھی معلوم ہُوا کہ موصوف کو کوئی ان سے زیادہ ماہر ٹکر گیا جس نے انھیں شکار کر لیا۔ بات بھی کچھ ایسی ہی نکلی یعنی میر صاحب کی شادی کی تاریخ کا تعیّن ہو چکا تھا جس میں ہمارے امتحان کے ختم ہونے کا خیال رکھ کر ہماری شرکت کو لازمی بنا لیا گیا تھا۔ اپریل میں بخیر و خوبی یونیورسٹی کے آخری امتحان سے فراغت پائی تو اس سے زیادہ میر صاحب کے سہرا بندھائی کی خوشی میسّر آئی ہم اور پارٹنر سرور خان مرحوم بصد اشتیاق آگرہ پہنچے تو میر صاحب کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا قبلہ ڈاکٹر صاحب اور مقبول مرحوم وغیرہ نے اُترتے ہی مدارات شروع کر دی۔ اُس زمانے میں اگر 'وی آئی پی' ہُوا کرتے تو ہم اس معیار سے وی وی آئی پی نظر آرہے تھے۔ رات بھر دولھا میاں کے پہلو بہ پہلو بیٹھ کر ناچ گانے کی محفل میں شرکت کی۔ صبح فجر سے قبل چائے پی کر بستر پر پہنچے اور دو چار کروٹیں بدلنے کے بعد شرکت بارات کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ گرمی کا شباب تھا وہ بھی آگرے کی الامان الحفیظ۔ اس لئے طے پایا کہ علی الصبح فجر کے فوراً بعد ناشتہ کرتے ہی روانگی ہو جائے گی کیونکہ بارات کو آگرہ کینٹ جانا تھا جو کوئی آٹھ نو میل دُور واقع ہُوا تھا۔ اب حسبِ پروگرام دولھا مع براتیوں کے تیار ہو گئے۔ اسی اثنار میں دولھا کا سجا بنا گھوڑا بھی آگیا جو پیشہ ور 'نوشہ بردار' معلوم ہوتا تھا اس لئے باراتیوں کے ہر قسم کے شور و شغب سے

بے نیاز تھا لیکن باراتیوں کو لے جانے کے لئے تانگے کہیں نظر نہیں آئے۔ کافی دیر بے چینی سے انتظار کے بعد خبر ملی کہ تانگے والے کچھ بھاؤ تاؤ کرنا چاہتے ہیں اس لئے آنا کانی کر رہے ہیں۔ ادھر گفتگو ہوتی رہی اُدھر سورج چڑھتا رہا اور باراتی کھڑے کھڑے تپتے رہے۔ کافی دیر بعد میر صاحب، کو گھوڑے پر چڑھا دیا گیا اور بارات کو مارچنگ آرڈر دے دیا گیا۔ اس طرح جب بارات روانہ ہوئی تو عجب منظر تھا تانگے والے باراتیوں کو اور باراتی تانگوں کو بڑی حسرت سے تک رہے تھے لیکن گھوڑے کھڑے کھڑے مسکرا رہے تھے۔ اپنے تو کچھ پلّے ہی نہیں پڑا۔ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ دولھا بچارا خود ہی منھ چھپائے بیٹھا رہا۔ اتنے میں میاں مقبول نے بتایا کہ "ذاکر بھائی ان کمبخت تانگے والوں کے لڑائی (دوسری جنگِ عظیم) کے بعد سے بڑے دماغ ہو گئے ہیں۔ گورے حرامیوں نے آنوں کی جگہ روپے دے دے کر ان کی عادتیں بگاڑ دیں۔ میاں (والد صاحب) کا خیال ہے کہ اگر آج ہم نے شادی کے دباؤ سے زیادہ اُجرت کی بات مان لی اور منھ مانگا کرایہ دے دیا تو یہ ہمارا جینا دوبھر کر دیں گے اس لئے میاں نے فیصلہ کیا ہے کہ آج اس بے جا مطالبہ پر انہیں ایسی سزا دی جائے کہ ہمیشہ کے لئے سیدھے ہو جائیں۔ چنانچہ اب یہاں سے کینٹ اسٹیشن انشاء اللہ پوری بارات پیدل جائے گی، پھر یہ خود ہی راہِ راست پر آ جائیں گے۔" پرانے لوگ بات کے کتنے پختہ ہوتے ہیں اس کا بخوبی اندازہ ہمیں اس وقت ہوا جب چلچلاتی دھوپ اور آگ سی لُو میں مسلسل تین گھنٹے گرتے پڑتے جگہ جگہ پانی پیتے اس کے چھینٹے منھ پر مارتے دارالعروس رسید ہوئے۔ میر صاحب بچارے گھوڑے پر تنہا بیٹھے بڑے شرمسار سے معلوم ہو رہے تھے اور ہم سرور میاں سے کہتے جاتے تھے کہ تانگے والے تو کیا ہی ٹھیک ہوتے البتہ باراتیوں سے ڈاکٹر صاحب ہمیشہ کے لئے کان پکڑوا لیے۔ الغرض جب خدا خدا کر کے دلھن کی ڈیوڑھی نصیب ہوئی

www.taemeernews.com

تو گرمی سے ایسے نڈھال اور تھک کر ایسے بے حال ہو چکے تھے کہ بجائے "مبارک باد" کے ہر سانس میر صاحب کو گالیاں نکل رہی تھیں۔ اب ایسے غیر شاعرانہ ماحول میں نکاح جیسی لطیف رسم میں کیا مزہ لے سکتے تھے جبکہ اپنی ہمت تو چھوارے اٹھانے کی بھی نہ تھی۔ نکاح کے تھوڑی دیر بعد کھانا آیا تو وہ بھی بمشکل ہی کھایا بلکہ زہر مار ہی کیا گیا۔ ان خوش گوار مراحل سے انتہائی ناخوش گوار طریقے سے گزرنے کے بعد کوچ کا وقت آگیا۔ خیال تھا کہ غالباً ڈاکٹر صاحب بوقتِ واپسی کم از کم شادی کی خوشی میں "تانگے والوں" کا قصور معاف کر دیں گے لیکن وہ ایسی بات پر کیسے آمادہ ہو جاتے جس میں سراسر گھاٹا ہی گھاٹا تھا اور اب تو کھانا بھی سب کو کھلوا چکے تھے! اس لئے سواری کی خاص ضرورت بھی نہ تھی۔ چنانچہ بارات کو پا پیادہ حکمِ ریٹریٹ سنا دیا گیا۔ الغرض کھیت، ندی، نالے، مرگھٹ، قبرستان پھاندتے مگر نہ جانے کیسے صحیح سالم میر صاحب کے بزرگوں کی منڈی واپس پہنچ گئے اور جب ڈاکٹر صاحب فاتحانہ انداز سے کہہ رہے تھے "آپ لوگوں کو تھوڑی تکلیف تو ضرور اٹھانی پڑی لیکن میں نے آج ان تانگے والوں کو ایسا سبق دیا ہے کہ آئندہ بھول کر بھی ہیکڑی نہیں کریں گے" ہم نے سرور میاں سے کان میں کہا "بھائی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مہمانوں کو تانگے والا کہا جاتا ہے، واقعی آج سولہ سترہ میل دھوپ میں پیدل چلنے کا سبق جو ہم نے سیکھا ہے کبھی نہیں بھلایا جا سکے گا۔ یہ تو میر صاحب کا معاملہ تھا آئندہ کبھی ڈاکٹر صاحب نے اپنی شادی پر بھی بلایا تب بھی جرأت نہیں کریں گے۔"

زندگی کے اس اہم ترین نازک وقت میں ہم اپنے جگری یار میر صاحب کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتے تھے اس لئے خوب خوب مبارکباد دی اور ہنس بول کر تھکن دور کی مگر بنظرِ احتیاط دوسرے ہی دن بستر لپیٹ لیا چونکہ ہم نے سوچا کہ اگر بڑے میاں چوتھی کھلانے بھی لے گئے تو شاید علیگڑھ واپس ہونے کے قابل بھی نہ رہیں چنانچہ عافیت

www.taemeernews.com

یہی سمجھے کہ پہلی بس سے علیگڑھ لوٹ آئے۔

میر صاحب کی شادی اس قدر مُبارک ہُوئی کہ ریلوے ہی میں گارڈ مُقرّر ہو گئے اور اس طرح گارڈ کی بیٹی گارڈ کی بیوی بھی بن گئیں۔ اِس کے بعد ہم پاکستان چلے آئے اور میر صاحب سے تعلّقات بتوسّل پوسٹ کارڈ برقرار رہے۔ زمانے کی رفتار بھی اب ڈاک گاڑی سے بڑھ کر جیٹ ہوائی جہاز سے تجاوز کرنے لگی۔ چُنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے ۱۹۶۱ء آگیا اور اسی سال ہندوستان جانا ہُوا، یونیورسٹی کی زیارت کو جب رامپور سے علیگڑھ پہنچے تو میر صاحب کو خط سے مطلع کیا جو فوراً ہی ہمیں گلے لگانے علیگڑھ آگئے جُون کا مہینہ تھا اس لئے گرمی کی چھٹیوں کا زمانہ تھا۔ یونیورسٹی کی فضا پر ویرانی کا عالم طاری تھا۔ ہم اپنے اور میر صاحب کے لنگوٹیا یار ڈاکٹر نواب کے یہاں ٹھہرے تھے جو اس زمانے میں 'شعبۂ حیوانات' میں ریڈر تھے۔ اس مختصر مگر انتہائی دلچسپ قیام میں بڑے مزے مزے کی باتیں ہُوئیں۔ پُرانے واقعات دُہرائے گئے سارے بچھڑے ہُوئے دوست یاد کئے گئے۔ کبھی آدھی رات کی چاندنی میں چوکیدار کی آواز سُن کر میر صاحب کو جوش آجاتا کہتے "خان چلو یار ذرا یُونہی چکّر لگالیں" پھر ہم یونیورسٹی کی گلیوں اور میدانوں میں نکل جاتے اس طرح جیسے اپنی بہت ہی بیش قیمت کھوئی ہوئی شے تلاش کرنے نکلے ہوں، وہ شے جو ہم سے بہت دُور جا چکی جو اَب کبھی ہاتھ نہ آئے گی پھر بھی یاد برابر آئے گی۔ ان چار پانچ روز میں ہم نے تمام پچھلے اسباق کا ریویژن کر ڈالا مگر 'پنرملن' کی یہ سُہانی گھڑیاں ایک نرم و لطیف ہوا کے مہکتے جھونکے کی طرح گزر گئیں مگر جاتے جاتے ہنسنے والوں کو سوگوار کر گئیں۔

اس مُلاقات کی 'سلور جوبلی' منانے ہم فروری ۱۹۸۷ء میں پھر ہندوستان گئے اور بحمد للہ علیگڑھ نصیب ہُوئے۔ نواب صاحب سے بھی مُلاقاتیں رہیں جو اَب بریلی میں براجمان ہیں۔ میر صاحب کو خط بھی لکھے مگر افسوس کہ ملنے کی اُمید بر نہ آئی

www.taemeernews.com

نہ ہی کسی طرف سے میر صاحب کی کوئی خبر آئی۔ خدا انھیں خوش رکھے۔ جیتے جی ان سے ملنے کی آس ہے، یوں تو سیّد بھی ملے، پٹھان اور شیخ بھی ملے اور افغان بھی ملے لیکن اپنے میر ٹینڈی جیسا دیکھا نہ سنا۔ رامپور میں آفتاب الدّین خان نے اتنا ضرور بتلایا کہ چند ماہ پیشتر ان کی ملاقات کسی ریلوے جنکشن پر ہوئی تھی، وہ اپنی سیٹ پر بیٹھے ہی تھے کہ کیا دیکھتے ہیں کہ آگے آگے میر صاحب اور پیچھے پیچھے قلی پھلوں کی ٹوکری لادے چلا آرہا ہے۔ میر صاحب فرمانے لگے "کھا یار جلدی میں ہوں اس وقت یہی لے جا" اور یہ کہہ کر چل دیئے۔ بڑا سکون ہوا یہ سُن کر کہ ریلوے کی طویل ملازمت نے بھی میر صاحب کی عادات و اطوار بلکہ صلاحیتوں کو متاثر نہیں کیا اور پہلے جو کام وہ فارم اور کھیت میں جا کر انجام دیا کرتے تھے اب ریل کے ڈبّے میں بیٹھے بیٹھے ہی کر گزرتے ہیں معلوم یہ بھی ہوا کہ میر صاحب کی ماشاءاللہ چھ سات لڑکیاں اور دو صاحبزادے ہیں اور وہ ریٹائر ہونے والے ہیں تاہم چہرے بشرے پر نہ تو ملازمت سے نہ ازدواجی زندگی سے ریٹائرمنٹ کے آثار پائے جاتے ہیں خدا ان کی عمر دراز کرے اور تندرستی برقرار رہے تاکہ وہ سبکدوشی اور خاندانی ہر دو مال گاڑیوں کو بعافیت و سلامتی ان کے اسٹیشنوں تک پہنچاتے رہیں اور ڈبل گارڈ ہونے کے فرائض بخیر و خوبی انجام دیتے رہیں۔

ایک میر صاحب کیا علیگڑھ کا وسیع دامن تو نہ جانے کتنے میروں، شیخوں، خان صاحبان اور مرزا صاحبان سے بھرا پڑا ہے افسوس کہ ایک صدی میں بکھرنے والے اس گنجہائے گراں مایہ کی تلاش ان کو اکٹھا اور محفوظ کرنے کی کسی کو نہ سوجھی۔ خدا بھلا کرے صاحبان "فکر و نظر" علیگڑھ یونیورسٹی کا جن کی تدابیر اور کاوشوں نے نامورانِ علیگڑھ کا احاطہ کر لیا اور معماران قوم کو بقدر توفیق خراج عقیدت پیش کر کے نئی نسلوں سے روشناس کروایا لیکن وہ سینکڑوں فرزندانِ علیگڑھ

www.taemeernews.com

جنھوں نے علیگڑھ کی اقامتی زندگی میں رُوح پھُونکی، جنھوں نے اپنی ذہانت اور خداداد صلاحیّت کے بَل پر علیگڑھ کو قابلِ رشک شہرت اور مقبولیت دے کر سارے عالم میں 'علیگڑھ اسپرٹ' کا پیغام پہنچایا، آج ہماری طرف شاکیانہ نظروں سے دیکھ رہے ہیں کہ ان کا حق کوئی ادا نہ کر سکا۔ 'کمالاتِ میرٹینڈی' اس سمت میں ہمارا پہلا قدم ہے۔ ہم سے جس قدر بن پڑا اپنی معلومات اور صلاحیّت کی حد تک اِنشاءاللہ اِن خاکوں میں رنگ بھرتے رہیں گے یہاں تک کہ گُل رنگ خاکوں کا ایک ایسا مجموعہ تیّار ہو جائے جسے ہم 'گمنامانِ علیگڑھ' کا نام دے سکیں۔

نوٹ :- ناظرین کو بھی یہ جان کر خوشی ہوگی کہ ہمارے یار میر صاحب بحمدہٖ تعالیٰ بخیر و عافیت ہیں اور آگرے میں براجمان ہیں اور انہوں نے فروری ۱۹۹۰ء میں علیگڑھ تشریف لا کر شرفِ مُلاقات بخشا۔ اس کے بعد سے سلسلۂ مراسلت بھی بحال ہو گیا۔